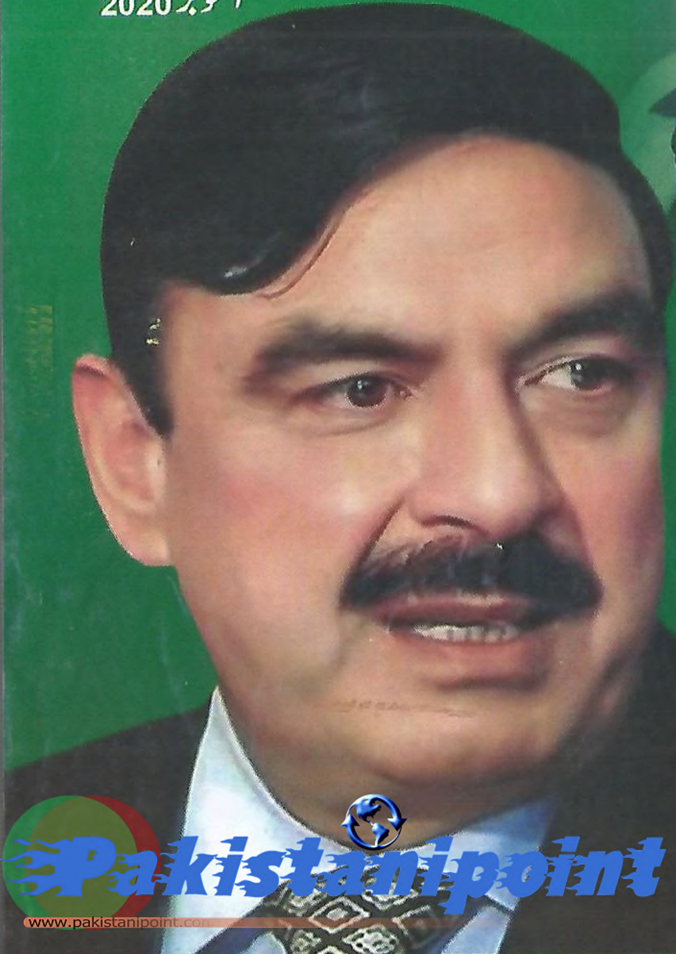
مستقل اہمیت کی حامل معیاری اور شگفتہ تحریریں

سیّارہ ڈائجسٹ

اکتوبر 2020





لال حویلی سے اقوام متحدہ تک

شیخ رشید احمد کی سیاست کے پچاس سال

- غلام اسحاق خان کسی پنجابی وزیراعظم کو پسند نہیں کرتا تھا
- نواز شریف کا پُراعتماد اور نورانی چہرہ مجھے اس روز جیسا نظر آیا پہلے کبھی نہ دیکھا تھا
- عمران خان ایسے سیاست دان ہیں جو اپنا فیصلہ کر لیتے ہیں تو پھر نہیں دیکھتے کہ اس کے اثرات کیا ہونگے
- عمران اپنی تحریک کو طاہر القادری سے الگ تھلگ رکھنا چاہتے تھے

القرآن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ الاعراف

اور اسے چھوڑ دو تب بھی زبان لٹکائے رہے۔ یہی مثال ہے ان لوگوں کی جو ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں۔ تم یہ حکایات ان کو سناتے رہو' شاید کہ یہ کچھ غور وفکر کریں۔ بڑی ہی بُری مثال ہے ایسے لوگوں کی جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور وہ آپ اپنے ہی اوپر ظلم کرتے رہے ہیں۔ جسے اللہ ہدایت بخشے بس وہی راہ راست پاتا ہے اور جس کو اللہ اپنی رہنمائی سے محروم کردے وہی ناکام ونامراد ہوکر رہتا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ بہت سے جن اور انسان ایسے ہیں جن کو ہم نے جہنم ہی کے لئے پیدا کیا ہے۔ ان کے پاس دل ہیں مگر وہ ان سے سوچتے نہیں' ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں' ان کے پاس کان ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں' وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے' یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں کھوئے گئے ہیں۔ اللہ اچھے ناموں کا مستحق ہے اس کو اچھے ہی ناموں سے پکارو اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کے نام رکھنے میں راستی سے منحرف ہو جاتے ہیں۔ جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں اس کا بدلہ وہ پاکر رہیں گے۔ ہماری مخلوق میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق ہدایت اور حق کے مطابق انصاف کرتا ہے۔

(آیات 175-181۔ بحوالہ تفہیم القرآن۔ از: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی)

الحدیث

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ کو زیادہ یاد کرو

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:
میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ اللہ کو زیادہ یاد کرو اور ذکر کی مثال ایسی سمجھو جیسے کسی آدمی کے دشمن نہایت تیزی کے ساتھ اس کا پیچھا کر رہے ہوں یہاں تک کہ اس آدمی نے بھاگ کر ایک مضبوط قلعہ میں پناہ لی اور دشمنوں کے ہاتھ میں پڑنے سے بچ گیا' اسی طرح بندہ شیطان سے نجات نہیں پا سکتا ہے مگر اللہ کی یاد کے سہارے!

تشریح: اللہ کی یاد سے مراد یہ ہے کہ آدمی اس کی ذات وصفات اس کی عظمت وجبروت' اس کا رحم وکرم غرض جملہ صفات الٰہی کا پورا شعور رکھتا ہو اور یہ شعور زندہ اور طاقتور ہو تبھی وہ اپنے نہ دکھائی دینے والے دشمن ابلیس کے حملوں سے بچ سکتا ہے اور اس کی عملی تدبیر یہ ہے کہ آدمی ٹھیک سے فرض نماز ادا کرے' نوافل بالخصوص تہجد کا اہتمام کرے۔ جو دعائیں حضورؐ نے دن رات کے مختلف اوقات کے لئے سکھائی ہیں انہیں یاد کرلے' ان کے معنی و مفہوم جانے اور ان کو بار بار پڑھے۔ یہی وہ مضبوط قلعہ ہے جس میں وہ پناہ لے کر شیطان کے حملوں سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

(بحوالہ: فرمانِ رسول ﷺ نمبر سیارہ ڈائجسٹ)

اس شمارے میں......

جلد57 : شمارہ10 اکتوبر 2020ء
رُکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

www.facebook.com/sayaradigest
Email:editorsayyara@yahoo.com
sayyaradigest@gmail.com
editorsayyara@hotmail.com
Phone:92-042-37245412
Mobile:0300-9430206

مستقل اہمیت کی حامل معیاری اور شگفتہ تحریریں

ماہنامہ سیّارہ ڈائجسٹ لاہور

قیمت 120 روپے

امجد رؤف خان پبلشرز نے اللہ والا پرنٹرز سے چھپوا کر 240 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور سے شائع کیا۔

اظہار خیال



ادبی تاریخ

محترم جناب امجد رؤف صاحب۔ السلام علیکم! امید ہے مزاج گرامی بخیر ہونگے۔ پچھلے ماہ تو ہاتھ ہوگیا تھا اس ماہ کمال ہوگیا' شمارہ 24 اگست کو مل گیا۔ محترمہ کشور ناہید کی نوٹ بک پڑھی یہ اس دور کی ادبی تاریخ سے کم نہیں۔ تاہم جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے لڑائی شورش اور جالب میں نہیں ہوئی تھی شورش اور کوثر نیازی میں ہوئی تھی اور ہوئی بھی خوب تھی۔ اس دور کے اخبارات میں یہ لڑائی شہ سرخیوں کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔ چٹان اور شہاب اس دور میں آپس میں، ادبی حریف تھے ان کی ادبی لڑائیاں بعض اوقات ذاتیات میں بھی تبدیل ہوجاتی تھیں۔

اس مرتبہ بھی آپ نے شمارے کو خوب سے خوب تر بنانے کی جستجو کی ہے۔ نواز خاں کے کیا کہنے وہ تو پھیری والے کے ذریعے مجرم پکڑ لیتا ہے اسے اس دور میں انسپکٹر ہونا چاہئے تھا۔ 6 ستمبر پر آپ نے تین مضامین شمارے میں شامل کرکے مجھے اپنے بچپن کا 6 ستمبر یاد دلا دیا۔ میں اس وقت جماعت ہشتم کا طالب علم تھا اس پر میرا ایک مضمون غالباً ستمبر 1916ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا اگلے سال ان شاء اللہ اسے سب ترامیم و اضافے سے بھجواؤں گا۔ پگڈنڈی واقعی عمدہ ناول ہے' سوتیلی والدہ کے ظلم و ستم کی کئی کہانیاں سنی تھیں۔ اس ناول میں راوینہ کا کردار پڑھ کر معلوم ہوتا ہے وہ سچی ہونگی مجھے بھی اس سلسلے میں ایک تلخ تجربہ ہونے لگا تھا لیکن خدا نے بچالیا۔ میری حقیقی والدہ کا انتقال 25 ستمبر 1965ء کو ہوا تھا والد سوتیلی والدہ لانا چاہتے تھے جسے میں نے لڑائی جھگڑا کرکے نہ آنے دیا۔ باقی مضامین اور کہانیاں عمدہ اور بہترین ہیں۔ غالباً 15 اگست کے بعد آپ کو ایک خط معہ جوابی لفافہ ارسال کیا تھا اس میں بے جوڑ شادیوں پر ریسرچ اور ایک خاتون کی آپ بیتی کا ذکر ہے جس نے بہادری اور دلیری سے اپنی بے جوڑ شادی ناکام بنا کراپنے ہم منصب ہم پلہ شخص سے شادی کی یہ آپ کی دراز میں پڑا ہوگا یا شاید ویٹنگ لسٹ میں۔

(محمد بوٹا مجاہد)

معیار

محترم جناب امجد رؤف خان صاحب۔ السلام علیکم! ایک مضمون آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں اگر مضمون آپ کے معیار کے مطابق ہے تو شائع کردیں اگر آپ کے معیار پر نہیں اترتا ہے تو مضمون واپس کردیں۔ مضمون کی خامی کی نشاندہی کردیں جوابی لفافے پر ٹکٹ اور پتہ مضمون کے ساتھ لف ہے۔ شناختی کارڈ نمبر اور موبائل نمبر درج ذیل ہے آپ کی توجہ کی نوازش ہوگی۔ والسلام

(محمد حفیظ باختر)

☆ حفیظ صاحب' آپ کی تحریر شامل اشاعت ہے تاہم آپ سے اور تمام لکھنے والوں سے گذارش ہے کہ تحریر لکھتے ہوئے صرف اُن واقعات تک محدود رہیں جن کا کہانی کے اصل موضوع سے تعلق ہے۔ غیر ضروری تفصیلات سے گریز کریں۔

اصل کاپی

جناب امجد صاحب۔ السلام علیکم! امید ہے آپ سب خیریت سے ہونگے۔ سیارہ ڈائجسٹ کے لیے تحریر ارسال خدمت ہے تاہم لاک ڈاؤن کی وجہ سے اصل کاپی ارسال کر رہی ہوں۔ واپسی ڈاک اسے مجھے ضرور بھجوائیں تاکہ میں اپنے ریکارڈ میں محفوظ کر سکوں۔

(والسلام۔ فرحت قادر)

مشورہ مان لیا

گرامی قدر محترم جناب امجد رؤف خان صاحب۔ السلام علیکم!

سیارہ ڈائجسٹ ستمبر 2020ء ملا میرا افسانہ شکار شائل فرمانے کا شکریہ ٹائٹل پر معروف ادیبہ محترمہ کشور ناہید صاحبہ کی تصویر گلدستے کے ساتھ آخر آپ نے میرا مشورہ مان لیا ٹائٹل پر تصور کے ساتھ نام بھی لکھ دیا بہت اچھا لگا یہ تصویر یادگار تصویر ہوگی۔ ایک افسانہ شاعر ارسال خدمت ہے تفریح اور شاعری کو سمویا ہے۔

(احمد علی شاہ مخمور)

قلندر حسین، شوکت افضل کی کمی

محترم جناب امجد رؤف خان، چیف ایڈیٹر سیارہ ڈائجسٹ۔ میں پچھلے سات یا آٹھ برس سے سیارہ ڈائجسٹ کا باقاعدگی سے مطالعہ کر رہا ہوں۔ جناب قلندر حسین سید اور محترمہ شوکت افضل صاحبہ کی تحریروں کا ایسا عادی ہوا کہ پھر جیسے مجھے اُن کی تحریریں پڑھنے کا چسکا سا لگ گیا اور آپ کے ڈائجسٹ کا ہی ہو کر رہ گیا۔ لیکن پچھلے کئی ماہ سے شوکت افضل صاحبہ کی تحریریں شائع نہیں ہو رہی تھیں جبکہ قلندر حسین صاحب کا مستقل سلسلہ بھی بعض دفعہ شائع نہ ہوا۔ اور اب پچھلے دو شماروں میں یکے بعد دیگرے میرے دونوں پسندیدہ رائٹرز کے انتقال کی خبریں شائع کر کے آپ نے مجھے غمگین کر دیا ہے۔ نجانے کیوں اب میں سیارہ ڈائجسٹ کھولتا ہوں تو مجھے تشنگی سی محسوس ہوتی ہے۔ فہرست پر نظر ڈالتے ہی یوں لگتا ہے کہ جیسے کچھ کمی سی ہے۔ میری نظریں اور میرا دماغ اب بھی جناب سید صاحب مرحوم کا سلسلہ ''خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کردیں'' تلاش کرتے ہیں اور آخری صفحات پر شوکت افضل صاحبہ کی کہانی بھی نہیں ملتی۔ سوچتا ہوں ان چند برسوں میں اپنے ان دونوں رائٹرز سے میرا ایسا غائبانہ رشتہ جڑ گیا تھا کہ انکی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے تو انکے اہلخانہ اور عزیز و اقارب کا کیا حال ہوگا۔

اللہ تعالیٰ دونوں کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائیں اور اُن کے اہلخانہ کو صبر جمیل عطا کریں۔ آمین۔ آخر میں آپ سے گذارش ہے کہ قلندر حسین اور شوکت افضل کی کوئی تحریر قند مکرر کے طور پر کبھی شائع کر دیا کریں تاکہ ہماری تشنگی دُور ہو سکے۔

(سکندر حبیب۔ گوجرانوالہ)

☆ سکندر حبیب صاحب، آپ نے سیارہ ڈائجسٹ کے ان دو رائٹرز کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ صرف آپ کی ہی نہیں ہم سب کے بھی دل کی آواز ہے۔ ہم سب اُن کی کمی محسوس کرتے ہیں۔ مگر اب بس اُن کے لیے دعا ہی کر سکتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں تقدیر کے آگے انسان بے بس

اور لاچار ہو جاتا ہے اور اسے قدرت الٰہی کے فیصلے کو صبر و حوصلہ سے برداشت کرنا پڑتا ہے۔ ہماری بھی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ قلندر حسین اور شوکت افضل کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائیں۔ آمین

ایم بی انجم کی آپ بیتی

مکرمی چیف ایڈیٹر سیارہ ڈائجسٹ۔ سیارہ ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی تحریریں اس لحاظ سے لاجواب ہوتی ہیں کہ ان میں پڑھنے والوں کے لیے ایسا سبق ہوتا ہے جسے وہ عملی زندگی میں بروئے کار لاکر اپنی زندگی کو بہتر بناسکتے ہیں۔ اس کی واضح مثال جناب ایم بی انجم کی آپ بیتی ''کتاب زیست کا ایک باب'' ہے جس میں انھوں نے انتہائی خوبصورتی سے یہ پیغام دیا ہے کہ اگر انسان ہمت، حوصلہ اور محنت سے کام لیتے ہوئے پوری ایمانداری کے ساتھ محنت کرے تو کامیابی اُس کے قدم ضرور چومتی ہے، پھر خواہ اُس کے پاس وسائل کی کتنی ہی کمی ہو، وہ کتنا ہی لاچار، غریب اور مسکین ہو، اگر وہ ان اصولوں پر عمل کرے گا تو قدرت اس پر اپنی رحمتوں کے دروازے کھول دے گی اور وہ ثمر پالے گا۔ میری طرف سے جناب ایم بی انجم کو مبارکباد کا پیغام پہنچادیں اور ساتھ ہی یہ عرض بھی کردیں کہ وہ اپنے اس سلسلے کے صفحات تھوڑے بڑھادیں کیونکہ چھ سات صفحات میں آپ بیتی پڑھنے کا مزہ نہیں آتا بلکہ اس کے فصحات کم از کم پندرہ سے بیس ہونے چاہئیں تاکہ قاری کو تفصیل سے واقعات پڑھنے کو مل سکیں۔ ویسے بھی میری رائے میں واقعاتی تحریر جتنی بھی طویل ہو قارئین اسے قبول کرلیتے ہیں جبکہ محض لیکچر اور علمی تحریریں طویل ہوجائیں تو بوریت محسوس ہوتی ہے۔

(سلیم مظفر۔ ایبٹ آباد)

پگڈنڈی کا اختتام

جناب مدیر سیارہ ڈائجسٹ۔ آپ سے کچھ گذارشات کرنا چاہتی ہوں، امید ہے آپ ضرور غور فرمائیں گے۔ سب سے پہلے تو پگڈنڈی جیسا سلسلہ شائع کرنے پر مبارکباد قبول فرمائیں، اس میں نوشابہ اختر صاحبہ نو بڑے ہی اثرانگیز انداز میں برائی کے برے انجام کے بارے میں بتایا ہے۔ ساری کہانی میں مجھے راوینہ کے کردار پر رہ رہ کر غصہ آتا تھا، خاص طور پر جب یہ بتایا گیا کہ بیٹی کے رشتہ کے لیے اس نے فراڈ لوگوں کا انتخاب کیا اور پھر باپ بیٹی ہی نہیں بھائی بہن کو بھی ایک دوسرے کا دشمن بنادیا۔ راوینہ کا کردار ہمارے معاشرے میں اکثر دیکھنے کو مل جاتا ہے۔ بلکہ میں نے مشاہدہ کیا ہے کہ آج کل ایسی فطرت کی خواتین کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہورہا ہے اور زیادہ تشویش کی بات یہ ہے کہ یہ خواتین اور ان کے اہلخانہ اس فطرت کو چالاکی و ہوشیاری قرار دیتے اور موجودہ دور کی اہم ضرورت خیال کرتے ہیں۔ نوشابہ اختر پہلے ہر ماہ ایک مکمل کہانی لکھا کرتی تھیں، اُن سے گذارش ہے کہ وہ سلسلہ دوبارہ شروع کردیں۔ قلندر حسین صاحب کے انتقال کے بعد تحریروں کے انتخاب کا سلسلہ رُک گیا ہے اس کی دوبارہ اشاعت کا اہتمام کریں۔ ایم اے راحت، اے حمید، ممتاز مفتی جیسے رائٹرز کا سلسلہ وار ناول شائع کیا جائے۔ تحریر شائع ہونے پر رائٹر کو اعزازی شمارہ ضرور بھیجیں۔

(آسناتھ کنول)

دستک

Editorsayyara@yahoo.com

جنسی درندوں کو سرِعام سزائیں دیں!

گزشتہ دنوں موٹروے پر ہونے والی واردات نے پورے پاکستان کو ہلا کر رکھ دیا۔ یہ تصور بھی محال ہے کہ کسی کی ماں کی عزت اس کے اپنے بچوں کے سامنے لٹ جائے اور وہ اپنے بچوں کی خاطر بے بس ہو۔ اور یہ ماں بھی وہ ہو جو فرنگی دیس چھوڑ کر پاکستان میں اپنے بچوں کی اسلامی تربیت کیلئے آئی ہو۔ کیا ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ عورت، اس کے بچے، اس کا شوہر اور اس کی دیگر فیملی کس قدر شدید ٹراما سے گزر رہے ہوں گے۔ یہ تو ان کے ساتھ حادثہ ہوا اور پھر رہی سہی کسر سوشل میڈیا بریگیڈ، پولیس اور اس سسٹم نے پوری کردی۔ سوشل میڈیا پر ہر کوئی دانشور بنا ہوا ہے۔ لائیکس اور یوٹیوب سبسکرائبر کے چکر میں اُلٹی سیدھی تحریریں اور وی لاگ گردش کر رہے ہیں۔ کیا کسی نے یہ سوچا ہے کہ یہ حرکتیں متاثرہ فیملی کے ذہنی دباؤ میں کس حد تک اضافے کا باعث بنیں گی؟

ہمارے ہاں جنسی زیادتی کے حوالے سے رائے عامہ کچھ اس طرح تقسیم ہے کہ سمجھ ہی نہیں آتی یہ معاشرہ جانا کدھر چاہتا ہے' اس کی منزل کیا ہے؟ ایک انتہا کا کہنا ہے یہ خواتین کے بے پردہ ہونے اور مختصر کپڑے پہننے کی وجہ سے ہے، یا ان کی اپنی بے احتیاطی کی وجہ سے ہے۔ اور دوسری انتہا وہ ہے جس کا کہنا ہے کہ آزادانہ جنسی تعلقات کی معاشرتی اور قانونی اجازت سے ایسے واقعات کی روک تھام ممکن ہے۔ ایک اور نایاب تجویز یہ سامنے آئی کہ ریڈ لائٹ ایریاز کی قانونی اجازت دے دی جائے تاکہ را چلتی خواتین کے ساتھ ایسے واقعات نہ ہوں۔ اس پر بس یہی کہا جاسکتا ہے...... کہ کون لوگ ہو تسی؟

اکیلی عورت دنیا میں ہر جگہ غیر محفوظ ہے۔ ایک غیر سرکاری رپورٹ کے مطابق گزشتہ بیس سال ک عرصے میں دنیا بھر میں ایک کروڑ 77 لاکھ خواتین زیادتی کا شکار ہوئیں۔ یعنی ہر روز 2425 اور ہر 5 سیکنڈ کے بعد ایک عورت زیادتی کا شکار ہوئی۔ اس میں دنیا کے مہذب ترین اور وہ ممالک بھی شا ہیں جہاں قانون کی عمل داری سو فیصد ہے۔

اگر بات کی جائے اسلامی جمہوریہ پاکستان کی، جہاں مدرسے جانے والی بچی قاری صاحب، اسکول جانے والی استاد محترم، کالج جانے والی پروفیسر صاحب اور یونیورسٹی تک پہنچ جانے والی ڈین کی طرف سے خطرے کا شکار ہو، وہاں ہر شخص کیلئے لازم ہے کہ وہ اپنی حفاظت خود کرنے کا بندوبست کرے۔ ایک غیر سرکاری رپورٹ کے مطابق پاکستان میں سالانہ ہزار سے زائد بچیوں سے زیادتی کی جاتی ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق 2016 میں ہر روز گیارہ بچوں سے زیادتی کی گئی۔ یہاں عرض کرتا چلوں کہ کسی بھی ذریعے سے حاصل کردہ اعداد وشمار حقیقت سے بہت دُور ہوتے ہیں۔ کیونکہ جرائم کنٹرول کرنے والے اداروں کے رویے کی بدولت مظلوموں کی اکثریت جرم رپورٹ کرنے سے گریز کرتی ہے۔ والدین بدنامی کے ڈر سے یہ بات چھپاتے ہیں۔ صرف پاکستان ہی نہیں ہمارے پڑوسی ملک بھارت میں ہر گزرتے دن کے ساتھ صورتحال بد سے بدتر ہوتی جارہی ہے۔ بھارتی حکومت کے ادارے نیشنل کرائم ریکارڈ بیورو کی 2019 کی رپورٹ کے مطابق بھارت میں ہر 15 منٹ میں ایک خاتون کا ریپ کیا گیا۔ صرف 2017 میں بھارت میں 330000 خواتین زیادتی اور گینگ ریپ کا شکار ہوئیں۔ ایک اور غیر سرکاری رپورٹ میں یہ دعویٰ کیا گیا کہ بھارت میں ہر 6 منٹ کے اندر کوئی نہ کوئی خاتون جنسی ہراسگی یا بدسلوکی کا شکار ہوتی ہے۔ مندرجہ بالا اعداد وشمار ثابت کرتے ہیں کہ اکیلی عورت پاکستانی ہو یا ہندوستانی، یا پھر انگلستانی، وہ غیر محفوظ ہے۔ لاہور میں جس جگہ پر یہ وقوعہ ہوا، وہ ایک ویرانہ ہے اور اطراف میں چھوٹا سے جنگل بھی ہے۔ یہ جنگل گزشتہ دور حکومت میں خود اُگایا گیا تھا تاکہ علاقے کو فائدہ حاصل ہوسکے۔ فائدہ کیا حاصل ہونا تھا، یہ جنگل چورا چکوں اور ڈاکوؤں کی آماجگاہ بن گیا۔ جب یہ علاقہ نوگوایریا بنا تو یہاں پر پولیس آپریشن کیا گیا اور اس کو جرائم سے پاک کیا گیا۔ اس کے بعد یہاں پر ایک پولیس چوکی بھی قائم کی گئی جو شاید 7 یا ۸ سال تک رہی اور پھر آج سے لگ بھگ ڈیڑھ سال پہلے ختم ہوگئی۔ اب سوال یہاں یہ پیدا ہوتا ہے وہ علاقہ جس کو کرمنلز سے پاک کیا گیا تھا اور پھر پولیس چوکی قائم کی گئی تو یہ پولیس چوکی کیوں ختم ہوئی؟ یہ کس نے ختم کروائی؟

وقوعہ کے بعد پولیس کی تفتیش خود سے ایک مذاق ہے۔ ابھی جب وزیر اعلیٰ نے اس مسئلے پر پریس کانفرنس کی تو سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ رونا چاہیے کہ ہنسنا چاہیے۔ جب یہ جرم ہوا، پولیس پر عوامی پریشر بنا تو پھر اس پر کام کا آغاز ہوا۔ اس ضمن میں نادرا سے ڈیٹا لیا گیا، موبائل کمپنیوں سے ریکارڈ لیا گیا لیکن یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ اس ڈیٹا کا سائنٹیفک تجزیہ نہیں ہوا۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو محض سم کے شناختی کارڈ کی بنیاد پر مجرموں کا تعین نہ ہورہا ہوتا۔ کیا پولیس کی اس حرکت پر وقارالحسن بدنام نہیں ہوا، جس کا اس کیس سے کوئی تعلق نہیں۔ اس نے بتایا ہے کہ اس کا سالا یہ سم استعمال کرتا ہے۔ پولیس ریکارڈ کے مطابق وہ سالا عادی مجرم ہے۔ دو میں سے ایک مجرم نے تو خود ہی گرفتاری دے دی۔ یہ بھی تب ہوا جب عورت کے جسم سے ملنے والے ڈی این اے کا فرانزک ہوا تو پہلے سے موجود ڈیٹا ریکارڈ سے ایک

ڈی این اے میچ کر گیا۔ لیکن پولیس اس کو بھی گرفتار کرنے میں ناکام رہی اور اس مجرم نے خود ہی گرفتاری دے دی۔ وہ اب ریمانڈ پر جیل میں ہے۔ لیکن اس کیس کا اصل مجرم دعوؤں کے باوجود تادم تحریر پولیس کے ہاتھ نہیں آسکا۔ پولیس نے اس کی گرفتاری کے لیے دو بار چھاپہ مارا لیکن ناکام رہی۔

اس سارے معاملے میں پولیس نے کیا کیا ہے؟ جیوفینسنگ اور دیگر سائنٹیفک طریقوں سے وہ دوسرے مجرم تک کیوں نہیں پہنچے؟ اور مجھے کوئی یہ بتا دے کہ یہ کیسی تفتیش ہے کہ جب مجرم کو گرفتار کرنے پولیس جاتی ہے تو وہ اپنی فیملی سمیت کھیتوں سے فرار ہو جاتا ہے۔ یعنی یا تو کوئی مجرم کو انفارمیشن دیتا ہے اور وہ پولیس کے آنے سے پہلے ہی فرار ہو جاتا ہے۔ ایسا کوئی اندر کا بندہ ہی کر سکتا ہے اور یا پھر پولیس کی گاڑی کو دیکھ کر مجرم اسپورٹس کار میں ڈرفٹ لگاتا ہوا کھیتوں میں فرار ہو جاتا ہے اور پولیس بے چاری منہ تکتی رہتی ہے۔ ہر صورت میں اس کیس میں پولیس کی کارکردگی ایک سوالیہ نشان ہے۔ اس معاملے میں نو آمد آئی جی پنجاب اور سی سی پی او لاہور جواب دہ ہیں۔ سی سی پی او نے بھی متاثرہ خاتون کے زخموں پر نمک چھڑکنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ انہوں نے متنازعہ بیان دے کر ایک نئی بحث کو جنم دیا اور دباؤ کے نتیجے میں انہوں نے بعد میں معافی مانگ بھی لی۔ یہ کیا ہے؟ ہم پولیس چیف سے یہ توقع کرتے ہیں؟ وزیراعظم بھی جواب دہ ہیں کہ دو سال میں انہوں نے پنجاب پولیس میں ریفارمز کیوں نہیں کیں؟ کیوں ہر دو دن کے بعد آئی جی پنجاب کو تبدیل کر دیا جاتا ہے؟ جہاں آئی جی جیسا عہدہ سوالیہ نشان بن جائے تو کیا وہاں پولیس خود اپنے کام میں سنجیدہ ہوگی؟ یہ تو واضح ہے کہ پولیس انویسٹی گیشن رائٹ ڈائریکشن میں نہیں ہے۔ اس کیس کی تمام پیش رفت قدرت کی مہربانی ہے، پولیس کارکردگی کا نتیجہ ہرگز نہیں۔ زینب قتل کیس بھی قدرت کی مہربانی سے ہی حل ہوا تھا۔ تب بھی یہ آوازیں آئی تھیں کہ اب پولیس میں ریفارمز کی ضرورت ہے اور اس کو جدید طور پر استوار کیا جانا چاہیے۔ لیکن اس کے بعد بھی ایسا نہ ہوا۔ اب اس کیس میں بھی یہ بات بالکل واضح ہے کہ پولیس ڈپارٹمنٹ میں جدید ریفارمز ہونی چاہئیں۔ اُن کو صرف دور جدید کی سہولیات ہی نہیں بلکہ اس کے استعمال کا طریقہ بھی آنا چاہیے۔

اور آخر میں عرض ہے کہ جرم کی سزا سب کے سامنے دینی چاہیے۔ کیوں؟ کیونکہ یہی اللہ کا حکم ہے اور اس کی حکمت یہی ہے کہ باقی لوگ عبرت حاصل کریں۔ چھوڑ دیجیے کہ مغرب کیا کہتا ہے اور وہ کیا دباؤ ڈالتا ہے۔ دباؤ کو ہینڈل کرنا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ کیا مغرب ہمارے گھروں، جان و مال کا محافظ ہے؟ یہ لازمی تو نہیں کہ جو قانون مغرب میں کامیاب ہے، وہی مشرق میں بھی کامیاب ہوگا۔ ہمیں اپنے معاشرے اور ذہنیت کو دیکھتے ہوئے قانون سازی کرنی ہوگی۔ سزائیں سب کے سامنے دینی ہوں گی۔ اس سے معاشرے میں ہرگز بھی انتہاپسندی نہیں پھیلے گی بلکہ یہ معاشرے میں جرائم سے تحفظ کی ضمانت ہوگی۔

(امجد رؤف خان)



لال حویلی سے اقوامِ متحدہ تک

شیخ رشید احمد کی سیاست کے پچاس سال

- غلام اسحاق خان کسی پنجابی وزیر اعظم کو پسند نہیں کرتا تھا
- نواز شریف کا پُر اعتماد اور نورانی چہرہ مجھے اُس روز جیسا نظر آیا پہلے کبھی نہ دیکھا تھا
- عمران خان ایسے سیاست دان ہیں جو اپنا فیصلہ کر لیتے ہیں تو پھر نہیں دیکھتے کہ اس کے اثرات کیا ہوں گے
- عمران اپنی تحریک کو طاہر القادری سے الگ تھلگ رکھنا چاہتے تھے



لال حویلی سے اقوام متحدہ تک

شیخ رشید احمد

شیخ رشید کے سیاسی قد کا کوئی انکار کرے یا اعتراف ان سے اتفاق کرے یا اختلاف' ان سے محبت کا دم بھرے یا نفرت کے بخار میں مبتلا رہے' ان کو داد دے یا بے داد' ان کی بلائیں لے یا بلائیں ان کے سر لاد دے...... اس بات کی تردید نہیں کی جاسکتی کہ وہ پاکستان کی سیاست کا ایک منفرد کردار ہیں۔ اپنی مثال' آپ۔ سارے زمانے سے نرالے ہیں۔ ایک عام سے گھرانے میں' ایک عام سے بچے کی طرح اس دنیا میں وارد ہوئے اور اپنے زور بازو سے قومی سیاست میں مقام بنایا۔ اپنی شعلہ بیانی کے لئے مشہور ہیں۔ میڈیا ان کے آگے پیچھے بھاگتا ہوا نظر آتا ہے کیونکہ وہ آنے والے دنوں کی پیش گوئیاں کرتے اور میڈیا کے لیے خبریں دیتے رہتے ہیں' پھر چاہے وہ سچ ثابت ہوں یا نہ ہوں۔

حالیہ دنوں میں ان کی ایک نئی کتاب ''لال حویلی سے اقوام متحدہ تک'' منظر عام پر آئی ہے ہم ان سے کچھ باب اپنے قارئین کی دلچسپی کے لئے رقم کر رہے ہیں۔

(ایڈیٹر)

نوازشریف' فوج اور اسحاق خان

نوازشریف اور اسحاق خان دونوں کا مزاج مختلف تھا۔ نوازشریف جمہوریت کی کارفرمائی' قومی خودانحصاری اور عامتہ الناس کی فلاح و بہبود کے علمبردار تھے۔ ادھر اسحاق خان ایک سپر بیوروکریٹ تھا۔ اس کے مزاج میں افسرشاہی کی رعونت نے آمریت کی صورت اختیار کرلی تھی۔ اسے ہر دم اپنے اختیار و اقتدار کا دھیان رہتا تھا۔ وہ شروع دن سے ہی اس خوف میں مبتلا تھا کہ کہیں نوازشریف اپنی دو تہائی اکثریت کی بنا پر آئین کی آٹھویں ترمیم میں تبدیلی کرکے صدر مملکت کو اسمبلی توڑنے کے اختیار سے محروم نہ کردے چنانچہ نوازشریف کو زمام اقتدار سنبھالتے ہی ایوان صدر سے خط ملنے شروع ہوگئے۔ صدر غلام اسحاق خان شاید گربہ کشتن روز اول کی ضرب المثل پر عمل کررہے تھے۔ نوازشریف بھی شروع سے ہی اسحاق خان کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے کے موڈ میں تھے لیکن ہم قریبی ساتھی انہیں روکتے رہے۔ آٹھویں ترمیم پر غلام اسحاق خان سے جنگ سے ذرا پہلے ایک روز جب لاہور سے واپس آئے تو بدلے بدلے سے تھے۔

نوازشریف کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ اپنے والد محترم سے مشورہ کئے بنا کوئی قدم نہیں اُٹھاتے۔ ہماری بعد کی معلومات کے مطابق میاں شریف نے بھی نوازشریف کو صدر سے ٹکر لینے سے روکا تھا لیکن نجانے وہ کون سی ایسی قوتیں تھیں جو نوازشریف اور غلام اسحاق خان دونوں کو تصادم و محاذ آرائی کی راہ پر ڈال رہی تھیں۔ اب آثار و شواہد سے اندازہ ہوا یہ دراصل ایک بین الاقوامی منصوبہ تھا جس کے تحت پاکستان میں سیاسی تبدیلی کو ناگزیر بنایا جارہا تھا اور وطن عزیز میں نہ صرف ایک عوامی مینڈیٹ کی مالک بلکہ دو تہائی اکثریت پارلیمانی اکثریت کی حامل مضبوط حکومت کو اقتدار سے محروم کرنے کی سازش کی جارہی تھی۔ اس سازش میں بینظیر بھٹو کا کردار بھی تھا جس نے ایک غیرملکی طاقت کی زیرسرپرستی ایک تیر سے دو شکار کئے۔ نوازشریف اور صدر اسحاق خان کو محروم اقتدار کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ اگر تنہا نوازشریف کو نکالا گیا تو فوج میں بیزاری اور برہمی کی لہر دوڑ جائے گی۔ اس طرح سارا کھیل بگڑ سکتا تھا۔ فوجی قیادت کو بھی صدر اسحاق خان کے ساتھ سودے بازی کرنے میں کافی دشواری محسوس ہورہی تھی۔

نوازشریف ایک بہت شریف النفس انسان ہیں جو منہ بھر کر کسی کو بھی انکار نہیں کرسکتے۔ اس نے میرٹ پر ہی غلام اسحاق خان سے مل کر آصف جنجوعہ کی تعیناتی کی لیکن نئے چیف آف آرمی سٹاف کی تعیناتی پر وہ کنفیوژن کا شکار تھا جبکہ غلام اسحاق خان بہت کایاں' چالاک اور دل میں بات رکھنے والا انسان تھا۔ نوازشریف کی طاقت اسمبلی کے ممبران تھے۔ جبکہ غلام اسحاق خان فوج کے سہاروں کے ساتھ ساتھ اسمبلی ممبران پر بھی ہاتھ پھیر رہا تھا۔ انور سیف اللہ اس کا داماد تھا لیکن حامد ناصر چٹھہ نے بھی اسے پہلے دن سے ہی تسلیم نہیں کیا تھا۔ الٰہی بخش سومرو بھی غلام اسحاق خان کی جیب میں تھے بلکہ بہت

پہلے غلام اسحاق خان کو اپنا استعفیٰ لکھ کر دے چکے تھے۔ چودھری نثار بھی دو طرف ہاتھ رکھتے تھے لیکن آخری لڑائی کے وقت چودھری نثار نے نواز شریف کا ساتھ دیا۔ میرے دل میں کھٹکا لگا رہا کہ اعجاز اور نثار نجانے کیا فیصلہ کریں گے؟ مجھے ایک دن اعتماد میں لیکر نواز شریف نے میر خلیل الرحمان کے پاس بھیجا کہ وہ کچھ عرصے بعد آٹھویں ترمیم پر غلام اسحاق خان سے دو دو ہاتھ کرنے والے ہیں اور آئندہ ہونے والی آٹھویں ترمیم کی جنگ میں ان کے اخبار کی حمایت حاصل کروں۔

میر شکیل الرحمان بہت سمجھدار انسان تھے ایک دم کہنے لگے کہ آپ بھی اس جنگ کے حامی ہیں؟ میں نے کہا' سرکار میں حامی نہیں پر سرکاری ڈیوٹی پر آیا ہوں۔ پھر کہنے لگے' کیا نواز شریف اتنا بڑا کام کر گزرے گا؟ میں کچھ جواب نہ دے سکا۔ پھر انہوں نے پوچھا' اس جنگ میں نواز شریف کو کس کس کی حمایت حاصل ہے؟۔ میں خاموش رہا۔ پھر انہوں نے کہا کہ ایسا نا ہو کہ آپ ٹریپ ہو جائیں اور کھیل کسی اور کا بن جائے۔ میں ان کی رائے کا سو فیصد حامی تھا لیکن میرے خیال میں آصف نواز کے دور میں ملک نعیم' چودھری نثار' راجہ شاہد سعید اور نواز کھوکھر سے جنرل آصف نواز کی بلاوجہ خاصی غلط فہمیاں پیدا کی گئیں اور آئی ایس آئی کور میں انجینئر کور کے جنرل جاوید ناصر کو بطور سربراہ مقرر کر کے نواز شریف نے جو حاکمیت کا تصور دیا اس سے فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہوا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ تبلیغی جماعت کا مذہبی آدمی تھا۔ میں خود رائے ونڈ کے تبلیغی اجتماع میں وقت لگاتا رہا ہوں' لیکن کوئی شخص چاہے کتنا ہی پانچ وقت کا نمازی یا تہجد گزار ہو' اسے کار ڈرائیونگ کیلئے اس وقت تک نہیں دی جاسکتی جب تک وہ ڈرائیونگ نہ جانتا ہو۔ اب سارے کام آئی ایس آئی کے بجائے ایم آئی سے لئے جاتے تھے اور بریگیڈیئر امتیاز کی نگرانی میں آئی بی کا کردار بھی افسوسناک تھا۔ لانگ مارچ کی تحریک میں بینظیر بھٹو کو آصف نواز کی آشیرباد بھی حاصل تھی۔ کیونکہ غلام مصطفیٰ جتوئی اس وقت تک کسی سیاسی تحریک میں شامل نہیں ہوتے تھے جب تک مہربانوں کی جانب سے گرین سگنل نہ ملے۔ ضرورت سے زیادہ احتیاطی تدابیر اور سکیورٹی کے انتظامات کر کے اس کی اہمیت کو بڑھا دیا اور خوف و ہراس پھیلا دیا۔ بینظیر بھٹو کے بارے میں یہ واضح فیصلہ دیا گیا کہ انہیں اسلام آباد کے گھر سے نہیں نکلنے دیا جائے گا لیکن وہ آسانی سے معمولی مزاحمت کر کے اپنی پجارو پر بیٹھ کر پشاور موڑ والے راستے سے میرے حلقے میں پہنچ گئیں۔ نواز شریف نے مجھے سختی سے ہدایت کی تھی کہ میں ان کے ساتھ پرائم منسٹر ہاؤس میں رہوں لیکن میں نہیں مانا اور اس سارے ہنگامے کے دوران لال حویلی میں موجود رہا۔ بعد میں مجھے پتا چلا کہ آئی بی نے ایسی رپورٹ بھیجی تھی کہ شیخ رشید احمد' چودھری شجاعت اور اعجاز الحق میں سے کسی ایک کو ہلاک کرنے کا منصوبہ ہے۔ میں نے شجاعت سے بات کی جو وزیر داخلہ تھے اور انہیں کہا' اپنی ذاتی سکیورٹی کا انتظام رکھنا' مجھے اس رپورٹ سے اس بات کی بو آتی ہے کہ کہیں ایجنسی والے خود ہی مروا کر حالات کا رُخ بدلنے کیلئے ہمارے خون کے متلاشی نہ ہوں۔ انہوں نے مجھ سے

اتفاق کیا لیکن میں نے لال حویلی نہ چھوڑی اور لوگوں کو مشتعل نہ ہونے دیا اور سب سے پہلے نوازشریف کو میں نے اطلاع دی کہ بینظیر اپنے گھر سے نکل چکی ہے۔ انہوں نے کہا' ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ میں نے کہا' اطلاع دینا میرا فرض تھا' باقی فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے اور لال حویلی کی اطلاع کبھی غیر مصدقہ نہیں ہوتی کہ اس کا اپنا آرگنائزڈ نظام ہے کہ اسی وجہ سے کوئی ایجنسی بھی وہاں سے اپنی کوئی چوکی نہیں ہٹاتی۔ لیکن حالات نے اس وقت پلٹا کھایا کہ جب آصف نواز اچانک دل کا دورہ پڑنے سے جاں بحق ہوگئے اور نئے آرمی چیف کی تعیناتی پر غلام اسحاق خان اور نوازشریف میں کھل کر میٹنگ ہوگئی۔ غلام اسحاق خان اپنے ملٹری سیکرٹری اور ایجنسیوں سے یہ معلومات حاصل کر چکے تھے کہ نوازشریف کو نئے آرمی چیف کیلئے جنرل فرخ کے نام پر اعتراض ہے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ نوازشریف کو یہ باور کراسکوں کہ غلام اسحاق خان جنرل فرخ کو نہیں چاہتا۔ وہ فقط آپ کی مستقبل کی سیاست کو تباہ کرنا چاہتا ہے۔ آپ نہلے پر دہلا پھینکیں اور جنرل فرخ کا نام تسلیم کرلیں۔ لیکن چودھری نثار کا خیال تھا کہ یہ تجویز اس لئے دے رہا ہوں کہ وہ بھی اولڈ گورڈونین ہے۔ اصل میں غلام اسحاق خان نے نوازشریف کو چت کردیا۔ تحمل اور بردباری سے نوازشریف کے دیئے گئے ناموں سے کیڑے نکال کر اس نام پر متفق کرانے میں کامیاب ہوگیا جو وہ چاہتا تھا۔ ہمارے ساتھیوں کے خیال میں گوان کے دیئے گئے نام قبول نہیں ہوئے مگر ایک متفقہ نام سامنے آگیا۔ شہبازشریف گواہ ہیں کہ میں نے انہیں کہا کہ آپ نے جنرل فرخ کے نام کی تجویز کو مسترد کر کے نہ صرف سیاسی خودکشی کی بلکہ اپنے سیاسی اقتدار کی قبر بھی کھودی۔

مجھے کچن کیبنٹ میں خوامخواہ جنرل فرخ کا دوست سمجھا جانے لگا جبکہ میں زندگی میں کبھی ان سے نہیں ملا۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ شہبازشریف' نثار احمد اور مجید ملک نے مجھے کہا کہ میں جنرل فرخ کو ٹھنڈا کروں لیکن ان کی حیرانگی کی انتہا نہ تھی جب میں نے انہیں بتایا کہ میری جنرل فرخ سے کبھی کوئی بات نہیں ہوئی۔ نوازشریف نے میر خلیل الرحمٰن کی برسی پر اس وقت کے اسلام آباد ہوٹل اور آج کے ہالی ڈے ان ہوٹل میں توپ کا گولہ داغ دیا اور پھر سینٹ اجلاس میں جنگ کا بگل بجا دیا۔ مسلم لیگ کی صدارت کی جنگ نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ بہت سارے بزرگ بیچ میں پڑے اور صلح صفائی کی کوشش کی گئی حتیٰ کہ کابینہ اجلاس میں غلام اسحاق خان کو دوبارہ صدر کا عہدہ دینے کی قرارداد بھی پاس ہوئی۔ جنرل مجید ملک' چودھری شجاعت' الٰہی بخش سومرو نے تفصیلی ملاقاتیں بھی کیں۔ نوازشریف کے والد میاں شریف نے بھی بیچ بچاؤ کرانے کی کوششیں کیں لیکن اب وزارت عظمیٰ کے ساتھ مسلم لیگ کی صدارت کا بھی مسئلہ تھا۔

میرے نزدیک وزارت عظمیٰ تو ختم ہونی ہی تھی لیکن مسلم لیگ کی صدارت کو چھوڑنا مستقبل کی سیاست کا خاتمہ تھا۔ میں ان لوگوں میں سے تھا جو غلام اسحاق خان سے لڑائی کے حامی نہ تھے لیکن لڑائی

نام بھی لاثانی
معیار بھی لاثانی

www.lasaniindustries.com

شربت
فولاد پلس

شوگر فری بھی دستیاب ہے

زعفران کی اضافی خوبیوں کے ساتھ
خون کی کمی، جسمانی اور اعصابی کمزوری دور کرتا ہے

خون جسم انسانی کے لئے انتہائی ضروری ہے۔اس کے بغیر بدن کا کوئی عضو اپنا کام جاری نہیں رکھ سکتا۔یہ تمام بدن کو غذا اور توانائی پہنچاتا ہے۔بدن کے ہر حصے کو گرم اور تر رکھتا ہے۔اور جسم میں پانی کا توازن برقرار رکھنے میں مدد دیتا ہے۔خون کئی اجزاء پلازما (Plasma)، سرخ خلیات، سفید خلیات اور انجمادی خلیات (Thrombocytes) وغیرہ کا مرکب ہے۔بدنِ انسانی میں جب خون کے اجزاء میں کمی ہو جاتی ہے یا پورے جسم کو خون کی مناسب سپلائی نہیں ہو پاتی اور خون اپنا کام صحیح طور پر انجام نہیں دے سکتا۔تو ایسی حالت کو خون کی کمی یا انیمیا (Aneamia) کہتے ہیں۔جسم میں خون کی کمی کے باعث چہرہ کی رنگت زرد اور تمام جسم میں کمزوری لاحق ہو جاتی ہے۔ہاتھ پاؤں ٹھنڈے محسوس ہوتے ہیں۔زیادہ کمزوری کی صورت میں ہاتھ پاؤں کانپنے لگتے ہیں۔نبض تیز ہو جاتی ہے۔تھکاوٹ، نظامِ ہضم کی خرابی، اعصابی کمزوری جیسی علامات پیدا ہو جاتی ہیں۔**لاثانی فارما** کے ماہرین نے خون کی کمی کے اسباب اور اس سے پیدا ہونے والے عوارضات و علامات کا جائزہ لینے کے بعد قدرتی جڑی بوٹیوں اور قدرتی اجزاء سے **شربت فولاد پلس** کا نسخہ ترتیب دیا ہے۔جو جدید و قدیم تحقیقات کا نچوڑ ہے۔جدید تحقیقات کی رو سے جسم میں فولاد کے لئے وٹامن سی (Vitamin C) انتہائی ضروری ہے۔اس مقصد کے لئے **شربت فولاد پلس** کے اجزائے نسخہ میں آملہ، ہلیلہ اور بلیلہ کو شامل کیا گیا جو قدرتی وٹامن سی کا خزانہ ہیں، قدرتی فولاد کے حصول کے لئے جامن شامل کیا گیا ہے۔جدید و قدیم تحقیقات اس بات پر متفق ہیں کہ خون کی تکمیل جگر میں ہوتی ہے۔جگر کی اصلاح کے لئے **شربت فولاد پلس** میں زعفران اور تیزپات شامل کیے گئے ہیں۔وٹامن B اعصابی کمزوری اور تھکاوٹ کے لئے انتہائی مفید ہے۔اس وٹامن کے حصول کے لئے **شربت فولاد پلس** میں گاؤزبان شامل کیا گیا ہے۔جو وٹامن B کا قدرتی ذریعہ ہے۔ان کے علاوہ **شربت فولاد پلس** کے اجزائے نسخہ میں اعصاب اور پٹھوں کی طاقت کے لئے کچلہ اور عقرقرحا بھی شامل کیے گئے ہیں۔اس طرح **شربت فولاد پلس** کا نسخہ انتہائی متوازن اور جامع ہے۔جو ہر عمر کے مرد و خواتین ہر موسم میں بلا جھجک استعمال کر سکتے ہیں۔

شربت فولاد پلس کے مجموعی افعال و خواص:

★ خون کے سرخ ذرات کی پیدائش میں اضافہ کر کے چہرے کی پیلاہٹ دور کرتا ہے۔ ★ ہر قسم کی جسمانی کمزوری میں مفید ہے۔
★ جگر اور معدہ کی اصلاح کر کے بھوک بڑھاتا ہے۔ ★ اعصاب کو تقویت دیتا ہے۔ ★ لو بلڈ پریشر (Low Blood Pressure) کو معمول پر لاتا ہے۔
★ خواتین کے لئے دوران حمل اور دودھ پلانے کے زمانے میں بہترین ٹانک ہے۔ ★ زچگی اور زچگی کے بعد کی کمزوری اور چہرے سے کیل چھائیاں دور کرتا ہے۔
★ بچوں کی نشوونما کو بڑھاتا ہے۔ ★ طلباء کی ذہنی اور جسمانی کارکردگی میں اضافہ کرتا ہے۔

نوٹ: اس کے مسلسل استعمال سے جسم میں فولاد کی زیادتی نہیں ہوتی کیونکہ **شربت فولاد پلس** اعضاء کی کارکردگی کو بہتر بناتا ہے۔اس لئے زائد فولاد غذائی استحالہ کے نتیجہ میں جسم میں جمع نہیں ہوتا۔بلند فشار خون (High Blood Pressure) کے مریض معالج کے مشورہ سے استعمال کریں۔

ترکیب استعمال:
بچوں کے لئے صبح و شام کھانا کھانے کے بعد ایک چمچ (کھانے والا) فوری اور بہتر نتائج کے لئے پھلوں کے رس یا دودھ کے ساتھ استعمال کریں۔
بڑوں کے لئے صبح و شام کھانا کھانے کے بعد دو چمچ (کھانے والا) فوری اور بہتر نتائج کے لئے پھلوں کے رس یا دودھ کے ساتھ استعمال کریں۔

لاثانی فارما پرائیویٹ لمیٹڈ
Ph: 042-37188844-37188855
Fax: 042-37188866
Help Line: 0302-8447784
info@lasanipharma.com
lasanipharma@yahoo.com

حکومت اور عبوری وزراء کی فہرست دیدی تھی جس پر وہ چونک اُٹھے تھے۔ جنرل مجید آج بھی گواہی دے سکتے ہیں کہ ان کو جو میں نے فہرست دی تھی وہ سو فیصد درست نکلی۔

وزیراعظم کی تقریر سے اگلے دن وزیراعظم ہاؤس میں سارے وزیروں کا کھانا تھا۔ میں نے تو سب سے کہہ دیا تھا کہ میں تو انتخابات کیلئے اپنے حلقے جارہا ہوں' میں آپ سے کہتا رہا ہوں کہ ملازمتوں پر سے پابندی ختم کریں لیکن آپ نے میری ایک نہیں سُنی۔ میں رانا نذیر احمد سے بڑی زور سے بغل گیر ہوا اوران سے کہا کہ جس طرح میں نے پچھلی اسمبلی کے خاتمے کا اعلان کیا تھا تو آپ نے مذاق سمجھا تھا تو اب میں پھر آج اپنی وزارت کا آخری دن سمجھتا ہوں کل سے میں اپنے حلقے میں الیکشن کی تیاری کروں گا۔ خیام قیصر قریب کھڑے ہوئے تھے' کہنے لگے شیخ صاحب! واقعی......؟

میں نے اثبات میں جواب دیا تو جاوید ہاشمی پوچھنے لگے' اس مرتبہ آپ کا مقابلہ کس سے ہوگا؟

میں نے کہا' بینظیر بھٹو کے رفقاء میں آغا ریاض الاسلام کی لابی مضبوط ہے ٹکٹ بھی وہی حاصل کرے گا' مجھے پورا یقین ہے اور میں ان شاء اللہ پہلے سے زیادہ ووٹ لیکر کامیاب ہوں گا۔

نواز شریف کی تقریر کے بعد اکثر قومی حلقوں میں یہ تاثر عام ہوگیا تھا کہ صدر اسحاق کسی وقت بھی اسمبلیاں توڑ دیں گے اور منتخب حکومت کو برطرف کردیں گے البتہ مبصرین اس امر پر زور دے رہے تھے کہ نواز شریف کو اس تقریر کے بعد اخلاقی برتری حاصل ہوگئی تھی۔

اب اگر اسمبلی توڑی گئی تو یہ نہ صرف شرمناک صورتحال ہوگی بلکہ اسے ذاتی عناد اور دشمنی پر محمول کیا جائے گا۔ 18 اپریل کا دن انہی وسوسوں میں گزر گیا شام کو جب میں وزیراعظم ہاؤس پہنچا تو یہ اطلاع مل چکی تھی کہ ٹیلی ویژن سٹیشن پر فوج آچکی ہے۔ اس اطلاع کے بعد وزیراعظم ہاؤس کا منظر دیدنی تھا افسروں کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ آنے والے لمحات نے ایک انجانا خوف طاری کر رکھا تھا۔ شام کے وقت غلام اسحاق خان نے اسلام آباد کے اخبار نویسوں کو ہنگامی طور پر ایوان صدر طلب کیا اور پریس کانفرنس میں وزیراعظم نواز شریف پر الزامات کی بھرمار کرتے ہوئے حکومت برطرف کردی اور قومی اسمبلی توڑ دی۔ میں نے نواز شریف کے ساتھ اسمبلی ٹوٹنے کی اطلاع اور غلام اسحاق خان کی بے ربط تقریر سُنی لیکن نواز شریف کا صبر و سکون دیدنی تھا۔

ان کے حوصلے بلند تھے' نواز شریف کا پُراعتماد اور نورانی چہرہ مجھے اس روز جیسا نظر آیا وہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ نفل پر نفل پڑھتے جارہے تھے۔ ایسا اعتماد میں نے بہت کم لیڈروں میں دیکھا ہے۔ ویسے بھی میں نے نواز شریف کو سخت پریشان کن حالات میں پریشانی سے گھبراتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔ اکثر گمبھیر حالات میں وہ مری چلے جاتے تھے۔

صدر مسلم لیگ کا انتخاب

میاں محمد نواز شریف اقتدار سے علیحدگی کے بعد پرائم منسٹر ہاؤس سے چودھری شجاعت حسین کے

ہاں منتقل ہوگئے تھے۔ اگلے روز (19 اپریل) کو اسلام آباد میں پاکستان مسلم لیگ کی مرکزی کونسل کا اجلاس ہوا۔ اجلاس کی صدارت سینئر نائب صدر عبدالستار لالیکا نے کی۔ اس اجلاس میں میاں نوازشریف کو متفقہ طور پر پارٹی کا صدر منتخب کرلیا گیا۔اس انتخاب کے بعد نوازشریف لاہور جانا چاہتے تھے۔ ہم چودھری شجاعت حسین کے ہاں بیٹھے ہوئے تھے کہ بعض دوستوں نے نوازشریف کو بذریعہ جہاز لاہور جانے کا مشورہ دیا۔ میں اس کیخلاف تھا۔قریب تھا کہ بذریعہ ہوائی جہاز جانے کی تجویز کو مان لیا جاتا کہ میں نے پوری شدت سے چیختے ہوئے میاں صاحب سے کہا کہ ان لوگوں کی رائے لینا چھوڑ دیں جوانہیں یہاں تک لے آئے ہیں۔

میں نے انہیں پیشکش کی، وہ لال حویلی میں لوگوں کے اجتماع سے خطاب کریں اوراس کے بعد بذریعہ ٹرین سفر کرتے ہوئے لاہور جائیں اور جگہ جگہ عوامی اجتماعات سے خطاب کریں۔

کابینہ کے اکثر ارکان اور بعض جغادری سیاست دان نوازشریف کومشورہ دے رہے تھے کہ بنا تیاری لوگوں کے سامنے نہ جائیں۔ میں نے کہا، وہ لال حویلی کو ٹیسٹ کیس بنائیں اگر عوام کا ردعمل بہتر ہوتو پھر فوری طور پر اسی روز پورے پاکستان میں تحریک چلائی جائے۔ چنانچہ بغیر اطلاع کے فوری طور پر لال حویلی میں عوامی اجتماع سے میاں صاحب کے خطاب کا انتظام کیا گیا۔

لال حویلی میں لوگوں کا والہانہ جوش وخروش و جذبہ قابل دید تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عوام نے نوازشریف کے اقتدار سے علیحدگی کو اپنا مسئلہ بنالیا ہے۔گرمی کی شدت کے باوجود لوگوں نے جس جوش وخروش سے میاں نوازشریف کا استقبال کیا اس سے اندازہ ہوگیا کہ لوگوں میں صدارتی اقدام کیخلاف زبردست ردعمل ہوا ہے اور لوگوں کی ہمدردیاں میاں صاحب کے ساتھ ہیں، اس پس منظر کے ساتھ میں نے میاں محمد نوازشریف کو مجبور کردیا کہ وہ ہوائی جہاز کے بجائے بذریعہ ٹرین اگلے دن لاہور جائیں۔

بعض اخبارات کے نمائندوں نے لال حویلی کے جلسے میں عوامی ردعمل کی تصویر کے بجائے وہ تصویر لگائی جس میں بریگیڈیئر امتیاز کو لال حویلی کے نیچے دکھایا گیا تھا۔

لال حویلی کے جلسے سے پہلے میاں صاحب کے پروگرام کے بارے میں اخبارات کو جو اشتہارات جاری کئے گئے تھے ان میں ٹرین کے ذریعے سفر کا ذکر نہیں تھا۔ میں نے چودھری شجاعت حسین اور ریٹائرڈ جنرل مجید ملک کو بھی اس امر پر آمادہ کرلیا کہ میاں صاحب کو ٹرین کے ذریعے لاہور جانا چاہئے۔

نوازشریف ٹرین کے ذریعے نہیں جانا چاہتے تھے میں نے ایک پرائیویٹ اشتہار جس میں ٹرین کے ذریعے سفر کا ذکر تھا۔ یہ اشتہار منظوری کیلئے میں نے میاں صاحب کے سامنے رکھ دیا۔ میں نے نوازشریف سے کہا اگر آپ دو دن بعد ٹرین سے لاہور نہ گئے تو مجھ جیسے مخلص دوستوں کو دُکھ ہوگا۔ کہ

آپ ابھی تک غیر سیاسی لوگوں کے جم غفیر میں گھرے ہوئے ہیں۔ نواز شریف مان گئے' اس کے بعد قلم سے اشتہارات کی عبارت میں تبدیلی کی گئی اور لوگوں سے اپیل کی گئی وہ راولپنڈی اور دوسرے ریلوے سٹیشنوں پر جوق در جوق پہنچ کر نواز شریف کو الوداع کہیں۔

میاں محمد نواز شریف جب ریلوے سٹیشن جانے کے لئے فیض آباد چوک میں پہنچے تو لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے ہوئے تھے۔ ہزاروں مرد و عورتیں زار و قطار رو رہے تھے۔ ریلوے سٹیشن تک یہی سماں رہا راستے میں کہیں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ ریلوے سٹیشن پر اس قدر رش تھا کہ انگریزوں کے زمانے کا لگا ہوا جنگلا لوگوں کا زبردست دباؤ برداشت نہ کرتے ہوئے ٹوٹ گیا۔ جنگلا عبور کرتے ہوئے میری ٹانگ پر سریا لگ گیا مجھے اس کا کوئی احساس نہ ہوا میں جب نواز شریف کے پاس پہنچا تو مجھے درد کا احساس ہوا دیکھا تو میری ٹانگ سے خون بہہ رہا تھا۔

میں دو تین راتوں سے مسلسل جاگ رہا تھا' میں نے اس امر کا اہتمام کیا کہ لوگ ٹرین کے ساتھ بھی جائیں مجھے احساس تھا کہ ٹرین صحیح وقت پر چلا دی جائے گی تاکہ لوگ استقبال نہ کرسکیں۔ نواز شریف دُور اندیش انسان تھے۔ انہوں نے جب لوگوں کا جوش و خروش دیکھا تو بے اختیار کہنے لگے' رشید! تمہارا فیصلہ درست تھا تم ہمیشہ صحیح سیاسی فیصلے کرتے ہو۔ میرے لئے قائد کے یہ تعریفی جملے سب سے بڑا انعام تھا میری سیاسی سوجھ بوجھ کا دوستوں کو احساس ہوگیا تھا۔

تحریک جاری ہوئی تو ہمیں اطلاع ملی کہ نواز شریف پر اسلام آباد میں قاتلانہ حملہ ہوگا ہم نے حفاظتی انتظام مزید سخت کردیئے۔

سارے پاکستان میں دوروں کا پروگرام بنایا گیا۔ میں سائے کی طرح نواز شریف کے ساتھ ساتھ رہا اور اگست میں انہیں پھر لال حویلی لایا اور بتایا کہ پنڈی کا موڈ کیا ہے۔ رات کو سارے ایم این اے حضرات کو ڈنر دیا۔ غوث علی شاہ پوچھنے لگے' لال حویلی کے کتنے راستے ہیں؟ جب بتایا گیا کہ صرف ایک ہی راستہ ہے تو بڑے حیران ہوئے۔ بعض لوگ فوج کی طرف دیکھ رہے تھے اور بعض اسحاق خان سے پینگیں بڑھا رہے تھے لیکن میں سختی سے اس پالیسی کا حامی تھا کہ عوامی طاقت کا مظاہرہ جاری رکھا جائے اس سے ایم این اے بھی متحد رہیں گے فوج بھی متاثر ہوگی اور عدلیہ کو بھی انصاف کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔

سردار آصف احمد علی' انور سیف اللہ اور حامد ناصر چٹھہ تو جا چکے تھے لیکن لالیکا' اعجاز الحق اور کانجو نواز شریف کا ساتھ چھوڑنے سے بال بال بچے۔ شہباز شریف کے پروردہ پولیس افسر اب منظور وٹو کے لئے کام کررہے تھے اور گورنر اظہر بھی کراس کررہے تھے۔ گورنر اظہر کا بیک وقت اسحاق خان اور نواز شریف دونوں سے رابطہ تھا لیکن میرے خیال سے وہ نواز شریف سے زیادہ اسحاق خان کے وفادار تھے۔ نواز شریف کو گورنر اظہر پر بڑا اعتبار تھا مگر میں نے انہیں کہہ دیا تھا کہ وقت آنے پر پتہ چل جائے گا

کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ گوہر ایوب نے سپریم کورٹ میں جو رٹ کی تھی ساری دنیا کی توجہ اس پر لگی ہوئی تھی۔ ایک دن کمال دانش مندی سے فوج کی جیک برانچ کا بیان جاری کیا گیا اس پر ججوں میں ہلچل مچ گئی۔

پنجاب میں سب سے زیادہ نواز شریف سے فائدہ اٹھانے والے ملک سلیم اقبال' شاہ محمود' اقبال ٹکا اور سعید منہیس کا کردار نہایت بھیانک تھا۔ آرمی جیک کے اس بیان کو نہایت توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا اور اگلے دن عدلیہ نے جی ایچ کیو سے اس بیان کا اصل متن منگوایا تو انہیں کچھ اطمینان ہوا۔ خالد انور نے بہت اچھا کیس لڑا اور عدلیہ کے خلاف پیپلز پارٹی نے عدالتوں کے باہر لوٹوں کے جلوس نکالے مگر سپریم کورٹ نے اس کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ نواز شریف کو آرمی کی طرف سے یقین دلایا گیا کہ اگر سپریم کورٹ نے حکومت بحال کردی تو اقتدار نواز شریف کو سونپ دیا جائے گا۔ فیصلے کے روز سپریم کورٹ کے جسٹس سجاد کے سوا تمام ججوں نے اکثریت رائے سے نواز شریف کی حکومت کو بحال کردیا۔

ریڈیو والے سپریم کورٹ کے اندر سے منٹ منٹ کا آنکھوں دیکھا حال نواز شریف کو بتا رہے تھے۔ اس وقت نواز شریف کے پاس میں اور ان کا اٹینڈنٹ چودھری شجاعت کے گھر موجود تھے نواز شریف خوشخبری سنتے ہی سجدہ ریز ہوگئے۔ جس عجز و انکساری سے انہوں نے نفل ادا کئے اس سے زیادہ عجز و انکساری سے انہوں نے اس دن نفل ادا کئے تھے جس دن اسحاق خان نے 38 دن پہلے اسمبلی توڑی تھی۔ خدا کے دربار میں وہ اس طرح سجدہ ریز تھے اتنے میں لوگ سپریم کورٹ سے تیزی سے چودھری شجاعت کے گھر آ چکے تھے۔ لیکن نواز شریف دیر تک نفل پڑھتے رہے اور پھر نواز شریف دوبارہ شکرانے کے نفل پڑھنے فیصل مسجد گئے میں ان کے ہمراہ تھا۔

فیصل مسجد سے واپسی پر وہ مجھ سے شدت جذبات سے بغل گیر ہوئے۔ میرا کام ختم ہو چکا تھا' میں کیبنٹ میٹنگ کے بجائے لال حویلی چلا آیا لیکن اصل کھیل اب شروع ہوا اور صدر اسحاق خان کے ایک شعر نے اس کے مستقبل کے سارے رازوں کو بے نقاب کردیا۔ اور جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں کہ الٰہی بخش سومرو بھی اسحاق خان کو استعفیٰ لکھ کر دے چکے تھے اعجاز الحق کو یا تو اس کی والدہ نے بچایا' یا اس کے والد کی نیکیاں اس کے کام آ گئیں۔ ورنہ وہ اسلام آباد میں ساڑھے بارہ بجے نواز شریف کو خیر باد کہنے والے تھے۔ نواز شریف کے قریبی ساتھیوں میں تیزی سے دراڑیں پڑ رہی تھیں۔ لالیکا' ملک نعیم اور کانو نے اپنی علیحدہ لائن لے رکھی تھی۔ لالیکا تو اپنے حلقے میں لوگوں کی رائے لینے بھی گئے تھے لیکن ان کے تیور دیکھ کر اُلٹے پاؤں لوٹے اور نواز شریف کے قافلے میں شامل ہوگئے۔ سپریم کورٹ سے بحالی کے بعد کابینہ نے فوراً میٹنگ کی اور تمام وزراء اپنے اپنے عہدوں پر بحال ہوگئے۔ میں اس میٹنگ میں شریک نہ تھا مختلف لوگوں کی مختلف آراء تھیں۔

سپریم کورٹ سے حکومت بحالی کے بعد بھی نواز شریف اپنے آپ کو بے بس پاتے تھے ان کی

حکومت کے بارے میں کہا جارہا تھا کہ بس فیض آباد تک محدود ہوگئی ہے اس دوران بینظیر نے لانگ مارچ کی کال دیدی تھی غلام اسحاق خان بھی بالخصوص پنجاب میں متحرک ہوچکے تھے۔

24 اپریل کو ووٹوں کی گنتی میں 157 ارکان نے وزیراعلیٰ غلام حیدر وائیں کیخلاف عدم اعتماد منظور کرلی اور یوں وٹو کو بلامقابلہ وزیراعلیٰ پنجاب منتخب کرلیا گیا۔ پنجاب اسمبلی کی اس دن کی ہنگامہ آرائی پر بی بی سی نے پیش گوئی کردی تھی کہ یہ اسمبلی زیادہ دیر چلنے کی نہیں۔ سیاسی کشمکش اتنی بڑھ چکی تھی کہ ریاض فتیانہ نے 28 مئی کو پنجاب حکومت کا ٹی وی سٹیشن قائم کرنے کی دھمکی دیدی تھی۔ سلیم اقبال، چودھری اقبال اور ٹوانہ جیسے لوگ پہلے ہی ہوا کا رخ دیکھتے ہوئے صوبائی وزارتوں سے استعفیٰ دے چکے تھے۔ اس صورتحال میں مسلم لیگ نے اپنی حکمت عملی کو مجتمع کیا اور 29 مئی کو منظور وٹو کیخلاف عدم اعتماد پیش کی۔ اسی دن ہائی کورٹ میں رٹ دائر کردی گئی لیکن یہی وہ دن تھا جب پنجاب اسمبلی توڑ دی گئی اور منظور وٹو دوبارہ نگران چیف منسٹر کے عہدے پر براجمان ہوئے۔ باقی صوبوں میں بھی سیاسی افراتفری پھیل چکی تھی۔ اب نواز کے پاس ایک ہی حل تھا کہ وہ عوام کے پاس جائیں اور نیا مینڈیٹ لیں۔

اور ایک دن وہ آیا کہ جنرل عبدالوحید کاکڑ نواز شریف سے ملاقات کرنے پرائم منسٹر ہاؤس آئے باتوں باتوں میں نواز شریف نے ان کو ٹپ دیتے ہوئے کہا کہ جنرل صاحب آپ کی کیا رائے ہے کہ ان حالات میں عوام کے پاس جانے کے بارے میں سوچا جاسکتا ہے؟ اس دن تو جنرل کاکڑ صاحب خاموش رہے لیکن اگلے دن جنرل غلام محمد کو ساتھ لائے اور نواز شریف کی بڑی تعریف کی کہ جناب کل آپ نے جو بات کہی تھی وہ میرے اور میرے ساتھیوں کے دل کو لگی اور اگر آپ اجازت دیں تو اس سلسلے میں بات آگے بڑھائی جائے۔ تو نواز شریف ٹریپ ہوچکے تھے۔ جنرل فرخ اور قاضی اشرف بہت پہلے سے ہی اس ایکسر سائز پر کام کررہے تھے نواز شریف کے دو جملوں نے ان کے ماسٹر پلان کے دروازے کھول دیئے اب نواز شریف کی جان چھوٹنے کا کوئی چارہ نہ تھا۔

میرا خیال نہیں کہ یہ دو جملے کہنے سے پہلے نواز شریف نے اپنے کسی ساتھی سے مشورہ کیا ہو لیکن وہ یہ کہہ کر پھنس گئے اور ان کے پاس اب کوئی چارہ نہ تھا۔ نواز شریف ان انتخابات سے اسحاق خان سے نجات چاہتے تھے۔ فوج کو یہ فارمولا اب قبول تھا جبکہ اسحاق خان چھٹی پر جانا نہیں چاہتے تھے اور کھسیانی بلی کی طرح استعفیٰ کے الفاظ پر مختلف ڈکشنریوں کا مطالعہ کررہے تھے۔ یہ عجیب صورتحال تھی کہ دو تہائی اکثریت رکھنے والا وزیراعظم اقتدار سے دستبردار ہورہا تھا لیکن اسحاق خان استعفیٰ کے بجائے چھٹی جانے پر بضد تھا اور اپنے مستعفی ہونے کی تحریر کے مختلف الفاظ ڈھونڈ رہے تھے اور ان منتخب الفاظ کو تحریر میں لانے کیلئے بھی انہوں نے دو دن لئے۔

یہ کوئی موازنہ نہ تھا۔ کہ 42 سالہ نوجوان سیاست دان نواز شریف 82 سالہ بزرگ بیوروکریٹ کے ساتھ رخصت ہورہا تھا۔ عبوری وزیراعظم کا نام آیا تو آرمی کی انٹیلی جنس ایجنسیاں سرتاج عزیز کو

اعتماد میں لے چکی تھیں اور وہ ایجنسیوں سے نواز شریف کو معین قریشی کے نام پر راضی کرنے کی حامی بھر چکے تھے۔ اس کے علاوہ بھی کئی نام نہاد فرضی نام میٹنگ میں پیش کئے گئے۔ نواز شریف کے ساتھ مذاکرات میں سرتاج عزیز اور جنرل عبدالمجید ملک بھی شامل تھے۔ مجید ملک کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ ان کے ساتھ کسی نے رابطہ قائم کیا یا نہیں لیکن سرتاج عزیز کے متعلق کہہ سکتا ہوں کہ معین قریشی کو قائم مقام وزیراعظم بنانے کیلئے انہوں نے اہم لابی کی اور نواز شریف کے واشنگٹن میں مقیم ذاتی دوست (غالباً قصور کے رہنے والے) شیخ سعید کا بھی معین قریشی سے دوستانہ تھا۔ اس طرح ایک انجانا نام دیکھتے ہی دیکھتے وزارت عظمٰی کا امیدوار بن گیا۔ اب بینظیر کو فوج والے خصوصی طیارے سے جی ایچ کیو لائے اور بینظیر نے ہڑتال کی کال کو اپنے ساتھیوں سے مشورے کے بنا ہی ختم کر دیا۔ انہوں نے ایک تیر سے دو شکار کئے تھے اور ان کے دو مخالف حریف ایک ہی وار سے ختم ہو گئے۔ گو اس نے اسحاق خان کو دوبارہ صدر نامزد کرنے کا وعدہ کیا مگر بھٹو خاندان میں وفاداری نام کی کوئی چیز ہی نہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جس دن ذوالفقار علی بھٹو شملہ معاہدہ کیلئے جا رہے تھے تو انہوں نے جانے سے پہلے مری میں طلباء کو بلایا' انہوں نے طلباء کے سامنے ایک کاغذ کو درمیان سے دو ٹکڑے کر دیا اور کہا کہ وعدے اور معاہدے وقت آنے پر اس طرح پھاڑ دیئے جاتے ہیں۔ نواز شریف جب یہ تجویز لیکر کابینہ میں آئے تو اس سے پہلے وہ نئے انتخابات اور عبوری حکومت کے بارے میں تمام باتیں طے کر آئے تھے۔ کابینہ کا منظر دیدنی تھا۔ سب سے پہلے اعظم سواتی اُٹھے انہوں نے علم بغاوت بلند کیا پھر صدیق کانجو نے' سوائے سرتاج عزیز کے کسی کو یہ بات قبول نہ تھی۔ جب سرتاج عزیز نے عبوری حکومت اور نئے انتخابات کی حمایت کی تو میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور کہا کہ سرتاج عزیز کو مبارکباد ملنی چاہئے کیونکہ انہوں نے تو معین قریشی کی اچکن پہلے سے ہی سلوا کر رکھی ہوئی ہے' کیوں نہ ہو ورلڈ بینک کا آدمی ہے شناختی کارڈ بھی یہی بنوائیں گے۔ میرے ساتھیوں نے اچکن والی میری بات کو جملہ بازی سمجھا جبکہ حقیقت میں مجھے بہت پہلے سے علم تھا کہ وہ معین قریشی کی اچکن سلوا رہے تھے۔

اگلے دن صبح ایم این ایز کی پارلیمانی میٹنگ تھی تا کہ ان کو اعتماد میں لیا جا سکے لیکن یہاں پر اعجاز الحق نے پتا نہیں سنجیدگی سے یا ازراہ مزاح سپیکر گوہر ایوب کو فون کیا کہ وہ عدم اعتماد کی تحریک لا رہے ہیں۔ ان کا فون ایجنسیاں ٹیپ کر رہی تھیں چند ہی لمحوں بعد ایک نیا ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ اعجاز الحق کو بہت سارے وزراء کی حمایت حاصل تھی کیونکہ وہ یوں اچانک الیکشن کیلئے تیار نہ تھے۔

اسمبلی کے راستے بند کر دیئے گئے اور اعجاز الحق کو فوراً ڈھونڈا گیا۔ اعجاز الحق کو وارننگ بھی دی گئی کہ وہ ایسا کرنے سے باز رہیں۔ وہ تھوڑی دیر کے بعد پرائم منسٹر ہاؤس آئے اور انہوں نے کہا میں تو مذاق کر رہا تھا۔

اگلے روز کی میٹنگ منسوخ کردی گئی کیونکہ کابینہ کے اجلاس سے واضح ہوگیا تھا کہ نوازشریف کے ساتھی انتخابات میں جانے کو تیار نہیں ہیں۔ بہت سے وزراء کے طوطے اُڑے ہوئے تھے کیونکہ کافی عرصے سے وہ اپنے حلقوں میں نہیں گئے تھے جبکہ نوازشریف پراُمید تھے اس لئے انہوں نے اتنا بڑا رسک لیا اور میں نے ایک آخری جملہ اجلاس میں کہا' جو بہت سے لوگوں کو بُرا لگا کہ:

جب سب باتیں طے ہوچکی ہیں اور وعدے وعید ہوچکے ہیں تو ان اجلاسوں کا کیا فائدہ اب ہمیں اپنے حلقوں میں جانا چاہئے۔

میں نے اسی اجلاس میں پیش گوئی کردی تھی کہ بظاہر انتخابات منصفانہ نظر آئیں گے مگر مخصوص حلقوں میں ریگ مال کا استعمال کیا جائے گا اور میرا اندازہ درست ثابت ہوا کہ مخصوص دستانے پہنے ہاتھوں نے بینظیر کے حلیفوں کو اکٹھا رکھا اور نوازشریف کے ووٹوں کو تقسیم کرنے کے لئے اسی مخصوص ہاتھ نے جماعت اسلامی کو یہ غلط تاثر دیا وہ اس ملک کی تیسری بڑی سیاسی قوت ہے وہ جس طرف جائیں گے وہی حکومت بنائے گا۔

جبکہ حقیقت اس کے برعکس تھی لیکن بین الاقوامی سازش کے تحت نوازشریف حکومت کا خاتمہ کردیا گیا۔ میں نے اپنے دورہ امریکہ سے واپسی پر ایک رپورٹ لکھی تھی جس میں واضح کہہ دیا تھا کہ امریکن موجودہ حکومت سے خوش نہیں ہیں اور امریکی دانشوروں کا کہنا ہے کہ امریکہ 2000ء سے لیکر 2010ء تک پاکستان میں جغرافیائی تبدیلیاں دیکھ رہا ہے۔ شہریار اور صدیق کانجو کی موجودگی میں وزیراعظم نوازشریف نے میری اس رپورٹ کا سنجیدہ نوٹس نہیں لیا بلکہ عابدہ حسین نے ایک سخت نوٹ لکھ کر بھیجا کہ شیخ رشید کو امریکہ میں ضرورت سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے جبکہ میں نے کسی امریکن سے ملاقات کا اظہار نہیں کیا تھا خود ان کے اعلیٰ حکام کشمیر کے مسئلے پر مجھ سے میٹنگ در میٹنگ کررہے تھے میں نے اپنی رپورٹ نوازشریف کو تحریری طور پر بھی دی تھی۔ نوازشریف نے مذاکرات میں قوم سے آخری خطاب کا بھی مسئلہ طے کرلیا تھا جس میں صدر اسحاق خان نے رخنہ ڈالنے کی کوشش کی لیکن طے شدہ باتوں پر عبدالوحید کاکڑ نے سٹینڈ لیا کہ نوازشریف اپنی آخری تقریر حسب خواہش کرنے کا حق رکھتے ہیں اس طرح نوازشریف نے پرائم منسٹر ہاؤس خالی کرنے میں دیر نہ کی اور اپنا ذاتی سامان کچھ شجاعت الٰہی کے گھر' کچھ ریڈکو اور کچھ اپنے ذاتی گھر ماڈل ٹاؤن بھجوا دیا اور اس طرح دوتہائی ووٹوں سے زائد اکثریت رکھنے والی بلند و عالی شان حکومت زمین بوس ہوگئی۔

غلام اسحاق خان

سیاسی تجزیہ نگار سمجھتے ہیں کہ نوازشریف نے وقت سے ایک سال قبل صدارتی انتخابات اور آٹھویں ترمیم کی تاریں چھیڑ کر صدر اسحاق خان کے حملے کو بے وقت دعوت دی۔ میرے خیال سے صدر اسحاق خان پہلے دن سے ہی نوازشریف کو وزیراعظم نہیں بنانا چاہتے تھے۔ پاکستان کی عوام نے ہمیشہ سیاسی

سوجھ بوجھ کا ثبوت دیا مگر صدر اسحاق خان اس صلاحیت سے محروم تھے وہ دیوار کے پیچھے تو کیا دیوار کے اوپر دیکھنے کی بھی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ پاکستان کا حکمران ایجنسیوں کی رپورٹوں پر بڑا یقین رکھتا ہے اور اقتدار ایسی چیز ہے کہ بڑے بڑے عوامی لوگوں کو چاپلوسی کرنے والوں کا جھرمٹ گھیر لیتا ہے میں نے نواز شریف کو ایسا آدمی پایا جو پرخلوص تنقید کو سنتا تھا لیکن اتنی بڑی اکثریت سے منتخب ہو کر آنے پر پہلے دن اسحاق خان نے نواز شریف کو مارک کر دیا تھا وہ خدا معلوم کس چیز کا بنا انسان تھا شروع دنوں میں ہی اسحاق خان نے نواز شریف کے قریبی ساتھیوں سے یہ پوچھنا شروع کر دیا کہ نواز شریف کی آٹھویں ترمیم کے بارے میں کیا رائے ہے۔

بیوروکریسی اسحاق خان کو اپنا بندہ جانتی تھی۔ فوج کی پروموشنز پر انکی نظر تھی معمولی عہدے سے وہ یہاں تک پہنچے تھے بہت ساری محلاتی سازشوں کو انہوں نے قریب سے دیکھا تھا' پاکستان کے واحد آدمی تھے جو معمولی سرکاری ملازمت سے یہاں تک پہنچے تھے ان کے پیٹ میں بھی دانت تھے اگر انہیں پشاور جانا ہوتا تو لاہور کی طرف جاتے اور موڑ کھا کر پشاور کا راستہ اختیار کرتے۔ وہ ایسے بھنور میں پھنس چکے تھے کہ نہ چاہتے ہوئے بھی نواز شریف کے وزیراعظم کا حلف لینے پر مجبور تھے۔ بہت لمبی منصوبہ بندی کرتے تھے انہوں نے محدود آدمیوں پر مشتمل اپنا ایک انفارمیشن سیل بنا رکھا تھا۔ ملک کے بیوروکریٹ نواز شریف کے بجائے ان کی طرف دیکھتے تھے نواز شریف کی کابینہ میں ان کے کور سروس کے بعض لوگ موجود تھے اور دو توپیں تو انہوں نے سرعام رکھی ہوئی تھیں۔ ایک اجلال حیدر زیدی اور دوسرے روئیداد خان۔ وزارت خزانہ ان کے جیب کی گھڑی تھی۔ پنجاب کے بارے میں اتنی اچھی رائے نہ رکھتے تھے۔ کابینہ کے پہلے دن حلف لینے کے لئے جس دن نواز شریف نے پوری کابینہ تحلیل کردی' کم و بیش ایک گھنٹہ انہوں نے وزراء کا حلف لینے سے انکار کئے رکھا اور پریذیڈنٹ ہاؤس میں ایک طرف وزراء اچکنیں پہنے ہائی جینٹری کی موجودگی میں مضطرب دکھائی دیتے تھے تو دوسری جانب صدر ہاؤس کے کمرے میں بیگم کلثوم' سیف اللہ' صدر اسحاق خان' نواز شریف مذاکرات کر رہے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ نواز شریف انور سیف اللہ کو وزیر مملکت بنانے پر راضی ہو گئے لیکن بحالت مجبوری صدر اسحاق خان سے زیادہ بیگم کلثوم متحرک تھیں۔

اس خاندان کے بارے میں میرے اور نواز شریف دونوں کے اندازے ایک جیسے تھے کہ یہ خاندان ہمدردیاں بدلتے عدت کے دن بھی پورے نہیں کرتا۔ ایک دن جنرل فضل الحق نے میری موجودگی میں ایک بڑے سائز کی گالی دیتے ہوئے کہا کہ یہ خاندان جس کا کھاتا ہے اسی کو ڈستا ہے اور اگر ایک طرف سانپ آ رہا ہو اور دوسری طرف سے یہ' نواز شریف پہلے ان کو مارنا یہ بہت بڑے ناسور ہیں ملک کے۔

لیکن نواز شریف بے چارہ شریف آدمی تھا وہ بے بس ہو گیا اور اسحاق خان اس وقت تک حلف اُٹھانے نہیں آئے۔ جب تک حلف سے ایک دو منٹ پہلے ایک نئی کرسی نہ لگوائی گئی جس پر انور سیف

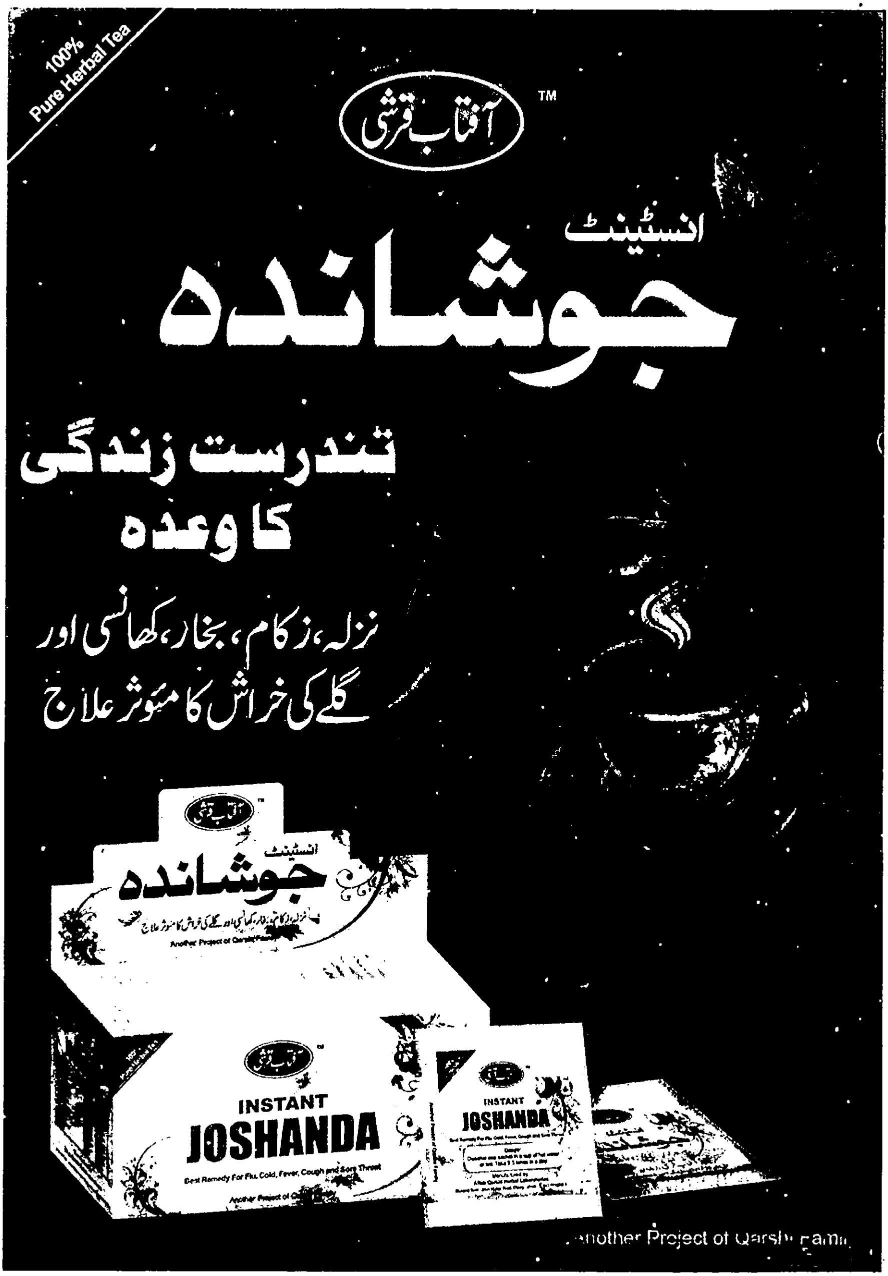
اللہ نے بطور فل فیڈرل منسٹر حلف اُٹھایا۔ صدر ہاؤس ہال میں بیگم کلثوم سیف اللہ اس تمکنت کے ساتھ داخل ہوئیں جیسے وہ کیس جیت گئی ہیں۔ نواز شریف میں ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ آدمی کی پہچان رکھتے ہیں اور بعض باتوں کو دل کے فریج کے سردخانے میں لگائے رکھتے ہیں۔

اجلال حیدر زیدی اور روئیداد خان کابینہ کے اجلاسوں میں شریک تو ہوتے تھے لیکن کسی بحث میں حصہ نہیں لیتے تھے۔ کان اور آنکھیں کھلی رکھتے لیکن انہوں نے کبھی کابینہ کے اجلاسوں میں منہ نہیں کھولا میرے خیال میں اسحاق خان کو سب سے بڑا دُکھ یہ تھا کہ نواز شریف اکثر فیصلے تنہا لیتے تھے۔ انہیں پہلے دن سے ہی معلوم تھا کہ نواز شریف انہیں اگلی ٹرم پر صدر نہیں بنائیں گے۔ اجلال حیدر زیدی کو جب کرپشن کے الزامات میں نکالا گیا تو اسحاق خان بہت سیخ پا ہوئے لیکن ایئر پورٹ کے رن وے کی تعمیرات میں واقعی گھپلے ہوئے تھے اور ایم کیو ایم کے وزیر نے بڑی محنت سے رپورٹ بنائی تھی جس نے اجلال زیدی کو مورد الزام ٹھہرایا اور نواز شریف نے اجلال زیدی کو اُٹھا کر باہر پھینک دیا۔ اس طرح نواز شریف اور اسحاق خان کی سرد جنگ میں اور اضافہ ہوا۔ دونوں کی براہ راست ملاقاتوں میں کمی واقع ہوگئی۔

ہمارے ملک میں اقتدار کی سیاست میں یہ نقص ہے کہ جس شخص میں جن امور کی صلاحیت ہو اس کو وہ وزارت نہیں دی جاتی۔ جس کی اپنی صحت خراب ہو اسے وزیر صحت بنا دیا جاتا ہے جسے دفاع کی زیر زبر بھی نہیں آتی ہو اسے وزیر دفاع بنا دیا جاتا ہے۔ آزاد کشمیر کے اقتدار کی تاریخ میں ایک ایسے شخص کو ایک ایسے آدمی کو وزیر تعلیم بنوا دیا گیا جس نے سکول کا منہ نہ دیکھا تھا اور آج بھی یہ روایت جاری ہے کہ نوابزادہ نصر اللہ کو کشمیر کمیٹی سونپی گئی جس نے کشمیر کمیٹی کا چیئرمین بننے سے پہلے کوہالے کا پل بھی پار نہیں کیا تھا۔ اور 1947ء تک قیام پاکستان کے مخالفوں میں شامل تھا۔

انہیں زندگی کا پہلا غیر ملکی سفر بھی کشمیر کمیٹی کے فنڈ سے کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ جس کو چھ کلمے پورے نہیں آتے تھے اسے اسلامی نظریاتی کونسل کا چیئرمین بنا دیا گیا۔ خارجہ امور کی کمیٹی کا چیئرمین ایسے انسان کو بنایا جاتا ہے جو خارجہ امور کے نام پر خارجہ امور کے بجائے ڈیرہ اسماعیل خان میں مدرسہ کیلئے چندہ جمع کرنے میں مصروف رہا اور کویت ایمبیسی نے جن شیخوں سے ان کی ملاقات رکھوائی تو وہ ان کویتی شیخوں سے ملکی امور سے زیادہ مدرسہ کیلئے زکوٰۃ کے حصول کیلئے جدوجہد کر رہا تھا۔

میں دُور چلا گیا بات تو اسحاق خان کی ہو رہی تھی۔ سرد جنگ اس وقت چل رہی تھی اور مختلف اعتراض بھری چٹھیاں نواز شریف کو موصول ہو رہی تھیں۔ انور زاہد کو جو کہ اس وقت نواز شریف کے پرنسپل سیکرٹری تھے ان کو تبدیل کر کے پی آئی اے میں بھیج دیا گیا چونکہ انور زاہد اور چودھری نثار کے گہرے ساتھ ساتھ تھے اور دونوں میں ٹھنی ہوئی تھی اور اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ انور زاہد وزیراعظم کی کچھ فائلوں کو چودھری نثار سے دُور رکھتے تھے۔ قاضی علیم اللہ جلیبی کی طرح سیدھے تھے۔ نمازی پرہیز


100% Pure Herbal Tea
آفتاب قرشی ™
انسٹینٹ
جوشاندہ
تندرست زندگی
کا وعدہ
نزلہ، زکام، بخار، کھانسی اور
گلے کی خراش کا مؤثر علاج
INSTANT
JOSHANDA
Best Remedy For Flu, Cold, Fever, Cough and Sore Throat
nother Project of Qarsh

گار اور اپنے کام کے لئے پرکار کی طرح اپنے پاؤں پر گھومنا جانتے تھے۔
اب وزیر اعظم ہاؤس میں آئی ایس آئی کے تبلیغی سربراہ کے علاوہ دم درود کا پرنسپل سیکرٹری بھی موجود تھا لیکن اس طرح پرائم منسٹر ہاؤس کے سرکاری معاملات میں اسحاق خان نواز شریف کا گھیرا تنگ کر رہے تھے جبکہ چودھری نثار صدر ہاؤس اور پرائم منسٹر ہاؤس کے درمیان آمدورفت کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھے اور ایک دفعہ مجھے شک گزرا کہ صدر اور وزیر اعظم کے مابین جنگ میں چودھری نثار کس کا ساتھ دیں گے لیکن شہباز شریف کا اندازہ درست نکلا انہوں نے آخری لڑائی میں نواز شریف کا ساتھ دیکر وفادار ہونے کا ثبوت دیا۔
اسحاق خان کی نہ صرف ملک بلکہ مسلم لیگ کی صدارت پر بھی نظر تھی۔ وہ ایک ٹکٹ میں دو مزے لینا چاہتے تھے لیکن یہ جنگ اس وقت آخری راؤنڈ میں داخل ہوگئی جب بینظیر کو خارجہ امور کی کمیٹی کا چیئرمین بنا دیا گیا۔ اس دن شہباز شریف نے مجھے کہا دیکھا کیسا کمال دکھایا لیکن میرے علاوہ کسی میں یہ بات کہنے کی جرأت نہ ہوئی کہ بڑے بھائی کو جلد فارغ کرانے میں آپ کا یہ اقدام کارگر ثابت ہوگا اور جب ایجنسی نے افتخار گیلانی سے شہباز شریف کے مذاکرات کی کیسٹ صدر اسحاق خان تک پہنچا دی تو باقی کچھ نہیں رہ گیا تھا۔
افتخار گیلانی کو بینظیر نے لندن میں کوئی لفٹ نہیں کرائی کیونکہ درانی کی دی ہوئی ٹائمنگ کے مطابق وہ انتظار کر رہی تھیں اور براہ راست ایجنسیوں سے رابطے میں تھیں۔ جب سینٹ میں نواز شریف نے آٹھویں ترمیم کیخلاف اعلان جنگ کیا تو ان کا خیال تھا کہ صدر کے حملہ آور ہونے سے پہلے ہی وہ انہیں گھیرے میں لے لیں۔ ایک سپر پاور نے بھی کمال دانش مندی سے اپنے کارڈ کھیلے یہ سپر پاور فوج کے ساتھ بھی تھی بینظیر کے ساتھ بھی اور صدر اسحاق خان اور نواز شریف کے ساتھ بھی لیکن میرے نزدیک یہ نواز شریف اور اسحاق خان سے بیک وقت جان چھڑانا چاہتی تھی۔ نواز شریف کو یہ تاثر دیا گیا کہ اگر اسحاق خان صدر نہ ہوا تو وہ انتخابات منصفانہ طور پر آسانی سے جیت لیں گے۔ قائم مقام صدر وسیم سجاد کو یہ گولی دی گئی کہ وہ بالکل نیوٹرل رہیں تاکہ آئندہ صدارت میں ان کا سکوپ رہے۔ جنرل فرخ درانی اور قاضی کے ذریعے عبدالوحید کاکڑ کو بائی پاس کیا گیا اور ان تین جرنیلوں نے بینظیر کے اقتدار کی سیڑھی بننے کیلئے اہم کردار ادا کیا اور بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ اسحاق خان اور نواز شریف کی لڑائی کا ریموٹ کہیں اور تھا۔ ہر دو صورتوں میں ان دونوں شخصیات نے ٹکرانا تھا نواز شریف نے رسک لیا اور انتخابات میں کود پڑے۔

چیف آف آرمی سٹاف کی تعیناتی

میرے نزدیک نواز شریف کے اقتدار کے خاتمے کی ایک اور بڑی وجہ چیف آف آرمی سٹاف کا انتخاب تھا۔ اسلم بیگ سے ان کی نہیں بنتی تھی آخری دنوں میں وہ مارشل لاء لانے کو تیار تھے اور میں کوئی

ڈاکٹر تو نہیں مگر میرے خیال میں سیاسی معاملات کو دیکھتے ہوئے وہ بہت بڑے دباؤ سے گزر رہے تھے۔ لانگ مارچ کی تحریک خالصتاً جنرل آصف نواز کے اشارے پر شروع کی گئی تھی اور جس کے نتیجے میں اپوزیشن کی ایک لاش بھی حاصل کرنے کی خواہش پوری نہ ہوسکی۔ اپنے راستے کے پتھر صاف کرنے کیلئے جنرل آصف نواز جنرل حمید گل سے الرجک تھے اس لئے وہ جنرل حمید گل کو واہ آرڈیننس فیکٹری کا چارج سنبھالنے کا حکم دے چکے تھے اور جنرل حمید گل پس و پیش کر رہے تھے۔ اس پر مدد کے لئے جنرل حمید گل نے نواز شریف سے رابطہ کیا اور مداخلت کی اپیل کی لیکن جنرل آصف نواز نے دھمکی دی کہ وہ جنرل حمید گل کا کورٹ مارشل کر دیں گے۔ جنرل حمید گل کو نواز شریف پسند کرتے تھے لیکن آصف نواز کے دباؤ کے تحت وہ بے بس ہوگئے اور اس طرح جنرل حمید گل جو بہت زیادہ لمبی پلاننگ کرتے تھے اور خود کو فوج کا ارسطو سمجھتے تھے لائن سے باہر ہوگئے حالانکہ میرے خیال میں اگر وہ واہ آرڈیننس فیکٹری کا چارج لے لیتے تو جنرل آصف نواز کی موت کے بعد وہی ملک کے نئے آرمی چیف آف سٹاف ہوتے اور اپنی دبی ہوئی خواہشوں کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکتے لیکن انسان کچھ سوچتا ہے اور خدا کو کچھ منظور ہوتا ہے۔ ایک لمحہ کی غلطی زندگی بھر کا پچھتاوا چھوڑ دیتی ہے۔ صدر اسحاق خان نے جنرل فرخ کے دینا حیات کیس میں دلچسپی کا پہلے سے ہی نوٹس لے رکھا تھا۔ وہ کھٹڑ قوم کے سردار شوکت حیات کو لیکر جنرل آصف نواز کے پاس جب گئے تو اسحاق خان نے یہ بات دل میں بٹھالی۔ آصف نواز اپنے دور اقتدار میں ملک نعیم اور چودھری نثار کو ان کے بھائیوں کے حوالے سے ڈرا دھمکا چکے تھے کیونکہ دونوں کے بھائی اور بہنوئی فوج میں اعلیٰ عہدوں پر متعین تھے اور دونوں بھائیوں کو کھڈے لائن لگانے کا سگنل دے چکے تھے۔

آخری دنوں میں تو جنرل آصف نواز رانا شاہد جیسے بے ضرر آدمیوں کو بھی ڈرا دھمکا رہے تھے۔ سب سے زیادہ الرجک وہ بریگیڈیئر امتیاز سے تھے حالانکہ شروع دنوں میں بریگیڈیئر امتیاز آصف نواز کے بہت حامی تھے ان کی موت کے بعد نواز شریف کی پانچ رکنی کابینہ میں ہر ایک کی اپنی رائے تھی لیکن آج شہباز شریف بھی اس بات کی گواہی دے سکتے ہیں جب صدر نے جنرل فرخ کا نام چیف آف آرمی سٹاف کیلئے پیش کیا تو میں نے کہا کہ صدر اسحاق خان کے پیٹ میں کوئی اور نام ہے آپ اس نام پر لبیک کہیں تو بھاگ جائیں گے لیکن میرا فوجی بیک گراؤنڈ نہیں اور جو نام نواز شریف کو فوجی امور کے سیاسی مشیر دے رہے تھے میں ان سے ناواقف تھا۔ جبکہ نواز شریف پانچ رکنی کابینہ کا جس کا میں بھی ایک ادنیٰ رکن تھا عجیب مخمصے کا شکار تھی۔ راولپنڈی سے منتخب ہونے کے باوجود نہ میری کسی سے دلچسپی نہ ہیلو ہائے تھی لیکن میں نے اپنی یہ رائے دیدی تھی کہ جو صدر اسحاق خان نام پیش کریں اور جو سنیارٹی پر آتا ہو اس پر آمین کہی جائے لیکن میری کہی نہ کہی کے برابر تھی۔ میرے خیال میں جس کا نام وہ پیش کر رہے تھے اس کو نواز شریف کے منظور نہ کرنے پر خوب ایکسپلائٹ کیا۔ جنرل اسد درانی نے کمال باریکی سے

اپنے مہروں کو چلایا اور شاہ محمود قریشی' نوریز شکور اور فیصل آباد کے چودھری نذیر کو آنکھ کے اشارے سے دوسری طرف بھجوا دیا۔ قاضی حسین احمد کے گرد ایک مخصوص ٹولہ لگا دیا گیا تاکہ وہ نواز شریف کے مددگار ثابت نہ ہوں اور ایک چھپے ہوئے غیر ملکی ہاتھ کا مقصد یہ بھی تھا کہ اسلامی قوتوں میں نفاق ڈال کر ان کو ایک ایک کر کے مارا جائے۔ جماعت اسلامی کا سیاسی امیج اور خوف ختم کر دیا جائے جماعت اسلامی کو یہ تاثر دیا گیا کہ 25 سے 30 سیٹیں لے جائیں گے جبکہ انہیں صوبہ سرحد سے صرف دو سیٹیں ملیں۔ کراچی کی تیسری سیٹ ایم کیو ایم کے الیکشن نہ لڑنے کی مرہون منت ہے اس طرح نواز شریف کی بیس سیٹیں ضائع ہو گئیں جو ایک ہزار ووٹ کے فرق کی وجہ سے ہاری گئیں۔

چیف آف آرمی سٹاف جنرل عبدالوحید کاکڑ ایک پکے بااصول اور دیانتدار فوجی انسان ہیں لیکن جنرل درانی اور جنرل فرخ نے پنجاب کے بحران میں ووٹوں کو نہ صرف شہ دے کر رکھی بلکہ گجرات' ساہیوال اور سرائیکی بیلٹ کے انتخابات کا تجزیہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ دال میں کچھ نہ کچھ تو کالا ہے۔ ورنہ 30-35-35 ووٹوں سے تو کبھی کونسلروں کے انتخاب کا فیصلہ نہیں ہوا۔ اعظم ہوتی' نادر پرویز' عاشق ڈیال' نعیم چٹھہ اور کئی دوسرے امیدواروں کے انتخاب قابل تجزیہ ہیں لیکن ایک بات بڑی واضح ہے کہ چیف آف آرمی سٹاف کی تعیناتی میں جنرل فرخ اور کئی دوسرے ناموں کے انکار پر نواز شریف کو اس کی قیمت ادا کرنی پڑی جنرل وحید نے دیانتداری سے الیکشن کرائے لیکن اپنے اندر چھپے ہوئے رستموں کو نہ دیکھ سکے۔

وزیراعلیٰ غلام حیدر وائیں کا انتخاب

غلام حیدر وائیں کی مسلم لیگ سے محبت اور ان کی دیانتداری حب الوطنی پر کوئی شک نہیں کرتا تھا لیکن غلام حیدر وائیں کو وزیراعلیٰ بنانا ایسا ہی تھا جیسے جس آدمی نے گھڑسواری نہ کی ہو اسے نیزہ بازی کے عالمی مقابلے میں بھیج دیا جائے۔ اس کا بڑا ذمہ دار میں شہباز شریف کو سمجھتا ہوں کیونکہ مرکز میں بڑے بھائی کے وزیراعظم بن جانے کے بعد صوبہ میں ان کے چیف منسٹر بننے کا کوئی سکوپ نہ تھا اور وہ پنجاب کو کسی ایسے آدمی کے حوالے کرنے پر تیار نہ تھے کہ اس طرح مستقبل میں ان کے وزیراعلیٰ بننے کے خواب ادھورے رہ جائیں گے۔ بظاہر تو غلام حیدر وائیں چیف منسٹر تھے لیکن ایک اے ایس آئی بھی ان کے کہنے میں نہ تھا بعض لوگوں کو غلام حیدر وائیں کی ضد سے مثلاً سیالکوٹ کے چودھری اختر گجر کو بھی کابینہ میں نہیں لیا گیا جن لوگوں کو انہوں نے کابینہ میں لیا وہ بھی ان کے لطیفے سناتے اور بے اختیار تمسخر اُڑاتے تھے۔ کہنے کو وہ چیف منسٹر تھے لیکن لاہور کا ایس ایس پی اور ڈی آئی جی بھی ان کا کہا نہیں مانتے تھے۔ پنجاب کی تمام بیوروکریسی کسی اور طرف سے فیصلے لیتی تھی مسلم لیگ کی رکنیت سازی پر انہوں نے زور دیئے رکھا۔ ایک دن چڑ گئے اور لال حویلی کیخلاف سیخ پا ہو گئے کیونکہ میں نے انہیں کہہ دیا تھا کہ پاکستان کی تاریخ میں اتنی جعلی ممبر سازی نہیں ہوئی جتنی وائیں صاحب کے دور میں ہوئی۔ مسلم لیگ

ہاؤس کے کمرے کے کمرے پرچیوں سے بھر گئے ہیں اور بعض جگہ تو گاؤں کی آبادی سے زیادہ مسلم لیگ کے ممبر بن گئے ہیں۔ یہ کہنا تھا کہ وائیں صاحب نے مجھے کم اور لال حویلی کو زیادہ طعنے دینا شروع کر دیئے۔ مسلم لیگ کا سب سے بڑا سانحہ یہ ہے کہ عوامی قیادت کو آگے نہیں آنے دیتی۔ پہلی دفعہ نواز شریف نے اسے علاقائی اور اقتدار کی سازشوں سے نکال کر عوامی جماعت بنایا۔ نواز شریف نے بطور اپوزیشن لیڈر والنٹیئرز کے نام مانگے تو سیاسی کلرکوں نے بڑی کمپیوٹرائزنگ اور بک بائنڈنگ کا مظاہرہ کیا لیکن ابھی تک کسی والنٹیئر کو جواب نہ دیا گیا اور نہ اس کے ذمہ کوئی ٹاسک سونپا گیا۔ یہی حال مسلم لیگ کی رکنیت کا ہوا کہ لوگ پوچھتے تھے اقبال خان کی دستخطوں والی رکنیت سازی چلے گی یا نہیں میرے خیال میں وہ وقت آن پہنچا تھا کہ سیاسی ناسوروں کو ختم کر دینا چاہئے تھا اور ورکروں کو مسلم لیگ میں مقام دینا چاہئے تھا جس کا بڑا ثبوت لاہور 1993ء کے ضمنی انتخابات ہیں۔ لاہور نے نواز شریف کو ووٹ دیا جس میں طارق بانڈے' میاں منیر' میاں عبدالوحید اور اسحاق ڈار جیسے غیر معروف نام بھی منتخب ہو کر اسمبلی میں پہنچ گئے اور اعتزاز احسن جیسے منجھے ہوئے لوگوں کو جنرل اختر عبدالرحمٰن کے فرزند نے بالکل نئے حلقوں میں چاروں شانے چت کر دیا۔

نواز شریف کی چیف منسٹر شپ کی زبردست ایڈمنسٹریشن کے بعد کے غلام حیدر وائیں کو پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ پنجاب سونپ دینا کسی قومی سانحہ سے کم نہیں تھا۔ اس طرح نواز شریف کی توجہ دو حصوں میں بٹ گئی پنجاب سے بھی انہیں ٹھنڈی ہوائیں نہیں آ رہی تھیں اور اسلام آباد بھی ایک معرکے سے دوچار تھا۔ کچھ دنوں بعد غلام حیدر وائیں نے چھٹی پر اس طرح حلقے میں جانا شروع کر دیا جس طرح نواز شریف چھٹی پر لاہور جایا کرتے تھے۔ پاکستان کے سیاست دان کو یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے کہ ترقیاتی کام کرنے سے اور ہر ہفتے اپنے حلقے جانے سے شاید ان کا حلقہ انتخاب مضبوط ہوتا ہے جبکہ انڈیا کا سیاست دان دس دس' بارہ بارہ سال اپنے حلقے میں نہیں جاتا لیکن اپنے کردار اور سیاسی سوجھ بوجھ سے اور میڈیا کے سہارے اپنا امیج بلڈ اپ کرتا ہے اور اس کے ووٹروں کے ذہن میں اس کا تصور اتنا بلند ہوتا ہے کہ اس کے ووٹروں کی نظر میں اس کے مخالفین بونے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ غلام حیدر وائیں کو چودھری شجاعت حسین برادران سے کوئی تکلیف نہیں پہنچی انہوں نے وائیں سے مکمل تعاون کیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلم لیگ میں ان کی بے انتہا خدمات تھیں لیکن کسی نے صحیح کہا کہ صلاحیتوں سے عاری شخص کو ذمہ داری سونپنے والا خود اس کے بھنور میں پھنس جاتا ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کسی نے پوچھا اقتدار کو طول دینے کا کیا فارمولا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا' اپنا ہاتھ کھلا رکھو دستر خوان بڑھا کر رکھو۔ جن لوگوں نے نواز شریف کے ساتھ کام کیا تھا اسی تیزی سے ذاتی اور ترقیاتی کام ان کے ہوئے تھے۔ اس کے مقابلے میں غلام حیدر وائیں نے نہ صرف ہاتھ کھینچ کر رکھا بلکہ وہ جوڑ

توڑ کی سیاست سے بھی نابلد تھے۔اور جب میرٹ کی پالیسی کا شور مچایا گیا تو ایک دن لاہور مسلم لیگ ہاؤس میں، میں نے کھل کر تقریر کی کہ بھائی پھیرو کے ٹاٹ سکول سے پڑھنے والے اور ایچی سن سے پڑھنے والوں کا کوئی مقابلہ نہیں ہے اور میرٹ کا شور مچانے والے میریٹ ہوٹل میں آ کر رہیں گے۔ میری زبان کالی ثابت ہوئی اور میرا خیال درست نکلا یہ اپنے صوبے میں جو نواز شریف کا قلعہ تھا اسلام آباد کے میریٹ ہوٹل میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے اور حاجی شہباز نامی ایسا ایم پی اے بھی اپنے کنٹرول میں نہ رکھ سکا جو نواز شریف کے پہنچنے سے پہلے اپنی گاڑی کی ڈگی میں ریڈی میڈ بینر رکھتا تھا اور جہاں نواز شریف جاتا وہاں اس کی قیام گاہ کے اردگرد درات کو لگا دیتا تھا۔ میں پہلے دن سے روتا تھا کہ حق دار کو اس کا حق دو جو اقتدار کو بانٹتا نہیں تو وقت آنے پر اقتدار اس کو ڈانٹتا ہے۔لاہور کے ایس ایس پی اور ڈی آئی جی جو شہباز شریف کی ٹیک پر گل چھرے اڑا رہے تھے اور شہباز شریف کی ناک کا بال تھے امتحان کا وقت آنے پر منظور وٹو سے پینگیں بڑھا رہے تھے یہی نہیں بلکہ ممبران کو اکٹھا کر کے منظور وٹو کی جھولی میں ڈال رہے تھے میں سمجھتا ہوں کہ نواز شریف کے اقتدار کو ختم کرانے میں پنجاب کی غیر دانشمندانہ حکمت عملی نے بڑا کلیدی کردار ادا کیا۔ اگر پنجاب میں کوئی مضبوط چیف منسٹر ہوتا تو سپریم کورٹ کے فیصلے کے بعد پنجاب کو قابو میں رکھا جاسکتا تھا۔ اکثر ایم پی اے گومگو کی حالت میں تھے اور بعض نے اسلام آباد کے میریٹ ہوٹل کو ایم پی ایز کی چھاؤنی بنا رکھا تھا اقتدار جانا ہی تھا مگر میریٹ ہوٹل کا ڈیڑھ کروڑ روپے کا بل چودھری پرویز الٰہی اور چودھری شجاعت الٰہی کے پیٹے میں پڑ گیا کیونکہ کمرے میں صرف ایم پی اے ہی نہیں ہوتا تھا بلکہ ان کے مہمانوں کے قیام وطعام کے لوازمات کا بھی پورا انتظام ہوتا تھا۔ شام کو شاہ محمود قریشی اور ملک سلیم جیسے لوگ بھی پرائم منسٹر ہاؤس کے ہال میں نواز شریف سے عہد و پیمان کرتے اور ہوٹل جا کر منظور احمد وٹو سے بھی رابطہ رکھتے۔ ایک دن سارا وزیراعظم ہاؤس پنجاب کے گورنر میاں اظہر کو ڈھونڈ رہا تھا۔ میں پہلے ہی نواز شریف سے پنجاب میں غلام حیدر وائیں کیخلاف اٹھنے والی بے چینی کا اظہار کرتا رہتا تھا۔دو دن سے میاں اظہر کو ڈھونڈا جا رہا تھا لیکن وہ اپنا کام دکھا چکے تھے۔ انہوں نے فیکس پر اپنا استعفیٰ اسحاق خان کو دے دیا تھا اور یہ استعفیٰ دیتے ہوئے نواز شریف سے مشورہ کرنا بھی ضروری نہ سمجھا تھا۔ میاں اظہر کو وقت سے پہلے ہی پنجاب کے ایم پی ایز کے جوڑ توڑ کا علم تھا لیکن انہوں نے زبان نہ کھولی اور اسحاق خان کو فیکس پر استعفیٰ دیکر نواز شریف کے اقتدار کے تابوت میں ٹھونکی جانے والی کیلوں میں ایک کیل کا اضافہ کیا۔ اگر وہ استعفیٰ نہ دیتے تو شاید نواز شریف کے مخالفوں کے لئے پیچیدہ مسائل پیدا ہوا جاتے

عمران خان اور طاہر القادری کی لندن ملاقات

عمران خان اور طاہر القادری دونوں انقلاب اور آزادی کی جدوجہد کیلئے کوشاں تھے اور ایک ایسی ملاقات ان کے درمیان ہوئی جو کہ لندن میں ہوئی جس کی ان دونوں لوگوں نے تردید کی لیکن ان

ملاقاتوں کے بعد ایسے لگا کہ پاکستان میں سیاسی میدان گرم ہونے جا رہا ہے۔ عمران خان نے یہ بہاولپور میں اعلان کیا کہ وہ 14 اگست کو آزادی مارچ کریں گے سانحہ ماڈل ٹاؤن کے بعد طاہر القادری کے ورکرز بڑے ہی پرجوش اور انتقامی تھے اس آپریشن میں جو کہ سترہ جون کو ہوا ساری کمان اور کنٹرول پنجاب کے وزیراعلیٰ ہاؤس سے کیا گیا جس طرح گولیاں چلیں اور جس طرح اس کی ٹی وی پر کوریج ہوئی اس سے شہباز شریف حکومت کا امیج عوام کی نظر میں تباہ و برباد ہو چکا تھا۔ جگہ جگہ عوام ان کیخلاف باتیں کر رہے تھے۔ اسی دوران طاہر القادری صاحب لندن سے پاکستان آئے۔ لاہور میں ان کا بہت زبردست استقبال ہوا۔ ان کے ورکروں پر بہت سخت لاٹھی چارج بھی ہوا اور کئی لوگ زخمی بھی ہوئے۔ میں نے بھی طاہر القادری صاحب سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ میں کئی مرتبہ طاہر القادری صاحب سے ملا اور طاہر القادری صاحب کی یہ خواہش تھی کہ عمران خان اور وہ دونوں اکٹھے نکلیں۔ جب ان کو ہر طرف سے گھیرے میں لے لیا گیا منہاج القرآن کے مرکزی سیکرٹریٹ کے باہر جہاں یہ لانگ مارچ کی تیاری میں لوگ آئے تھے اور ان کو کہا گیا کہ وہ تیار ہو کر آئیں لیکن پولیس نے خندق کھود دیں اور کنٹینر لگا دیئے ان سب لوگوں کو منہاج القرآن سیکرٹریٹ کے سامنے قید کر دیا گیا اور پابند کر دیا گیا۔ سارا منہاج القرآن سیکرٹریٹ کے اردگرد کا علاقہ بھی پولیس کے کنٹرول میں تھا اس دور میں 10 تاریخ کو جب یوم شہداء منایا گیا تو میں بھی سٹیج پر موجود تھا اور پرویز الٰہی بھی موجود تھے۔ مسلم لیگ ق پہلے ہی عوامی تحریک کے ساتھ اپنے ضابطہ اخلاق 10 نکات پر خطاب کر چکی تھی۔ میں طاہر القادری صاحب کے ساتھ سیاسی معاملات میں سیاسی صورتحال پر ملاقاتیں کرتا تھا میں طاہر القادری صاحب کا پیغام لے کے عمران خان کے پاس گیا کہ طاہر القادری صاحب کی خواہش ہے کہ جو 14 اگست کی ریلی ہے یا دھرنا ہے اس کے لئے عمران خان جب جلوس لے کر اسمبلی ہال لاہور سے نکلیں تو وہ ان کو ساتھ لیتے ہوئے جائیں۔ میں نے کوشش کی کہ عمران خان اور طاہر القادری اکٹھے نکلیں کیونکہ طاہر القادری کی اس بات میں بہت وزن تھا کیونکہ تاریخ بھی دونوں کی ایک ہی طے تھی۔ 14 اگست کو اس ریلی کو روکنے کے لئے نواز شریف نے قوم سے خطاب بھی کیا اور دھرنا کمیشن بنانے کا اعلان بھی کیا لیکن عمران خان جو چار حلقوں کا الٹی میٹم دے چکے تھے کھولنے کا۔ اس پر نواز شریف نے یہ کہا کہ 35 حلقوں کے ووٹوں کی دوبارہ گنتی کرانے کے لئے تیار ہیں۔ ان دو ریلیوں نے جو 14 اگست کو نکلیں اور جس نے نواز شریف کے الیکشن کا سارا تیا پانچا کر دیا۔ عمران خان ایک بہت بڑے جلوس کی صورت میں نکلے لیکن طاہر القادری کی طرف نہیں گئے۔ اس طرح طاہر القادری اور عمران خان کے درمیان پہلے دن ہی 14 اگست کو فاصلے پڑ چکے تھے۔ طاہر القادری ہر قیمت پر چاہتے تھے کہ عمران خان ادھر سے آئیں اور ان کے لوگوں کو ساتھ لے کر جائیں لیکن عمران خان اپنی تحریک کو طاہر القادری سے الگ تھلگ رکھنا چاہتے تھے وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس انقلابی ریلی کا اور آزادی تحریک کا آپس میں کوئی ایک نظریہ نظر آئے۔ حالانکہ

تحریک انصاف کی ٹیم کی شاہ محمود قریشی اور جہانگیر ترین کی قیادت میں متعدد مرتبہ طاہر القادری سے ملاقات بھی ہوئی تھی لیکن عمران خان نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ طاہر القادری صاحب سے الگ اپنی ریلی لے کر جائیں گے۔ میں نے ایک ٹرین مارچ کی کال دی اور بہت زبردست تیاری کی۔ سارے پاکستان میں، میں پھر رہا تھا کہ ہم نے عوامی ایکسپریس سے کراچی کی طرف مارچ کرنا تھا جب میں نے دیکھا کہ ٹرین کا بہت ہی زبردست رسپانس ہے اور عوام کی گجرات، گوجرانوالہ اور لاہور میں بڑی شرکت متوقع تھی۔ میں جب گجرات گیا تو چودھری شجاعت اور پرویز الٰہی نے کہا کہ وہ خود ٹرین کا گجرات میں استقبال کریں گے لیکن جب 17 جون کو سانحہ ماڈل ٹاؤن کا واقعہ ہوا تو مجھے یہ سمجھ آ گئی کہ ہماری ٹرین پر حملہ کیا جائے گا اور راولپنڈی سٹیشن پر حملہ ہوگا۔ مجھے مختلف جگہوں سے ایسی اطلاعات ملیں کہ راولپنڈی ریلوے سٹیشن پر جہاں ہم نے بہت بڑا اجتماع کرنا تھا حملہ ہوگا۔ میں نے تنہا یہ فیصلہ کیا اور 18 جون کو عوامی ایکسپریس کے ٹرین مارچ کی کال واپس لے لی۔ میں نے اسمبلی کے باہر جو صحافی باہر بیٹھے ہوتے ہیں جب وہاں جا کر بیان دیا تو ہر آدمی نے میری اس کال کو واپس لینے پر مفاہمت اور بزدلی کا فیصلہ قرار دے دیا لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ عمران خان اور طاہر القادری جب نکلیں گے تو اس سے پہلے جس طرح 17 جون کو عوامی تحریک پر آپریشن میں خواتین اور دوسرے کئی لوگوں کو شہید کر دیا گیا اگر چند لاشیں راولپنڈی ریلوے سٹیشن پر بھی گر گئیں تو پھر یہ حکومت کیلئے بڑی آسانی ہوگی۔ مجھے اندر سے بھی اطلاعات تھیں لیکن اطلاعات یہ تھیں کہ تیاری کی جاری ہے کہ یہ ٹرین مارچ پر حملہ کریں گے اور اس کے لئے پورے پنجاب سے بھی پولیس کو اکٹھا کیا جا رہا تھا لیکن 18 جون کو میں نے ان کی ساری سوچوں پر اپنے سیاسی فیصلے سے پانی پھیر دیا اور جن لوگوں نے ٹکٹیں، جب واپس کیں تو حکومت یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ سینکڑوں لوگوں نے ٹکٹیں واپس کیں جو اس ٹرین سے جانا چاہتے تھے۔ خاص طور پر پشاور اور ہری پور سے بہت بڑی تعداد میں لوگ اس ٹرین میں شریک ہو رہے تھے جو میں نے 18 جون کو کینسل کردی۔ 14 اگست کو جب ہم لاہور اسمبلی ہال سے عمران خان کے ساتھ نکلے تو عوام کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا کنٹینر پر سلیکٹڈ لوگوں کو جانے کی اجازت ملی ہوئی تھی جس میں، میں بھی شامل تھا۔ میں اس سفر میں لاہور سے شامل ہوا اور 14 اگست کو میں اپنے ساتھیوں سمیت اس کاروان میں شامل ہوگیا اس کاروان کا جگہ جگہ استقبال کیا گیا اسی طرح طاہر القادری صاحب بھی ایک بہت بڑے ہجوم کے ساتھ اس انقلابی مارچ میں شامل ہوئے۔ طاہر القادری صاحب کی ٹرانسپورٹ کا نظام تحریک انصاف کے ٹرانسپورٹ کے نظام سے بہتر تھا۔ ان میں بہت بڑی تعداد بسوں کی تھی وہی بسیں چل رہی تھیں جو ان کے عقیدت مند مختلف علاقوں سے لوگ لے کر آئے تھے جبکہ تحریک انصاف کے لوگ اپنی پرائیویٹ کاروں پر چل رہے تھے لیکن کرائے کی گاڑیاں بسیں کم تھیں اس لئے ساتھ ساتھ پیدل چلنے والے لوگوں کا جلوس ہر جگہ سے گزر رہا تھا۔ ایک بڑا معرکہ تب ہوا جب اس جلوس پر گوجرانوالہ میں حملہ ہوا یہ ایک

ایسا حملہ تھا جس میں غنڈہ گردی کی انتہا کی گئی اور کوئی کور تیج کرنے والا نہیں تھا۔ میرے اندازے کے مطابق عمران خان نے اس کنٹینر کے اندر سے چودھری نثار کو ٹیکسٹ بھی کیا۔ یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ بہت سارے لوگوں نے کنٹینر میں لیٹ کر اپنی جانیں بچائیں لیکن میں حسب معمول بڑی جرأت اور بہادری سے اس کنٹینر پر حملے میں ڈٹ کر کھڑا رہا۔ یہ گوجرانوالہ میں جو حملہ تھا گوجرانوالہ کی تاریخ میں بہت سارے واقعات ہوں گے لیکن یہ اپنی نوعیت کا واحد واقعہ تھا جس میں پولیس سپورٹ کر رہی تھی اور غنڈے دندناتے پھر رہے تھے۔ لاٹھیوں سے اور ڈنڈوں سے کنٹینر پر حملے کر رہے تھے۔ میں نے گولی کی آواز بھی سنی جو غالباً پولیس کی چلائی گئی تھی۔ جس کا عمران خان نے اپنی تقریر میں بھی مختلف بار حوالہ دیا۔ سو 14 اگست کی ریلی کا پہلا مقابلہ گوجرانوالہ میں ہوا لیکن ریلی کا راستہ نہیں روکا جاسکا اور ریلی چلتی چلی گئی۔

آزادی مارچ اور دھرنا

14 اگست کو جب لاہور سے نکلے تو گوجرانوالہ میں آزادی مارچ پر حملے کے علاوہ کسی جگہ کوئی بڑا واقعہ پیش نہیں آیا۔ ہم تقریباً 30 سے 50 گھنٹوں کے درمیان اسلام آباد پہنچ گئے اور اسلام آباد پہنچتے وقت جہاں پر ہم نے پہنچنا تھا وہاں پہنچنے کے بعد فیصلہ عمران خان نے اپنے دل سے لگا رکھا تھا۔ وہاں پہنچنے کے بعد ایک دم فیصلہ کیا کہ ڈی چوک کی طرف آزادی مارچ روانہ کیا جائے اور جب ڈی چوک کی طرف روانہ ہوئے تو پھر عوام کا جذبہ دیکھنے والا تھا۔ تمام لوگ جوش سے بھرپور تھے اور کرینوں سے راستے میں کھڑے کئے گئے کنٹینروں کو ہٹا دیا گیا اور عوام کا سمندر ڈی چوک کی طرف روانہ ہوگیا۔ ڈی چوک پر پہنچ کر ایسے لگ رہا تھا کہ فتح کا عالم ہے اور طاہر القادری صاحب بھی ساتھ ساتھ ہی تھے۔ انہوں نے ڈی چوک کا دوسرا کونا سنبھال لیا ہم کنٹینروں پر کھڑے ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے لیکن ٹائم ٹیبل سیٹ کیا گیا تھا کہ جب عمران خان نے خطاب کرنا ہے تو طاہر القادری خطاب نہیں کریں گے اور جب طاہر القادری خطاب کریں گے تو عمران خان خطاب نہیں کریں گے لیکن یہ نہیں ہو رہا تھا کہ عمران خان کے لوگ طاہر القادری کو سننے جا رہے ہیں اور طاہر القادری کے لوگ عمران خان کو سننے آ رہے ہوں۔ یہ بات میرے لئے بڑی تکلیف دہ تھی کہ اگر یہ مجمع اکٹھا ہوجاتا تو اور بہت زیادہ اثر ڈال سکتا تھا لیکن عمران خان اپنی تحریک کو طاہر القادری سے الگ رکھنا چاہتے تھے۔ اسی دوران تحریک انصاف کے 34 ارکان اسمبلی سپیکر کو استعفے جمع کرا کے اسمبلی میں زلزلہ لے آئے۔ ایک دو ممبران کے علاوہ سب تحریک انصاف کے ممبران نے استعفے دے دیئے۔ میں نے عمران خان سے پوچھا کہ اگر آپ کہیں تو میں استعفیٰ دے دوں یا میں اسمبلی میں ہی رہوں۔ انہوں نے کہا کہ آپ آزاد ہیں بہتر ہے کہ آپ اسمبلی میں رہیں تاکہ کوئی ہماری بات اسمبلی میں بھی اٹھانے والا ہو۔ اس طرح میں دن کو اسمبلی میں ہوتا اور رات کو کنٹینر پر ہوتا۔ 126 دن میں نے کنٹینر پر اپنی سیاست کی اور شام کو میں گھر واپس آ جاتا تھا

اس میں' میں وہ وقت نہیں بھولا جب طاہر القادری نے کفن پہن کر آگے بڑھنے کا اعلان کیا۔ ہر روز پاکستان کی تاریخ میں عمران خان تقریر کرتے تھے۔ اس کے بعد میں بھی لازمی تقریر کرتا تھا۔ یہ عجیب صورتحال تھی' نواز شریف کے دور میں ہمیشہ میں پہلے تقریر کرتا تھا اور نواز شریف بعد میں تقریر کیا کرتے تھے لیکن یہاں اُلٹا مسئلہ تھا کیونکہ ایک ٹی وی کے لوگوں سے ٹائم سیٹ تھا جتنی میڈیا کوریج ہمیں کنٹینر پر ملی اور خاص طور پر عمران خان کو کنٹینر پر ملی اس کا کوئی اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن جیو کے خلاف ایک لڑائی تھی جو جاری تھی اور یہ لڑائی بڑھتی جارہی تھی۔ اسی دوران یہ دوسرا تیسرا واقعہ تھا کہ آصف علی زرداری صاحب نے بھی مجھے فون کیا اور مذاکرات شروع ہوچکے تھے۔ حکومت اور عمران خان کی جماعت کے درمیان مذاکرات جاری تھے جب یہ فیصلہ کیا گیا ڈی چوک کی طرف جانے کا تو اس میں جاوید ہاشمی کے چہرے کے تاثرات عجیب قسم کے تھے اور عمران خان بھی اس کا نوٹس لے رہے تھے۔ اس دھرنے کے دوران تھوڑے دنوں کے لئے جب جاوید ہاشمی صاحب خفا ہوکر ملتان چلے گئے اور تحریک انصاف کے ایک بڑے لیڈران کو منانے گئے تو عمران خان کو یہ بات پسند نہیں تھی کہ تحریک انصاف کے لیڈران کو منانے کیلئے کیوں گئے ہیں۔ جب ہم نے فیصلہ کیا کہ شام کو ہم نے قومی اسمبلی اور ٹی وی کی طرف چڑھائی کرنی ہے اور طاہر القادری صاحب اور عمران خان کا ایک متفقہ پڑاؤ ختم ہوگیا۔ ہم جب روانہ ہوئے تو پولیس نے بہت ہی خوفناک قسم کا حملہ کیا اور بہت شدید لاٹھی چارج کیا' گولیاں چلیں اور پھر اس میں کچھ لوگ شہید ہوئے لیکن راستہ نہ روکا جاسکا جس کی بے چینی کا ڈر تھا لیکن اس وقت جو دیکھنے میں آیا کہ جب ہم قومی اسمبلی اور ٹی وی کی طرف جارہے تھے تو اس وقت جاوید ہاشمی صاحب نے عمران خان کو روکنے کی کوشش کی اور بہت سمجھایا لیکن عمران خان بضد تھے کہ انہوں نے جانا ہے۔ اس پر جاوید ہاشمی صاحب خفا ہوکر کنٹینر سے اُتر گئے۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس کے بعد کنٹینر پر نہیں آئے جب عمران خان سول نافرمانی کی بات کرتے تھے تو میں نے ان سے گزارش کی کہ آپ کم از کم سول نافرمانی کی بات نہ کریں۔ اگر کل ہماری حکومت آتی ہے تو لوگ ہمیں طعنے دیں گے اور خاص طور پر آپ جملوں میں ایسے الفاظ استعمال کر جاتے ہیں جس کی کل آپ کو قیمت چکانا پڑے گی۔ جب انہوں نے پوچھا کہ کون سا جملہ میں نے کہا ہے؟ تو میں نے کہا کہ آپ نے انگلی کا اشارہ کیا ہے۔ اس پر وہ ہنس پڑے۔

میں نے اندازہ لگایا کہ عمران خان کو اس سے کوئی فکر نہیں کہ انہیں کوئی کیا مشورہ دیتا ہے یا لوگ کیا کہتے ہیں؟ عمران خان اس بات کے لئے ذہنی طور پر تیار تھے کہ نواز شریف کی حکومت کو ہر صورت ختم کیا جائے۔ ان کی اسمبلی کے استعفے ہوں تو وہ مہم چلائیں۔ سابق فوجیوں کی تنظیم نے بھی نئے انتخابات کا مطالبہ کردیا۔ بالآخر الطاف حسین نے بھی نئی اسمبلی کے بنانے کا فیصلہ کیا اس عرصے میں اگست کے آخری دنوں میں راحیل شریف اور طاہر القادری کی بڑی تفصیلی ملاقات ہوئی اور وہ فوٹو چھپی

جس میں جہانگیر ترین گاڑی چلا رہے تھے اور عمران خان فرنٹ سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے کی خوشی کا اظہار بتا رہا تھا کہ تحریک اپنی کامیابی سے ہمکنار ہونے جا رہی ہے لیکن عمران خان کی تحریک کا اور طاہر القادری کی تحریک کا اب حل ڈھونڈا جا رہا تھا کہ کس طرح عدلیہ کے ذریعے اس کا فیصلہ کیا جائے اور راحیل شریف کی طرف سے یہ رائے آئی کہ عدلیہ کے ججوں کی ایک کمیٹی بنائی جائے جو اس مسئلے کو دیکھے اور اس مسئلے کا حل نکالے۔ اسی عرصے میں آرمی کی مداخلت اور سیاستدانوں کے عمل دخل کے بارے میں جاوید ہاشمی کا ایک بیان سامنے آیا جو ان کی راہ الگ متعین کر چکا تھا۔ نواز شریف نے کہا کہ ہم نے فوج کو ثالث نہیں بنایا لیکن چودھری نثار نے کہا کیونکہ عمران خان کسی ادارے کی بات ماننے کیلئے تیار نہیں تھے اس لئے ہم نے فوج سے ثالثی کی اپیل کی ہے۔ اس طرح ایک دن میں دو لیڈروں کے دو مختلف بیان تھے۔ میں حسب معمول جلسے کے ٹائم پر اپنے کنٹینر پر پہنچ جاتا تھا اور جب عمران خان نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ کنٹینر پر ہی رات کو سویا کریں گے' اس وقت' اسی عالم میں انہوں نے شادی کی بھی بات کر دی۔ عمران خان ایک ایسے سیاست دان میں نے پائے ہیں جو اپنا فیصلہ جب کر لیتے ہیں تو پھر وہ یہ نہیں دیکھتے کہ اس کے اثرات کیا ہونگے۔ انہوں نے ایک ٹپ دی اور اس ٹپ پر لوگوں نے کافی ساری باتیں کرنا شروع کر دیں لیکن عمران خان بالآخر وہی کرتے ہیں جسے وہ درست سمجھتے ہیں۔ کنٹینر سارے پاکستان کیلئے ایک سیاست کا منبع بن چکا تھا۔ اس دور میں چائنیز صدر پاکستان تشریف لا رہے تھے۔ عمران خان کی طرف سے چینی سفیر کو یہ پیغام گیا کہ ہماری طرف سے کوئی مسئلہ نہیں ہے ہم اس دن راستہ صاف کر دیں گے۔ چینی صدر آسکتے ہیں اور پھر چینی سفیر نے شکریہ بھی ادا کیا اور عمران خان کو پیغام پہنچایا کہ ہم آپ کے شکر گزار ہیں لیکن ممکن ہے کہ ہم دورے کا التواء کر دیں اور ہم اس کو آگے لے جائیں اور اس دھرنے کی وجہ سے چین کے صدر کا دورہ بھی التواء کا شکار ہوا۔ ابھی یہ دھرنا جاری تھا اور رات دیکھنے والی ہوتی تھی۔ پشاور کے تندور اور خیمے لگ چکے تھے۔ ایک پوری بستی آباد ہو چکی تھی۔ ڈی چوک رات کو ایک شہر کا نقشہ پیش کرتا تھا۔ کبھی لوگ کم ہوتے تھے اور کبھی لوگوں کا جم غفیر ہوتا تھا۔ پھر عمران خان کی جماعت نے پلاننگ کے تحت مختلف دنوں میں مختلف شہروں کو ٹاسک دیئے کہ وہ لوگوں کو لے کر آئیں اس طرح طاہر القادری کا مجمع تو ایک سلیکٹڈ لوگ تھے اور وہ شام کو وہاں پہنچ جاتے تھے اور پھر اپنی جگہ سے ہلتے نہیں تھے لیکن عمران خان کی پارٹی نے شام کو مختلف ڈسٹرکٹ کی ڈیوٹی لگا دی۔ اس طرح مختلف ڈسٹرکٹ مختلف وقت میں دھرنے میں آتے تھے اور جلسے کی رونق کو دوبالا کرتے تھے۔

طاہر القادری کا جارحانہ انداز

عمران خان کے دل میں تھا یا نہیں تھا اس کا مجھے معلوم نہیں لیکن طاہر القادری پہلے دن سے ہی چڑھائی کرنے کے موڈ میں تھے۔ اگست کے آخری دنوں میں' میں کنٹینر پر ہی تھا اور عمران خان نے ریڈ

سیّارہ ڈائجسٹ کے عظیم الشان اسلامی نمبرز

240 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور۔ فون نمبر: 042-37245412 پوسٹ کوڈ نمبر۔ 54000
Email:sayyaradigest@gmail.com

نمبر	تفصیل
طبِ نبویؐ نمبر	1 جلد۔ قیمت =/200 روپے جسمانی اور روحانی امراض کا نبوی طریق علاج
قرآنی وظائف نمبر	1 جلد۔ قیمت =/200 روپے ہر گھر کی پریشانیوں اور الجھنوں کے حل کیلئے وظائف۔
اسلامی معلومات نمبر	1 جلد۔ قیمت =/200 روپے دین کی جامع معلومات، طالب علموں کیلئے خصوصی تحفہ!
انبیاء کرام نمبر	1 جلد۔ قیمت =/200 روپے پیغمبران خدا کی حیات کے روح پرور تذکرے
فرمانِ الٰہی نمبر	1 جلد۔ قیمت =/200 روپے اللہ کے احکامات و قرآنی فرمودات پر مشتمل ایمان افروز پیشکش
صحابہ کرامؓ نمبر	1 جلد۔ قیمت =/200 روپے عظیم ہستیوں کی کہانی جنہوں نے حضورؐ کی معیت میں زندگی بسر کی
صدقات، خیرات نمبر	1 جلد۔ قیمت =/200 روپے صدقہ ہر بلا ٹال دیتا ہے، اسکی اہمیت و تحقیق بارے مکمل معلومات!
اخلاق رسول نمبر	1 جلد۔ قیمت =/200 روپے حضورؐ کی پاکیزہ زندگی کے پاکیزہ واقعات پر مشتمل دستاویز
جادو، خواتین اور اسلام	1 جلد۔ قیمت =/200 روپے جادو کی حقیقت اور علاج، قرآن و احادیث کی روشنی میں!
فہم دین نمبر	1 جلد۔ قیمت =/200 روپے سماجی زندگی اور عبادات کے بنیادی مسائل کا حل
عبادات رمضان نمبر	1 جلد۔ قیمت =/200 روپے رمضان کی عبادات جو برگزیدہ ہستیوں کا معمول ٹھہریں!
ازواج مطہراتؓ نمبر	1 جلد۔ قیمت =/250 روپے امہات المومنین کی پاک زندگی کے واقعات
قرآن نمبر	3 جلد۔ قیمت =/600 روپے ایمان افروز، عقل پرور اور عمل آفرین پیشکش
اولیاء کرام نمبر	4 جلد۔ قیمت =/800 روپے اللہ کے برگزیدہ بندوں کی ایمان افروز داستانیں
رسولؐ نمبر	(دو جلدوں میں۔ قیمت: 400 روپے) سیرت پاک پر ایک جامع دستاویز
حقوق العباد نمبر	1 جلد۔ قیمت =/200 روپے دوسرے انسانوں کے حقوق اور فرائض بارے نادر و نایاب معلومات
دعا نمبر	1 جلد۔ قیمت =/200 روپے دعا تقدیر بدل دیتی ہے۔ حدیث رسولؐ!
حج، عمرہ اور زیارات نمبر	1 جلد۔ قیمت =/200 روپے حج اور عمرہ کی سعادت حاصل کرنیوالوں کیلئے رہنما گائیڈ
عکس سیرت نمبر	1 جلد۔ قیمت =/400 روپے حضرت محمد مصطفیٰؐ کی حیات طیبہ پر مبنی نایاب کتاب!
توبہ نمبر	1 جلد۔ قیمت =/200 روپے اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کے آداب اور اسکی اہمیت
خلفائے راشدینؓ نمبر	1 جلد۔ قیمت =/200 روپے خلفائے راشدینؓ کی بے مثال قربانیوں کا ذکر!
صحابیاتؓ نمبر	1 جلد۔ قیمت =/200 روپے محترم خواتین جنھیں آنحضورؐ سے سیکھنے کا شرف حاصل ہوا
فرمان رسولؐ نمبر	1 جلد۔ قیمت =/200 روپے عاشقان رسولؐ کی خدمت میں ایک بے مثال تحفہ!
اسلامی حکایات نمبر	1 جلد۔ قیمت =/200 روپے قوت ایمانی سے سرشار سبق آموز تحیر خیز حکایات کا مجموعہ
معجزات رسولؐ نمبر	1 جلد۔ قیمت =/200 روپے سرور کونینؐ کے سینکڑوں معجزات پر مشتمل دستاویز!
والدین نمبر	1 جلد۔ قیمت =/200 روپے ماں باپ کی تعظیم و فرمانبرداری اُجاگر کرنے کی منفرد کاوش
نقوش اسلام	1 جلد۔ قیمت =/200 روپے اسلام کی روشن تاریخ سے ایمان افروز واقعات!
آثارِ قیامت نمبر	1 جلد۔ قیمت =/200 روپے آیات قرآنی و احادیث کی روشنی میں قیامت کی نشانیوں بارے معلومات
قصص القرآن نمبر	1 جلد۔ قیمت =/200 روپے واقعات جو اللہ تعالیٰ نے بتانا ضروری سمجھے۔
شرعی احکام نمبر	1 جلد۔ قیمت =/200 روپے مومن زندگی کیسے گزارے شرعی تعلیمات پر مشتمل جامع رہنمائی

زون جانے کا اعلان کردیا۔ ریڈ زون جانے کے بعد عوام پی ٹی آئی کی طرف روانہ ہوگئی جو کہ قریب ہی تھا۔ بہت زبردستی لاٹھی چار اور فائرنگ اور آنسو گیس کا استعمال شروع ہوگیا۔ جب یہ لاٹھی چارج ہوا تو عمران خان نے لوگوں کو کہا کہ وہ اب جاسکتے ہیں۔ اب صبح کا وقت ہونے والا تھا' میں باہر نکلا تو میں دیکھ کر حیران ہوگیا کہ عمران خان کا بھانجا بڑی بہادری سے پولیس کے ساتھ لڑ رہا تھا۔ اتنے میں کوئی پتھر یا کوئی چیز مجھے لگی لیکن وہ اتنی شدت کا نہیں تھا۔ وہاں کوئی ٹرانسپورٹ نہیں تھی پھر ایمبولینس گاڑی میں ہمیں جو پی ٹی آئی کے لوگ تھے اور اس میں دوسرے لیڈر بھی تھے ہمیں اس میں بٹھا دیا گیا۔ جب میں ایمبولینس میں بیٹھ کر اسلام آباد ریڈ زون سے نکل رہا تھا تو میں نے رات کو گھر جانے کے بجائے ہوٹل میں سٹے کرنے کا فیصلہ کیا۔

جب میں ہالیڈے ہوٹل میں گیا تو وہاں تقریباً سارے کمرے خالی تھے۔ میرے ساتھ پی ٹی آئی کے اور بھی لوگ تھے اس طرح میں کچھ دیر کیلئے ہوٹل میں رُکا لیکن جب میں نے اخبار پڑھا تو اس سے پتہ چلا کہ بغاوت کے مقدمے عمران خان' شاہ محمود قریشی اور مجھ پر قائم ہوچکے تھے حالانکہ میں ٹی وی سٹیشن کی طرف نہیں گیا لیکن جن لیڈروں پر بغاوت کے مقدمے درج کئے گئے ان میں' میں بھی شامل تھا۔ اور جاوید ہاشمی وہ اسمبلی چلے گئے حالانکہ انہوں نے استعفیٰ دیا ہوا تھا۔ میرا خیال ہے انہوں نے اسمبلی میں جیسا کہ مجھے یاد پڑتا ہے مستعفی ہونے کا بھی اعلان کردیا تھا۔ نواز شریف سے بھی ملاقات کی' جاوید ہاشمی صاحب نے ایک زوردار پریس کانفرنس کی اور سارا الزام مجھ پر لگا دیا اور یہ کہا کہ شیخ رشید نے آ کے عمران خان کو پیغام پہنچایا اور شیخ رشید کے کہنے پر عمران خان نے ریڈ زون میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا حالانکہ پوری تحریک انصاف بقول جاوید ہاشمی کے ریڈ زون کراس کرنے کے مخالف تھی۔ ٹھیک ہے کہ کچھ لوگ ریڈ زون کراس کرنے کے مخالف تھے لیکن عمران خان نے مجھ سے کوئی رائے نہیں لی اور اس نے ایک دم بغیر مشورے کے اعلان کردیا کہ ریڈ زون میں داخل ہونا ہے۔ ریڈ زون میں داخل ہونا تھا کہ جنگ شروع ہوگئی۔ جنگ کا طبل بج گیا اور بہت زبردست قسم کی لڑائی ہوئی اور طاہر القادری کے لوگوں نے عمران خان کے کنٹینر کی حفاظت کی اور پی ٹی آئی کے بہت سارے لوگ جو ریڈ زون جانے کے مخالف نہیں تھے لیکن جب بہت شدید فائرنگ شروع ہوگئی اور دو تین کارکن شہید ہوگئے تو پھر میں نے یہ دیکھا کہ طاہر القادری کے لوگوں نے عمران خان کے کنٹینر کی حفاظت کی ذمہ داری سنبھال لی۔ ان کے پاس غلیلیں بھی تھیں اور لاٹھیاں بھی تھیں۔ وہ بڑی دلیری سے پولیس کا مقابلہ کررہے تھے یہاں اس عالم میں اگر میں ذکر نہ کروں تو زیادتی ہوتی کہ عمران خان کا بھانجا حسان نیازی بھی بڑی جرأت کے ساتھ پولیس سے لڑ رہا تھا اور اس کے بعد سب زخمی لوگوں کو ایمبولینس میں لے جایا گیا اور ہسپتال پہنچا دیا گیا۔



نوشابہ اختر

جڑاؤ کنگن

ایک صبح ماں جی آہستہ آہستہ چائے پی رہی تھیں۔ کپ اُجالا کے ہاتھ میں تھا انہوں نے دھیرے سے کپ ہٹایا' اُجالا کا ہاتھ پکڑا مسکراتے ہوئے اسکا ہاتھ چوما' اپنے بازو سے کنگن اُتارا اور اُجالا کو پہنا دیا۔ دوسرا کنگن بھی اُتارا اور پاس کھڑی منیبہ کو دے دیا۔ یہ سب چند لمحوں میں ہوا' اُجالا انکے ہاتھ روکتی رہ گئی۔

ایک گھرانے کی کہانی جس نے اللہ کی رحمت کو پہچان لیا تھا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

ترجمہ: اپنے رب کی طرف بلاؤ۔ اور پھر فرمایا اللہ تعالیٰ نے: اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور موعظہ حسنہ کے ذریعے سے بلاؤ۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا...... اور نیکی اور تقویٰ کے کاموں پر ایک دوسرے سے تعاون کرو۔

اور پھر فرمایا: رب ذوالجلال والاکرام نے تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہئے جو لوگوں کو خیر کی طرف بلائے۔

حضرت ابو مسعود عقبہ بن عمر انصاری رضی اللہ

عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جس نے کسی بھلائی پر رہنمائی کی تو اس کے لئے اس کے کرنے والے کے برابر اجر ہے۔ (مسلم)

دراصل اپنے عمل یا قول سے دوسروں کو نیکی یا برائی کی ترغیب دینا اس کا سبب یا ذریعہ بننا عنداللہ ماجور یا ماخوذ ہوگا۔ یعنی اللہ کے ہاں اسے نیکی پھیلانے پر اجر ملے گا اور برائی پھیلانے پر وہ سزا کا مستحق ہوگا۔ بلکہ نیکی کی ترغیب پر کئی گنا زیادہ اجر و ثواب کا مستحق ہوگا اور برائی کی ترغیب پر متعدد لوگوں کے گناہوں کا بھی ذمہ دار ہوگا۔ اسی لئے زیادہ سزا کا مستحق ہوگا۔ سورۃ العصر میں اللہ تعالیٰ نے نیکی اور تقویٰ کے کاموں پر ایک دوسرے سے تعاون کا حکم دیا ہے اور فرمایا: قسم ہے زمانے کی یقیناً انسان خسارے میں ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور انہوں نے عمل صالح کئے اور ایک دوسرے کو حق کی وصیت کی اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں: بلاشبہ سب لوگ یا ان میں سے اکثر اس صورت میں غور و فکر اور تدبر کرنے میں غفلت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سب مومنین کو بھائی بھائی کہا ہے اور حضرت نوحؑ کا قول ہے، میں تمہاری خیر خواہی کرتا ہوں اور عام مسلمانوں کی خیر خواہی یہ ہے کہ ان کی دنیا و آخرت کی اصلاح کے لئے ان کی صحیح رہنمائی کی جائے انہیں نیکی کا حکم دیا جائے اور برائی سے روکا جائے۔

جس تکلیف دہ امر سے میں گزری اور جس کی برداشت کا حوصلہ میرے رب نے مجھے دیا یہ اسی کی شان کریمی ہے۔ موت کے پردوں کو چھوتے چھوتے رب نے میرے ہاتھوں میں زندگی کی تسبیح پھر پکڑا دی اور اس کی بلاوے کی صدا پر لبیک کہتے کہتے میں دنیا کی طرف لوٹ آئی۔ یہ واپسی اللہ کرے کسی بہت ہی نیک مقصد کے لئے ہو کیونکہ بندہ تو خطا کا پتلا ہے اور دانستہ اور نادانستہ غلطیاں کرتا چلا جاتا ہے۔ ایک ہی کمرے میں بند میرے شب و روز بچوں کی اور ان کے بچوں کی محبتوں کے سائے میں گزر رہے تھے کہ میرے فون کی آواز نے مجھے خیالوں کے بھنور سے باہر نکال دیا۔

’’یقیناً آپ نوشابہ باجی بول رہی ہیں۔ مختصر الفاظ میں اپنی کہانی آپ کے گوش گزار کر رہا ہوں۔ یہ عبرت آموز کہانی شاید آپ کے قلم سے نکلنے کے بعد بہت سے لوگوں کی فلاح کا باعث بن سکے۔ یہ داستان سراسر حقیقت پر مبنی ہے جب آپ کہیں گی میں اور اُجالا آپ کے پاس آجائیں گے۔‘‘

اس کے بعد ایک طویل کہانی میرے گوش گزار کی گئی جس میں بہت سی آمیزش آنسوؤں کی نمی کی بھی تھی۔ اُجالا اور اس کے میاں راحیل کی زبانی سنئے۔

☆☆☆☆☆☆☆

وقت نے بہت جلد میرے سر سے والدین کا سایہ اُٹھا لیا۔ اب گھر میں ہم پانچ کے بجائے تین افراد تھے۔ میں، اُجالا اور میرا بھائی جو ابھی پڑھائی کے تکمیلی مراحل ادا کر رہا تھا۔

انہی دنوں آپ کی کتاب صحرا میں دیوار پڑھنے کو ملی۔ جب میں نے ایک کہانی مبنی بر سچ پڑھی اور ایک دیور کو اپنی ماں جیسی بھابی سے زیادتی کرتے پڑھا تو سخت پریشان ہوا کیونکہ بزنس کے سلسلے میں کبھی کبھار مجھے شہر سے باہر رات گزارنا پڑتی تھی

بہت سوچ و بچار کے بعد میں نے اُجالا کو ہی سمجھایا کہ اسے کس طرح کوشش کرکے خود کو بھی سنبھالنا ہے اور ایمان کو بھی سیدھی راہ پر چلنے کی تلقین کرتے رہنا ہے۔ دراصل شادی کو چھ سال گزرنے کے باوجود اور بہت علاج کروانے کے باوجود ہم ابھی تک اولاد جیسی عظیم نعمت سے محروم تھے۔ اور اللہ سے اس انعام کی دعا کرتے رہتے تھے۔

اندرون شہر سے نکل کر ڈیفنس میں گھر بنانا اُجالا کا خواب تھا اور جب ہم نے وہ گھر فروخت کیا تو اچھی قیمت مل گئی اور اُجالا کو خوابوں کی تعبیر بھی۔ ہم نے سادہ آرام دہ گھر بنایا اور اللہ توکل اس میں شفٹ بھی ہوگئے۔ اردگرد کے لوگ اچھے مخلص اور مہمان نواز تھے اس لئے جلد ہی دل لگ گیا۔ نوراں بی بی ہمارے ہاں ایک عرصے سے کام کرتی تھی وہ بھی شوق سے اپنے دو بچوں کے ساتھ ہمارے ساتھ ہی چلی آئی۔ اس کا خاوند مالی کا کام کرتا تھا۔ نہ صرف ہمارا مسئلہ حل ہوگیا بلکہ اس نے اردگرد کی کچھ کوٹھیوں کا کام بھی سنبھال لیا اور اس کی اچھی خاصی آمدنی ہوگئی۔

میری عادت تھی کہ فجر کی نماز کے بعد ایمان کے ساتھ لمبی واک پر نکل جاتا۔ ہم دونوں بھائی مختلف تسبیحات پڑھتے۔ تقریباً ایک گھنٹے کی واک کے بعد گھر لوٹتے' چائے پی کر تھوڑی دیر آرام کے بعد تیاری کی طرف رجوع کرتے۔ اتنی دیر میں اُجالا نوراں کی مدد سے ناشتہ تیار کردیتی۔

وہ دسمبر کی ایک کہر اور دھند میں لپٹی صبح تھی۔ ہم دونوں بھائی گھر سے تیار ہو کے نزدیک کی مسجد میں جانے کے لئے گھر سے نکلے۔ مالی بابا شفیق نے گیٹ کھولا اور ہم باہر نکل آئے۔ سنسان بیابان سڑک دھند میں چھپی ہوئی تھی۔ انسان تو کجا ابھی تو پرندے بھی گھونسلوں میں دبکے بیٹھے تھے۔ بہرحال مسجد میں ہم نے باجماعت نماز فجر ادا کی۔ قاری صاحب کی تلاوت سورہ رحمان کی آیات تھیں۔ ان کا پرسوز لہجہ اور دل آویز قرات ایک عجب سماں پیدا کررہی تھی۔ دل پر گہرا اثر کرتی آیت بار بار یہی بتا رہی تھی کہ اللہ کا نعمتوں کو جھٹلانا انسان کے بس کی بات نہیں کہ اس کا اپنا سراپا ہی ایسی بڑی نعمت ہے جس کو جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ پھر قاری صاحب کی پراثر دعائیں آنکھوں سے اشک ندامت بہائے لئے جارہی تھیں۔

دعاؤں کی چھاؤں میں ہم نے اپنی واک کا آغاز کیا۔ ایمان میرا چھوٹا بھائی مجھے بہت پیارا ہے۔ چھوٹی چھوٹی نصیحتیں اس کے گوش گزار کرنا میری عادت تھی اور وہ ان پر عمل بھی کرتا تھا۔

ایک لمبی واک کے بعد ہم واپس آئے۔ دھند تقریباً چھٹ چکی تھی لیکن سردی بہت زیادہ تھی اور جی چاہ رہا تھا کہ فوراً اندر جا کے ہیٹر سے جسم کو گرم کرتے ہوئے گرما گرم چائے پی جائے۔

لیکن یہ کیا؟ گیٹ کے ستون کے ساتھ ایک سفید کپڑے میں لپٹی گٹھڑی پڑی تھی۔ ہم دونوں نے چونک کر ادھر دیکھا سڑک پر اب تھوڑی بہت ٹریفک چل پڑی تھی۔ سکول جانے والی اِکا دُکا گاڑیاں سڑک خالی ہونے کی وجہ سے فراٹے بھرتی گزر رہی تھیں۔ ہم دونوں بھائی تیزی سے گیٹ کی طرف بڑھے۔ میں نیچے جھک رہا تھا کہ ایمان نے مجھے روک دیا۔

''بھیا! رُک جائیں' ہمیں یوں اس کے قریب نہیں جانا چاہئے اللہ جانے اس میں کیا ہے۔''

میری نگاہیں اس گٹھڑی پر جمی ہوئی تھیں۔ اس میں جنبش ہوئی اور ایک ہاتھ باہر نکلا۔ دودھ کی طرح سفید ہاتھ یقیناً کسی بی بی کا تھا لیکن عمر رسیدگی کا غماز۔

''ایمان اس کپڑے میں کوئی عمر رسیدہ خاتون ہے۔ شدید سردی سے انہیں نقصان نہ پہنچ جائے ہمیں فوراً کچھ کرنا ہے۔''

میں نے چادر تھوڑی سی سرکائی۔ ایک عمر رسیدہ خاتون بند آنکھوں کے ساتھ آہستہ آہستہ سانس لے رہی تھیں۔ ماتھے پر ہاتھ رکھا تو شدید بخار کی وجہ سے تپ رہا تھا۔ میں نے فوراً بیل کر کے شفیق کو بلایا اور چارپائی لانے کو کہا اور ہم جلدی سے اس نیک خاتون کو اندر لے آئے۔ اُجالا حیران نگاہوں سے دیکھے جارہی تھی۔ میں نے اس کی اور نوراں کی مدد سے بزرگ خاتون کو بیڈ پر شفٹ کیا۔ اپنے فیملی ڈاکٹر عدنان رضا کو فون کر کے فوراً آنے کی تاکید کی۔ اور ہم سب پریشانی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

بزرگ خاتون کسی کھاتے پیتے گھرانے کی لگ رہی تھیں۔ بریزے کا براؤن کلر کا سوٹ اور اسی رنگ کا لمبا سا سویٹر پہنے وہ ایک خوبصورت شال میں لپٹی ہوئی تھیں۔ ڈائمنڈ کی انگوٹھی اُنگلی میں تھی اور بہت خوبصورت کنگن دونوں کلائیوں میں۔ تعجب اس بات پر تھا کہ وہ خود تو چل کر یہاں نہیں آئی ہوں گی پھر ان کو یہاں چھوڑ کے جانے والا کون سنگدل تھا جس نے دانت کٹکٹاتی سردی میں اس عمر رسیدہ خاتون کو ایک چادر میں لپیٹ کر سڑک پر ڈال دیا۔

ڈاکٹر عدنان رضا آچکے تھے انہوں نے ساری صورتحال کو دیکھا انہیں دو انجکشن لگائے ہمیں کچھ تاکید کی زیادہ سے زیادہ گرم رکھنے کی اور ہوش میں آنے پر کچھ بھی گرم چیز پلانے کی ہدایت کی۔ بخار کی شدت میں کمی کا امکان تھا کیونکہ اس نے انہیں انجکشن لگا دیا تھا۔

باہر نکلتے ہوئے عدنان رضا میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ انہیں میں نے ساری صورتحال بیان کر کے مشورہ طلب کیا تو انہوں نے ایدھی ٹرسٹ والوں سے رجوع کرنے کو کہا۔ جس کو میرا دل نہیں مانا۔ میرا ارادہ تلاش گمشدہ کا اشتہار دینے کا تھا اور اردگرد کی کوٹھیوں سے سن گن لینے کا۔ نہ جانے کیوں میرے دل میں ان کے لئے ایک انسیت ایک لگاؤ کا جذبہ بار بار سر اُٹھا رہا تھا۔ ایسے جیسے مجھے ان سے کوئی نسبت ہو حالانکہ ایمان بھی یہی کہہ رہا تھا کہ آپ ایدھی ٹرسٹ کو ضرور اپنے CONFIDENCE میں لیں لیکن ماں جی کے چہرے پر پھیلی تمکنت اور مسکراہٹ میرے پاؤں کی زنجیر بن رہی تھی۔ شاید ساری مائیں اس عمر میں ایک جیسی عظیم المرتبت ہوجاتی ہیں۔ مجھے اپنی ماں جی بار بار ایک سائے کی طرح ادھر ادھر چلتی نظر آرہی تھیں جنہیں اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے چار سال ہوگئے تھے۔ اور یوں جیسے وہ کہہ رہی تھیں انہیں سنبھال لو انہیں پناہ دو اللہ کے بعد اپنی امان میں لے لو۔

یہ سرگوشیاں جاری تھیں کہ ماں جی نے نرم سی آواز میں پکارا ''بیٹے جانی میرا بیٹا!''

اس صدا نے میرے ہی نہیں اُجالا کی آنکھوں کے گوشے بھی بھگو دیئے۔ ''کس سنگدل نے یہ قدم اُٹھایا ثوبان! یہ سگی اولاد تو نہیں ہوسکتی۔'' لرزتی کانپتی آواز میں اُجالا نے میری طرف دیکھتے ہوئے

کہا تو میں ماں جی پر جھک رہا تھا۔ میں نے ان کا ماتھا چھوا' بخار کم ہو چکا تھا۔ ہم نے انہیں گرم دودھ میں اوولٹین ڈال کر چمچ سے پلایا تو وہ پھر شاید سو گئیں۔

ایمان تو یونیورسٹی چلا گیا لیکن میں نے آفس میں فون کر دیا۔ ان کی ساری ذمہ داری میں تنہا اُجالا پر ڈالنا نہیں چاہ رہا تھا۔ شام تک ان کی طبیعت سنبھل گئی۔ کہیں سے کوئی نہیں آیا۔ میں نے نوراں بی بی کو ساتھ کے گھروں میں بھیجا لیکن سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں مصروف تھے کہیں کوئی کمی بیشی کا امکان نہیں تھا۔ ویسے بھی نوراں کا خاوند چونکہ ان سب گھروں میں کام کرتا تھا اس لئے جانتا تھا کہ ان گھروں میں کوئی بزرگ خاتون نہیں تھی۔

میں نے اخبار میں تلاش گمشدہ کے اشتہار دیئے اور تسلسل سے یہ اشتہار چلتا رہا لیکن کسی نے بھولے سے بھی کچھ نہیں پوچھا اور پھر ہم ماں جی کو اپنی ماں بنا کر مست ہو گئے۔ اُجالا کا تو یہ حال تھا کہ وہ ان کی خدمت کرتے تھکتی ہی نہیں تھی۔

ماں جی صرف دو بول بولتی تھیں ''بیٹے جانی' میرا بیٹا۔'' اس کے علاوہ تیسرا کوئی لفظ زبان پر نہیں آتا تھا۔ ان کے لب ہلتے رہتے گویا کوئی تسبیح کر رہی ہوں۔ کبھی کبھی ان کی آنکھوں کے گوشے نم آلود ہو جاتے تھے۔ نہ کبھی کچھ بولیں نہ مانگا۔ اُجالا جیسے ان کی نگاہوں کے اشارے سمجھتی تھی۔ بس وقت گزر رہا تھا اور جانے کیوں ہم بے حد خوش تھے۔

اور یہ راز بھی ایک روز کھل گیا۔ اُجالا کی طبیعت کچھ روز سے خراب تھی۔ آخر میں اسے اس کی ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ماں جی کو ہمارے ہاں آئے تقریباً آٹھ ماہ گزر چکے تھے۔ چیک اپ کے بعد اور ٹیسٹ کروانے کے بعد ایک بہت بڑی خوشخبری ہمارے گرد رقص کناں تھی۔ اُجالا اُمید سے تھی اور یہ ناقابل یقین خوشخبری شادی کے تقریباً سات سال بعد ملنا' یقیناً یہ ایک معجزہ تھا۔ اور اُجالا اس ساری خوشی کو ماں جی کی آمد کے صلہ کے ڈبے میں ڈال چکی تھی۔ دراصل اس نے انہیں ایک پل کے لئے بھی کوئی اجنبی خاتون نہیں سمجھا تھا۔ جس پیار اور محبت سے وہ اپنی ساس اور سسر کی خدمت کرتی رہی تھی شاید اس سے بھی بڑھ کر اس نے ماں جی کی خدمت کی تھی اور کر رہی تھی۔

طبیعت کے تکدر کے باوجود اُجالا نے ماں جی کو نظر انداز نہیں کیا۔ ''ثوبان یہ سب ماں جی کی برکت سے ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ہمارے پاس اپنی رحمتیں اور برکتیں دے کر بھیجا ہے۔ اب تو اگر انکو ان کے گھر والے لینے بھی آئے تو میں صاف انکار کر دوں گی۔ یہ محترم خاتون ہی میرے بچے کی دادی ماں ہوں گی۔

بعض اوقات میں ڈر بھی جاتا کہ اگر واقعی کوئی ان کو لینے آ گیا تو یہ تو بہت مشکل ہو جائے گی۔ دھیرے دھیرے اُجالا کو سمجھاتا بھی رہتا کہ ماں جی ہمارے پاس امانت ہیں۔

دراصل ان چند مہینوں میں جہاں اللہ نے ہمیں اولاد کی خوشخبری عطا فرمائی وہیں بزنس میں بھی بہت اچھا اُٹھان آیا۔ کچھ عرصہ پہلے جو گھاٹا آ رہا تھا ایکدم منافع میں بدل گیا۔ اس بات پر جہاں ہم اللہ کے سامنے سجدہ شکر بجا لائے وہیں ہمارے دلوں میں ماں جی کی عزت وتکریم میں بھی گوناگوں اضافہ ہوا۔

بہر حال ہمیں اللہ تعالیٰ نے ایک سال کے اندر اندر ایک خوبصورت صحت مند بیٹا بھی عطا فرما دیا۔

بزنس میں بھی اس کے کرم سے اچھا خاصا فائدہ ہونے لگا اور ماں جی بھی خاصی روبصحت ہوگئیں لیکن دو الفاظ کے علاوہ وہ کچھ نہیں بولیں۔ میں نے سپیچ تھراپی بھی کروائی لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا اور حسب معمول اُجالا ان کی رمزیں سمجھ گئی۔ وہ مسکرا مسکرا کے ہم سب کو دیکھتی رہتیں اور اکثر شوق سے ننھے ذیشان کو اپنی گود میں لے لیتیں۔

اور پھر یوں لگنے لگا جیسے وہ ہمیشہ سے ہمارے ساتھ ہیں۔ کئی اشتہاروں کے بعد جو تقریباً چھ ماہ تک اخباروں میں آتے رہے میں نے اشتہار دینا بند کردیئے اور یہی سمجھ لیا کہ یہ ہماری ماں تھیں اور ہمیں ہی ان کا ہر طرح خیال رکھنا ہے۔ وہ بھی ایمان کو بھی اپنے سینے سے لگا کر سر پر پیار کرتیں اور اسے اپنے پاس بٹھا کر مسکراتی رہتیں۔

ذیشان ایک سال کا ہوا تو اللہ نے پھر اُجالا کی گود بھر دی اور پھر ہمارے گھر میں اللہ کی رحمت نے قدم رکھے اور ذیشان کی بہن راحمہ کی شکل میں ہماری گودیوں کی رونق بن گئی۔

وقت ایک خوبصورت مدھرتا کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ ایمان اپنی تعلیم مکمل کرکے میرے ساتھ بزنس میں آگیا اور ہم نے چھ ماہ بعد اپنے خاندان کی ایک لڑکی پسند کرکے اس کی شادی کردی۔ یہ خاندان اچھے نفیس لوگوں کا تھا اور ہماری ان سے بہت عرصہ پہلے کی جان پہچان تھی۔ دراصل رشتے تو رب نے جوڑ رکھے ہیں خود بخود ملا دیتا ہے۔ اور یوں عبداللہ بھائی کی بیٹی منیبہ نور اپنی ڈھیر ساری خوبیوں کے ساتھ ہمارے آنگن کی رونق بن گئی۔ دراصل ڈھیر ساری خوبیوں میں سے اولین خوبی یہی تھی کہ اس نے آتے ہی اُجالا کے ساتھ مل کر گھر کے سارے امور میں دلچسپی لینا شروع کردی اور ماں جی کی خدمت گزاری بھی دل و جان سے کرنے لگی۔

گھر میں اللہ کی رحمت کی برکھا برس رہی تھی چھوٹی سی ہماری فیملی سکون وعافیت کے گہوارے میں جھول رہی تھی۔ ذیشان اور راحمہ کے بعد ہمارے آنگن میں مسکان جیسی کلی کھلی اور پھر اللہ نے ایمان کے آنگن میں عدنان کے معصوم قہقہوں کا حسن بکھیر دیا۔ ماں جی کی ہستی عجیب سحر انگیز تھی۔ کبھی تو مجھے یوں لگتا جیسے وہ کوئی نورانی مخلوق ہیں۔ نہ ان کی کوئی شناخت ہمارے پاس تھی نہ کوئی نام پتہ۔ جس حد تک میں ان کے رشتہ داروں کو تلاش کرسکتا تھا میں کوشش کرچکا تھا۔ پھر اُجالا کی سوچ کے مطابق رب العزت نے شاید ہمیں آزمانا بھی تھا اور نوازنا بھی تھا۔ آزمانا تو اس طرح تھا کہ کیا کوئی انسان ایک نامعلوم ہستی کے لئے دل و جان فرش راہ کرسکتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ راہ بہت اچھی طرح گزارنے کی استطاعت بھی عطا فرمائی اور توفیق بھی اور اس کی ذات عالی صفات کی نوازشات جو اس نامعلوم ہستی کے ہمارے ہاں آنے کے بعد ہم پر ہونے لگیں ان کا کوئی حساب ہی نہیں ہوسکتا۔ پھر ایمان کی دلہن نے جس خوبصورتی سے ماں جی کی خدمت شروع کی باعث فخر و انبساط طریقہ تھا۔ ایک روز بھی اس نے یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ ایک ایسی خاتون جن کا ایمان کی ذات کے ساتھ کوئی تعلق کوئی واسطہ ہی نہیں ہم سب ان کی خدمت کررہے ہیں۔ منیبہ نور کے اس انداز خدمت نے ہم سب کے دل میں اس کی محبت اور زیادہ بڑھا دی۔ افسوس اگر مجھے کبھی ہوا

بھی تو اس اولاد کے لئے ہوا جس نے اتنی پیاری ہستی کو اتنی سخت سردی میں کسی اور کے دروازے پر ڈال دیا۔ اسے کبھی اندازہ بھی نہیں ہوا ہوگا کہ وہ کیسے گوہر نایاب سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔ حضرت شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ ایک گدھ اور چیل کے درمیان بحث چھڑ گئی کہ دونوں میں سے کس کی نگاہ زیادہ تیز ہے۔ دونوں اس بحث کا ماحصل تلاش کرنے کے لئے فضا میں بلندی کی طرف پرواز کر گئے۔ بہت بلندی پر پہنچ کر جب دونوں نے زمین کی طرف دیکھا تو گدھ نے کہا کہ میں زمین پر گندم کا ایک دانہ دیکھ رہا ہوں۔ اب حقیقت حال کو جاننے کے لئے دونوں زمین کی طرف آئے تو چیل کو بھی وہ دانہ نظر آ گیا۔ اس نے کہا کہ واقعی تم جیت گئے لیکن دانے کی وہاں موجودگی بے سبب نہ تھی پرندوں کو پھانسنے کے لئے ایک شکاری جال لگائے بیٹھا تھا۔

گدھ نے جب وہ دانہ اُٹھانا چاہا تو جال میں پھنس گیا۔ چیل نے حیران ہوتے ہوئے گدھ سے پوچھا کہ اتنی بلندی سے تم نے زمین پر پڑا دانہ دیکھ لیا مگر تمہیں یہ جال نظر نہ آیا تعجب ہے۔ گدھ نے افسردگی سے کہا کہ تقدیر کا فیصلہ آنے پر عقل جاتی رہتی ہے اور جب قضا اپنے ترکش کا تیر چلاتی ہے تو تیز نگاہ رکھنے والے بھی نابینا ہوجاتے ہیں۔

حضرت شیخ سعدیؒ اس حکایت میں بیان فرماتے ہیں کہ ہر کام تقدیر کے لکھے کے مطابق انجام پاتا ہے اور اللہ عزوجل نے جو اختیارات انسان کو دیئے ہیں اگر وہ انہیں صحیح طریقے سے استعمال کرے تو اس کے لئے باعث نجات ہوں گے اور ان کا ناجائز استعمال اس کے لئے باعث وبال ہوگا۔ حضرت شیخ سعدیؒ کی یہ حکایت پڑھ کر میں سوچ کی اتھاہ گہرائیوں میں اُتر گئی۔ انسان یعنی بندہ اپنے آپ کو عقل مندی کی اس پٹڑی پر ڈال دیتا ہے جس کی سمت کا تعین اس کے اختیار میں شاید ہی ہوتا ہے لیکن وہ اپنے آپ کو عقل کل سمجھتے ہوئے نادانی کے کئی فیصلے کر دیتا ہے۔

یکم مئی 2019ء کی صبح معمول کے مطابق بیدار ہوئی۔ دعاؤں کا بورڈ لگا کر میں پارک میں آنے والی خواتین کا انتظار کر رہی تھی تاکہ ہم چھٹی کے اس روز صبح کی چند گھڑیاں درس قرآن کی خوبصورت محفل سجا کر گزار سکیں۔ چند روز بعد تو رمضان کا مبارک مہینہ آ رہا تھا اور میں اس کی آمد کو خوش آمدید کہنے کی ساری تیاریاں کر چکی تھی اور آج کی اس محفل کا انعقاد بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ گدھ کی گہری نگاہ دانہ تو دیکھ سکی جال نہ دیکھ سکی کیوں؟ کیونکہ تقدیر دُور بیٹھی نہیں قریب کھڑی مسکرا رہی تھی۔ میں بھی دل کی مسکراہٹوں میں ڈوبی بیبیوں کو آتے دیکھ رہی تھی اور تقدیر مسکراتے ہوئے میری طرف بڑھ رہی تھی۔ اور لمحوں کے بھی کسی ایک لمحے میں ایک گاڑی کی ٹکر سے میں گری اور وہ گاڑی میرے اوپر سے گزرتی جا رہی تھی کہ آنے والی ماں بیٹی نے شور مچا کر گاڑی کو رکوایا اور صورتحال یہ تھی کہ میں گاڑی کے نیچے دبی ہوئی تھی اس کا ایک ٹائر میرے پیٹ کے اوپر تھا اور میں ربنا ارحم لنا پڑھے جا رہی تھی۔ پیپل کا درخت اس کے اوپر آسمان کی نیلاہٹ اور درمیان میں اُڑتے پرندے سب مجھے نظر آ رہے تھے لیکن بے بس تھی ہل نہیں سکتی تھی۔

پریشان حال میرے شوہر نے دونوں بیٹیوں

کو فون کیا پھر 1122 کو فون کیا اور اس کے بعد اگلے مراحل طے ہوتے گئے اور آپ یقین جانیں اس دوران میں نے صرف اپنے رب کی رحمتیں مانگیں اور کوئی تکلیف کا احساس میرے قریب بھی نہیں تھا۔

یہ داستان میں یہیں پر ختم کرتی ہوں۔ وہ درس قرآن جس کو میں پچھلے پندرہ سال سے جاری رکھے تھی جانے کیوں مجھ سے جُدا کر دیا گیا۔ میں نے کبھی تکبر نہیں کیا کبھی بڑا بول نہیں بولا' ہمیشہ یہی کہا کہ یہ سب میرے رب کی رحمت ہے۔ سب کہا کرتی تھیں باجی جان! آپ کا درس بہت اچھا ہوتا ہے سمجھانے والا اور میں یہی کہتی ہوں یہ میرا درس نہیں ہے یہ تو قرآن کی تعلیم ہے۔ بس میرے رب نے میرے لب ولہجہ میں شاید کوئی اثر دکھانے والی گولی گھول دی ہے۔ یہ سب اس کا کرم ہے کہ آپ لوگ بات کو سمجھتے ہیں۔

آج تقریباً ایک سال ہو رہا ہے سوائے تین بار کے میں درس قرآن نہیں کر سکی۔ شدید سردی اور دھند رکاوٹ بنی رہی اور جب ذرا دن بدلے تو کرونا وائرس نے راستے مسدود کر دیئے۔ رب العزت سے ہر گھڑی دعا ہے کہ اس بلا اس وباء سے پوری دنیا کو پاک وصاف کر دے۔ جہاں دنیا کے اور کام شروع ہوں مجھ گنہگار کو پھر درس قرآن کی محفل سجانے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

☆☆☆☆☆☆☆

دراصل بات تقدیر کی چل رہی تھی' ثوبان نے بات کا سلسلہ جوڑا۔ میں ان صاحب کے مقدر پر افسوس بھی کرتا تھا اور اپنے مقدر پر رب کا شکر بھی ادا کرتا تھا۔ سورہ عبس کی آیات 19 اور بیس کا ترجمہ پڑھا۔ ترجمہ: پیدا کیا اللہ نے اسے پھر تقدیر مقرر کی اس کی۔ ترجمہ: پھر زندگی کی راہ آسان کی اس کے لئے۔ اس کے بعد سورہ الانفطار کی آیت نمبر 5 پڑھی۔ ترجمہ: جان لے گا ہر شخص کہ کیا آگے بھیجا اس نے اور کیا پیچھے چھوڑا اس نے۔

یہ زندگی تو اُدھار ملی تھی کس نے اجازت دی کہ کہ اس ادھار لمحات کی مالا کو سانپ کی ڈور بنا دو اور اپنی مرضی سے اسے کسی کی بھی راہ میں ڈال دو۔

وہ دونوں رو رہے تھے اور مسکراہٹ بھی ان کے چہروں کا احاطہ کئے تھی۔ عجیب دھوپ چھاؤں کا سماں تھا۔ اپنی قسمت پر نازاں اور دوسروں کی نادانی پر افسردہ۔ میں نے ایسا کوئی جوڑا شاید ہی کبھی دیکھا تھا وہ ساس نند کے جھنجٹ سے آزاد تھی۔ میاں نے خوامخواہ کی ساس لا کے ذمہ داریوں کی ڈور میں اُلجھا دیا لیکن نہیں اس زمانے میں بھی احساس سود وزیاں سے مبرا ہو کر سوچنے والا کوئی موجود ہے اور وہ اُجالا تھی۔ بہرحال ثوبان نے اپنی روداد کو پھر سے سنانا شروع کر دیا۔

ان گنت راتوں اور صبحوں کے لمحات میں ہم ایسے مگن ہوئے کہ بھول ہی گئے کہ یہ زندگی تو رب کی عطا کردہ ایک امانت ہے۔ سردیاں شروع ہوئیں اور ایک روز ماں جی کو ہلکی سی کھانسی شروع ہوئی علاج بھی فوراً شروع ہوگیا اور ہر احتیاط بھی کی جانے لگی۔ نہ کھانسی بڑھی نہ ہی کوئی اور بات ہوئی۔ ایک صبح ماں جی تکیوں کے سہارے بیٹھی آہستہ آہستہ چائے پی رہی تھیں۔ کپ اُجالا کے ہاتھ میں تھا انہوں نے دھیرے سے کپ ہٹایا' اُجالا کا ہاتھ پکڑا مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ چوما' اپنے بازو سے کنگن اُتارا اور اُجالا کو پہنا دیا۔ دوسرا کنگن بھی اُتارا اور

پاس کھڑی منیبہ کو دے دیا۔ یہ سب چند لمحوں میں ہوا' اُجالا ان کے ہاتھ روکتی رہ گئی لیکن جیسے وہ ایک فرض ادا کرنا چاہ رہی تھیں۔ ادا کیا' لب ہل رہے تھے۔ ان کے چہرے پر اک نور سا چھایا ہوا تھا اور ہمارے کچھ بھی سمجھنے سے پہلے وہ خالق حقیقی کے پاس جا چکی تھیں۔ ان کی گردن ذرا سی ڈھلکی تو اُجالا نے فوراً انہیں سنبھالتے ہوئے لٹا دیا۔ ہم تو گویا پتھر کی سل بن گئے تھے۔ کوئی یوں بھی بھلا دنیا سے نکل جاتا ہے؟۔

جی ہاں بالکل نکل جاتا ہے۔ یہ میں نوشابہ اختر کہہ رہی ہوں۔ 2003ء کا رمضان المبارک تھا میری چھوٹی نند ایک بہت ہی پیاری ہستی ہمارے ہاں آئی ہوئی تھیں۔ ایک دو روز سے ان کی طبیعت ناساز تھی لیکن ایسی تو کوئی بات نہ تھی۔ ایک روز نہیں بلکہ چند گھنٹے پہلے وہ مجھ سے قیمہ کریلے پکانے کی فرمائش کر رہی تھیں۔

سحری کا وقت تھا ہم سب نے سحری کی اور میری چھوٹی بیٹی ان کے لئے چائے لے کے گئی۔ انہوں نے دو چار گھونٹ چائے پی اور واش روم چلی گئیں۔ جی ہاں خود ہی۔ میں بھی اپنے واش روم میں وضو کرنے چلی گئی۔ لوٹ کے آئی تو وہ دوبارہ واش روم جا رہی تھیں۔ میں وہیں تھی کہ وہ واپس آئیں' بیڈ پر بیٹھیں اور سوشی سے کہا ''دراز میں سے میری چیک بک لا دو میں سائن کردوں بعد میں مشکل نہ ہو۔'' انہوں نے دو چیک بکس کے دو چیکس پر سائن کئے' الماری میں واپس رکھوایا' خود سہارے کے ساتھ چل کر گاڑی میں بیٹھیں۔ میرے گاڑی باہر نکالنے تک میرے شوہر بھی آ کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے اور دو منٹ کی ڈرائیو پر ہم عمر

ہاسپٹل کے ایمرجنسی گیٹ پر تھے۔ احسان اندر وہیل چیئر لینے گئے' باجی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا اور میں ان سے کوئی بات کر رہی تھی۔ کہ ان کا ہاتھ ڈھیلا پڑ گیا۔ میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا ان کی گردن ذرا سی ڈھلکی ہوئی تھی اور موت کا فرشتہ بے آواز آ کر انہیں ہم سے ہمیشہ کے لئے دُور لے جا چکا تھا۔

ضمناً کوئی بات درمیان میں آ جائے تو خدارا اسے یہی سمجھ کر پڑھ لیجئے کہ اس میں بھی کوئی مقصد یا درس عبرت ہے اور موت کو یاد رکھنے کا عمل کرتے رہنا تو ویسے بھی بہت ضروری ہے۔

اب ثوبان کی کہانی کی طرف لوٹتے ہیں۔

ہم سب کتنی دیر پتھر کی سل بنے کھڑے رہے۔ ایمان کی کال پر ڈاکٹر صاحب آئے اور ہمیں یہ روح فرسا خبر سنائی کہ ماں جی کو تو رخصت ہوئے آدھ گھنٹے سے زیادہ وقت گزر چکا ہے۔

یہ ہے زندگی اور یہی ہے اس رب کی عظمت کی نشانی کہ لمحوں کے اندر کیا سے کیا کر سکتا ہے۔ ہم کن بھول بھلیوں میں بھٹک رہے ہیں ہمیں تو ہر پل اس رب کا ذکر کرتے رہنا چاہئے کہ جس کے ہاتھوں میں ہمارے ہر لمحے کی ڈور ہے۔

ان کے جانے سے گھر جیسے خالی اور اُداس ہو گیا۔ وہ تو ہمارے دلوں میں بس رہی تھیں۔ ماں نہ ہوتے ہوئے بھی ہمارے دلوں میں ایک ماں جیسے جذبوں کی برکھا برسا گئیں۔ اللہ ان کے مراتب بلند کرے گھر کی سنسناہٹ میں ان کی مسکراہٹیں اب بھی بکھری پڑی ہیں۔ وقت تو گزرنا ہے گزرتا چلا جاتا ہے۔ تقریباً چھ سات ماہ گزر گئے ہم اکثر ان کا ذکر خیر کرتے۔ ان کی خاموش زبان لیکن چمکتی ہوئی

پیار بکھیرتی نگاہوں کو اپنے اردگرد محسوس کرتے۔ اکثر منیبہ اس کڑے کو دیکھتی چلی جاتی۔

ضمناً پھر بتادوں کے ثوبان نے ان کڑوں کی قیمت کا تخمینہ لگوا کر اس کی قیمت خرید کے مطابق کئی لاکھ روپے ایدھی سنٹر میں جمع کروائے اور ایدھی والوں سے اس کی رسید بھی لی۔ وہ کہتے ہیں نہ جانے کیوں میں نے یہ سب کیا۔ کبھی کبھی میں سوچتا رسید کی کیا ضرورت تھی؟ پھر ایک روز یہ راز بھی اللہ نے خود ہی کھول دیا۔ ہم لوگ ناشتے کی میز پر بیٹھے تھے اور ذکر ماں جی کا ہی ہو رہا تھا کہ گھنٹی بجی۔ گیٹ والے بابا جی نے اطلاع دی کہ کوئی مہمان ہیں، میاں بیوی آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔

اس وقت کون ہوسکتا ہے؟ میں خود ہی گیٹ پر چلا گیا۔ اجنبی چہرے دیکھ کر کچھ پریشان ہو رہا تھا کہ ان صاحب نے بہت پرانے اخبار کا تراشا میرے سامنے کیا۔ ''ثوبان احمد آپ ہی ہیں کیا۔ میں عبداللہ نیازی ہوں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔''

وہ شاید بہت جلدی میں تھے۔ ساری بات فوراً مکمل کرنا چاہتے تھے۔ تراشا دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ یہ حضرت ماں جی کے رشتہ دار ہیں۔ ''جی میں ثوبان ہی ہوں گیٹ پر کھڑے تو بات نہیں ہوسکتی نا آپ اندر آئیے بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔''

میں انہیں اندر لایا، بٹھایا۔ اُجالا کو آواز دی مہمان آئے ہیں کچھ مہمان نوازی کرلیں۔

جب ہم اطمینان سے بیٹھ گئے تو میں نے ان سے پوچھا ''آپ کون ہیں کہاں سے آئے ہیں اور ان خاتون سے آپ کا کیا رشتہ یا تعلق ہے؟''

''جی وہ ہماری ماں جی ہیں وہ کہاں ہیں ہمیں ان سے ملوائیں نا! کیا وہ آپ کے پاس ہی تھیں یا کسی اولڈ ہوم میں، جلدی بتائیں پلیز!'' ان صاحب کے بجائے وہ خاتون بول رہی تھیں جنہیں شاید سب جان لینے کی جلدی تھی۔

''بھائی صاحب آپ کچھ نہیں پوچھیں گے آپ بھی تو بتائیں کہ وہ آپ کی کون تھیں اور اتنے سالوں بعد آپ کس کا پتہ کرنے آئے ہیں؟''

''وہ میری والدہ تھیں۔ یہ لمبی داستان ہے آپ ہمیں ان سے ملا دیں تو ہم انہیں اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ ہم وہ سارے اخراجات ادا کردیں گے جو اتنے سالوں میں آپ کو برداشت کرنا پڑے ہم پائی پائی کا حساب چکا دیں گے۔'' ان کے اندر ایک دولت مند بول رہا تھا۔ میں ان کی باڈی لینگویج کو سمجھ رہا تھا۔ دُور کہیں ماما بیٹھی توے پر روٹی ڈالے بیٹے کی راہ تک رہی تھی۔ ان کی دولت مندی جدی پشتی نہیں تھی چند سال پہلے کی تھی جیسے کسی کی لاٹری نکل آئی ہو۔

''میرے بھائی! ان سے ملاقات کے لئے تو آپ کو لمبا انتظار کرنا پڑے گا۔ مختصراً بتادوں کہ شدید سردی کی ایک دھند آلود صبح جب میں اور ایمان واک سے آئے تو گیٹ پر ایک گٹھڑی نما چیز دیکھ کر ٹھٹھک گئے۔ جب ہم گھر سے نکلے تھے تو یہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ ایمان نے ایدھی والوں کو بلانے کا کہا، میں نے چادر سے باہر نکلے ہاتھ کو دیکھا وہ سخت گرم تھا یعنی انہیں بہت تیز بخار تھا۔ مجھے وہ حدیث یاد آئی اللہ بندے سے پوچھے گا میں بیمار تھا اور تم مجھ سے دور رہے تھے تم نے میرا علاج کیوں نہ کیا۔ حدیث کے الفاظ یہ نہیں تھے بس مفہوم ایسا ہی ہے۔

میں نے اندر سے فوراً چارپائی منگوائی انہیں بیڈ روم میں لے جا کے لٹایا ہیٹر جلایا اپنے فیملی ڈاکٹر کو بلایا علاج شروع ہوا اور دوسرے روز تک وہ بہت بہتر ہوگئیں۔ وہ بولتی بھی نہیں تھیں ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم والا معاملہ تھا۔ میں نے ان کی صحت یابی تک اپنے پاس رکھنے کا ارادہ کرلیا۔ ایک ضعیف خاتون کو جو بالکل میری مرحومہ ماں جیسی تھیں میں کسی اور کے رحم و کرم پر کیسے چھوڑ دیتا اور میرے بھائی چند روز میں انہوں نے میری ماں کی جگہ لے لی۔ میری بیوی ان کے ساتھ ایسے تھی جیسے انہی کی بیٹی ہو۔ سات سالہ ازدواجی زندگی میں ابھی تک ہمارے آنگن میں کسی کے معصوم قہقہے نہیں گونجے تھے اس لئے کوئی اور مصروفیت نہیں تھی ۔اُجالا کے دن رات ماں جی کے ساتھ گزرنے لگے۔

اس دوران میں نے ہر روز اشتہار دیئے' ماں جی کے پیاروں کو پکارا لیکن صرف خاموشی تھی۔ ماں جی کا کوئی آئی ڈی کارڈ وغیرہ کچھ بھی نہیں تھا۔ یہ تراشا دیکھیں آپ کو اندازہ ہوگا کہ یہ اشتہار کئی اخباروں میں چھپا اور پھر ہم نے ماں جی کو سچ مچ اپنی ماں جی سمجھ لیا اور اُجالا تو یہاں تک کہنے لگی کہ اگر کبھی کوئی انہیں لینے آیا تو میں انکار کردوں گی۔

میرے بھائی! ماں جی کی برکت سے اللہ تعالیٰ کا کرم ہم پر نازل ہونا شروع ہوگیا۔ اُجالا کو رب نے ماں بننے کی خوشخبری عطا فرمادی۔ میرے بزنس میں بھی بڑھوتری ہورہی تھی۔ چھوٹے بھائی کی شادی کی اور اس کی دلہن نے ایک ہی دن میں ماں جی کو اپنی ماں بنالیا۔ میں سوچتا تھا کہ رب کی یہ رحمت جس گھر سے اُٹھ کر ہمارے گھر پر گھٹا بن کے برس رہی ہے وہاں کیسی ہوگی اور کیسے بدنصیب ہیں وہ جنہوں نے مڑ کر دیکھا بھی نہیں۔"

"آپ ہمیں ماں جی سے ملا بھی دیں نا ہم انہیں اپنے ساتھ لے جائیں گے۔"

اُجالا کی سسکی نے ہمیں متوجہ کیا' وہ سر جھکائے بے آواز رو رہی تھی۔ "میرے بھائی آپ نے آنے میں دیر کردی' ڈیڑھ ماہ قبل وہ جس خاموشی سے ہمارے پاس آئی تھیں اللہ کے پاس چلی گئیں۔" ماحول کافی سوگوار ہوگیا منیبہ اور اُجالا کی سسکیاں مجھے بھی رُلا رہی تھیں لیکن تعجب ہے کہ وہ بیٹا اور بہو صرف سر جھکائے بیٹھے تھے۔ کیا اپنے کئے پر نادم تھے یا ان نعمتوں سے فیض یاب نہ ہوسکنے کا دُکھ کھا رہا تھا؟ میں سمجھ نہ سکا۔

انہوں نے مجھے بتایا کہ انہیں کینیڈا کی شہریت لینی تھی' وہ ماں جی کو ان کے نواسے کے پاس چھوڑ کر گئے تھے۔ وہ لڑکا جسے انہوں نے اپنے بچوں کی طرح پالا تھا۔ نہ جانے اس نے کیا' کیا؟ کوئی بچہ اتنا سنگدل بھی ہوسکتا ہے میں نے سوچا نہیں تھا۔ میں وہاں جاکر بہت سی مشکلات میں پھنس گیا۔ جو رحمتیں رب نے آپ کے اوپر برسائیں وہ ہم سے دُور ہوگئیں۔ میری بیوی چار بار ماں بنتے بنتے خالی ہاتھ رہ گئی۔ بزنس سیٹ کرنے میں کافی مشکلات پیش آرہی تھیں۔ ماں جی بات تو کرتی نہیں تھیں بلال ہمیں ان کی خیریت بتاتا رہا اور ایک روز اس نے کہا کہ جب ہم سو کر اُٹھے تو ماں جی گھر میں نہیں تھیں۔ ہم نے بہت تلاش کیا اور پھر ایک ماہ بعد ہم مایوس ہوکر بیٹھ گئے۔ لیکن وہ غلط بیانی سے کام لے رہا تھا یہ تراشے اس کی الماری میں سے ملے ہیں کچھ بھی پوچھو تو آئیں بائیں شائیں مارتا ہے۔ اب تو آسٹریلیا چلا گیا ہے۔ میں اپنی بدقسمتی پر روتا

رہتا ہوں لیکن اب کف افسوس ملنے سے کیا ہوگا۔ خیال تو یہی تھا کہ چند ماہ یا ایک سال بعد کچھ دیر کے لئے لوٹ آئیں گے۔

باتوں باتوں میں ان کی بیگم نے سوال کر ہی دیا کہ ''کیا ماں جی کی بانہوں میں جڑاؤ کنگن تھے؟''

اُجالا نے سویٹر اوپر کر کے ان سے پوچھا کہ کیا وہ ان کنگنوں کی بات کر رہی ہیں۔ تو وہ لپک کر ان کی طرف گئیں۔ ''ہاں یہی میری ساس کے کنگن ہیں۔'' وہ ہاتھ بڑھا کے بولیں تو اُجالا نے کہا ''ہاں یہ انہیں کے کنگن تھے۔ آخری روز نہ جانے کیوں میرے لاکھ منع کرنے کے باوجود انہوں نے ایک کنگن مجھے پہنا دیا اور دوسرا منیبہ کو۔ یوں جیسے وہ کسی فرض سے سبکدوش ہونا چاہ رہی تھیں۔''

''چلیں اب تو ہم آگئے ہیں کنگنوں کے اصل وارث اب یہ آپ مجھے دے دیں۔''

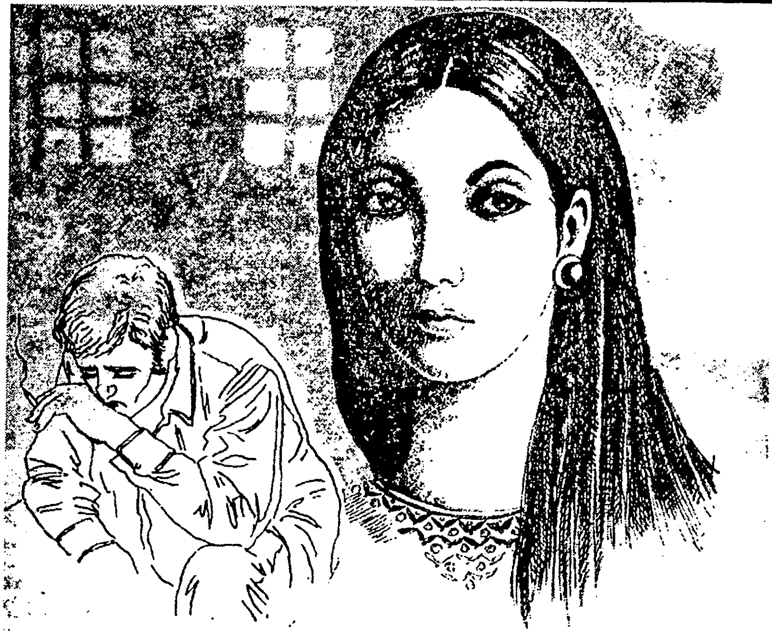
''ایک منٹ ٹھہریں بہن! ہمیں ان کنگنوں کا لالچ نہ ان کی زندگی میں تھا نہ ان کے جانے کے بعد ہے۔ ان کی برکت سے جیسے رب نے میرے گھر میں خوشیاں بکھیریں ہم نہ ان کا شکریہ ادا کر سکتے ہیں اور نہ ہی مکمل طور پر اپنے رب کا۔ انہوں نے اپنی خوشی سے جو کام کیا اس کا معاوضہ تو کوئی ادا کر ہی نہیں سکتا اس کے باوجود میں نے ان کا تخمینہ لگوا کر ایدھی میں وہ پیسے جمع کروائے اور انہوں نے اس رقم سے ایمبولینس بھی خریدی۔ جو رقم کم ہوئی وہ میں نے شکرانے کے ساتھ خود ادا کی۔ آپ کا ان پر کوئی حق نہیں۔ میں وہ رسیدیں آپ کی تشفی کے لئے ضرور دکھاؤں گا مجھے یقین تھا کہ کوئی نہ کوئی دعویدار کہیں نہ کہیں سے آجائیگا۔''

میں نے وہ سب رسیدیں اور ایمبولینس کی خریداری کی رسید بھی ان کو جب دکھائیں تو ایک مایوسی ان کے چہرے پر چھا گئی۔ دکھ اس بات کا ہے مجھے کہ ماں جی کی وفات کی خبر سُن کر تو انہیں کوئی افسوس نہیں ہوا تھا کنگنوں کے چھن جانے کا کتنا دُکھ ہوا۔ ہماری بدقسمتی ہی یہ ہے کہ ہم اصل کو چھوڑ کر نقل کے پیچھے بھاگتے ہیں۔

میرا خیال تھا وہ اپنی والدہ کی آرام گاہ آفریں کے متعلق ضرور پوچھیں گے لیکن یوں جیسے ان چند سالوں میں ان کی اندرونی کیفیات اور حسیات جو ایک بیٹے کے دل میں ماں کے لئے ہوتی ہیں ختم ہو چکی تھیں۔ انہوں نے ایک بار بھی نہ سوال کیا کہ وہ کون سے قبرستان میں ہیں اور کیا آپ ہمیں وہاں لے جا سکتے ہیں؟ مجھے تو کوئی اعتراض نہ ہوتا میری اپنی مرحومہ ماں کی لحد اور ماں جی مرحومہ کی لحد ساتھ ساتھ تھیں اور ہم وہاں جاتے بھی رہتے تھے۔ بہرحال یہ ان کے سوچنے کی بات تھی۔

اور وہ بغیر کچھ پوچھے اُٹھ کے چلے گئے۔ میرے دل میں دکھ کی ایک بہت بڑی گرہ لگا کر کہ کیا کوئی اولاد اتنی بے حس بھی ہو سکتی ہے؟۔

دراصل جب دین کے مقابلے میں دنیا کے امور کو مقدم جان لیا جائے تو پھر یہ امور کھیل تماشہ ہی بن جاتے ہیں۔ جبکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے تخلیق کائنات محض کھیل تماشے کے طور پر نہیں کی بلکہ اس سب کا ایک مقصد ہے اور اس کا مقصد ہے درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں۔



رشتوں کا زہر

پہلے کبھی کبھی میری ساس بیٹی کے گھر جاتی اب میرا سُسر اُسے کسی نا کسی بہانے بیٹی کے گھر بھجوائے رکھتا۔ جب وہ گھر نہ ہوتی میرا سُسر گھر آدھمکتا اور اوپر جاکر دروازہ بند کرلیتا۔ میں اُس کی ذہنیت کو خوب جانتی تھی اس لیے میں بے بسی سے پیچ و تاب کھا کر رہ جاتی۔



جاوید راہی

ایک عورت کی سچی کہانی جس نے ظلم کرنیوالوں کو عبرت کا نشان بنادیا

بارش اتنی تیز تھی کہ آنکھوں کے سامنے سارا ماحول تاریکی کی مثال دکھائی دے رہا تھا۔ میں قصور ڈسٹرکٹ جیل کی عمارت کے مین گیٹ پر چوبی دروازے کے ساتھ لگا اس انتظار میں تھا کہ سپرنٹنڈنٹ جیل راجہ نثار میرے بھجوائے وزٹنگ کارڈ جس کے پیچھے جیل اتھارٹی کی سفارش بھی تحریری طور پر موجود تھی کہ جیل کہانی کے سلسلہ میں میری جائز حد تک مدد اور راہنمائی کی جائے، مجھے میرے مطلوبہ مقصد تک پہنچنے کی اجازت دیدے۔ اسی اثنا میں بڑے گیٹ کے پیچھے کھڑے جیل وارڈن نے درمیانی حصہ میں چھوٹے سے بنے سلاخوں کے سوراخ میں سے میرا نام لے کر پکارا۔ میں گیٹ کے

ساتھ لگا خود کو بارش سے محفوظ کیے کھڑا تھا۔ میں نے جھٹ جواب میں اپنے ہونے کا احساس دلایا تو اندر سے میرا نام لے کر پکارنے والے نے چھوٹا گیٹ کھول کر مجھے اندر آنے کا کہا۔ میں جھک کر جیل کی ڈیوڑھی میں آن رُکا، جیل کے ایک اہلکار نے میرے ہاتھ پر مہر لگاتے مارکر سے اپنے سائن کیے، تاریخ ڈالی اور مجھے لیتے ہوئے جیلر راجہ نثار کے آفس میں آ گیا۔ راجہ نثار لمبا تگڑا گورا چٹا وجیہہ نوجوان تھا۔ مجھے اُٹھ کر ملا اور اپنے اردلی کو چائے وغیرہ لانے کا اشارہ کیا اور خود اپنے آفس کی بڑی سی کھڑکی میں سے قیدیوں کی نقل و حرکت کا جائزہ لیتے میری طرف متوجہ ہوا۔ راہی صاحب آپ نے جو موضوع جیل کہانی کے حوالے سے چنا ہے خاصا مشکل ہے۔ پورے ملک کی جیلوں کا دورہ کرنا پھر حقیقت کو چھان پھٹک کر قارئین کی نذر کرنا بہت بڑا جہاد ہے۔'' اسی دوران ملازم چائے اور دیگر لوازمات رکھ کر باہر نکل گیا۔ چائے پینے کے دوران میں نے اپنے آنے کا مقصد بتایا تو انہوں نے بڑی محبت سے رضامندی کا اظہار کرتے کہا ''جیلوں میں عادی مجرموں اور حالات کے ستائے لوگوں کے پیچھے کوئی نہ کوئی کہانی چھپی ہوتی ہے۔ میں نے آپ کی کہانیاں پڑھی ہیں میرا اپنا نظریہ ہے کہ آپ اصلاحِ معاشرہ کے لیے ہی اپنا قلم استعمال کرتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ بات روز روشن کی طرح موجود ہے اگر کوئی کچا ذہن اپنے دل میں کوئی ایسا ہی جرم کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو آپ کی کہانیاں ایسے بندے کو خوفزدہ کرتے کسی بھی جرم کے ارتکاب سے روکتی ہیں۔''

اسی دوران میں نے رضیہ عرف رجو کو دیکھا جو اپنی بیٹی کے جس کی عمر مشکل سے تین چار سال رہی ہو گی کے ہمراہ جیل میں دس سال کی سزا بھگت رہی تھی۔ اس نے اپنی ساس سسر اور سوتن پر تیزاب پھینک کر اُنہیں بُری طرح گھائل کر دیا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا جو زنانہ جیل سے اپنی بچی کے ہمراہ راجہ نثار صاحب کے آفس میں نظریں نیچی کیے موجود تھی۔ لیڈی وارڈن بچی کا ہاتھ تھامے مؤدب اس کی پشت پر کھڑی راجہ صاحب کے حکم کی منتظر تھی۔ رضیہ تمہاری بچی کے بارے میں عدالت اور جیل حکام خاصی اُلجھن میں مبتلا ہیں تمہارے خاوند نے بھی اعلیٰ حکام کو درخواست گزار رکھی ہے کہ اسکی بچی جو ماں کے ساتھ جیل میں بند ہے اُسے باپ کے سپرد کیا جائے۔ اس دوران رضیہ صرف آنسو برساتی رہی۔

پھر وہ میری طرف متوجہ ہوئے اور کہا کہ آپ اِدھر ہی اس سے بات چیت کریں گے یا لیڈی وارڈن کے آفس میں؟

''میرا خیال ہے لیڈی وارڈن کا آفس ہی ٹھیک رہے گا کیونکہ آپ کے کام کا بھی حرج نہیں ہو گا۔'' میں نے اُٹھتے ہوئے سپرنٹنڈنٹ جیل کا شکریہ ادا کیا اور ہم ان کے آفس سے نکل کر لیڈی جیل وارڈن کے آفس میں آ گئے۔ ''رضیہ آپ ہر طرح کے خوف سے آزاد ہو کر ان کو اپنی کہانی بیان کرنا جس کی بنا پر تمہیں دس سال کی قید ہوئی۔'' لیڈی وارڈن نے اپنی سیٹ سنبھالتے ہوئے اُسے مخاطب کیا۔ ''جی مس صاحبہ......'' رضیہ نے اپنے سر پر دوپٹہ درست کرتے جواب دیا۔

پھر وہ مجھے اس جُرم کی واردات کی تفصیل بتانے لگی جو کچھ یوں ہے:

''میری شادی دونوں گھروں کے بزرگوں کی مرضی اور رضامندی سے ہوئی تھی۔ پہلے کچھ ماہ تو میرے ساتھ پورے گھر والوں کا رویہ بڑا اچھا رہا پھر یکدم میری ساس کی روائتی روک ٹوک شروع ہو گئی۔ اس دوران مجھ پر یہ بھی انکشاف ہوا کہ میرا

سُسر جس کو میں اپنا باپ ہی تصور کرتی تھی، اس کی باتوں اور حرکتوں میں بھی تبدیلی آ چکی ہے۔ جب کبھی میری ساس مجھ پر طعنوں کی بارش کرتی تو موقع پا کر میرا سسر بڑی بے تکلفی سے مجھے اپنے ساتھ اس طرح چمٹا کر میری دل جوئی کرنے کی ایکٹنگ کرتا جیسے اُسے اپنی بیوی کے رویہ پر بڑا دُکھ ہے۔ اللہ پاک نے عورت کو ایسی حس عطا کر رکھی ہے جو رشتوں کے اُتار چڑھاؤ کو فوراً محسوس کر لیتی ہے۔ میں زوار کو بتانے کی کوشش کرتی مگر یہ سوچ کر چپ ہو رہتی کہ کہیں وہ اپنے باپ پر میری بات کو تہمت نہ قرار دے بیٹھے۔ میرے شوہر کا بازار میں ایک چھوٹا سا جنرل سٹور تھا۔ جس پر دونوں باپ بیٹا اُٹھتے بیٹھتے تھے۔ دوپہر کو جب میرا سُسر کھانا لینے آتا تو اپنی بیوی سے چھپا کر کچھ نا کچھ میرے لیے لے آتا اور میرے انکار کرنے کے باوجود کچن میں رکھ کر مجھے ہوس زدہ نظروں سے دیکھتا ہوا مسکراتا باہر نکل جاتا۔ زوار اپنے باپ کے بارے میں اپنی ماں کی بھی کوئی بات برداشت نہیں کرتا تھا۔

ایک دن میرے سُسر نے حد کر دی۔ میری ساس اپنی بڑی بیٹی کے گھر جو دوسرے بلاک میں تھا گئی ہوئی تھی اور میں گھر میں اکیلی ہی تھی کہ باہر دستک ہوئی۔ میں نے دودھ والا سمجھ کر دروازہ کھولا تو سامنے میرا سُسر موجود۔ تھا ابھی کھانا بننے میں دیر تھی پہلے وہ دو بجے سے بعد آتا تھا اس روز بارہ بجے آن دھمکا تھا کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ اُس کی بیگم اپنی بیٹی کے گھر گئی ہوئی ہے۔

میں دروازہ کھول کر جلدی سے کچن میں چلی گئی اور کھانا بنانے میں لگ گئی۔ تھوڑی دیر گزری ہو گی میرے کان میں سُسر کی آواز گونجی جو مجھے اپنے کمرے میں آنے کا کہہ رہا تھا۔ میں بوجھل قدموں سے چلتی کمرے میں آئی میرا سُسر بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر مخاطب ہوا ''رجو میرا سر شدید درد کر رہا ہے الماری سے بام نکال کر میرے ماتھے پر لگا دو ذرا۔'' میں سمجھ گئی تھی کہ اُس کی آنکھوں میں شیطانیت کا راج ہے۔ مگر میں بے بس تھی نہ چاہتے ہوئے بھی میں بام لا کر اُس کے ماتھے پر مساج کرنے لگی۔

میں نے خود کو ہر طرح سے الرٹ کیا ہوا تھا۔ وہی ہوا جس کا مجھے خدشہ تھا، میرے سُسر نے میرے بازو کھینچ کر اپنے ساتھ لٹا لیا۔ میں نے احتجاج کیا ''ابو جی میں آپ کے بیٹے کی عزت ہوں اور آپ کی بیٹی ہوں ذرا ہوش میں آیئے۔''

''رجو میں تو اس وقت سے تیرے لیے تڑپ رہا ہوں جس دن سے تیرے گھر میں زوار کا رشتہ لینے گیا تھا'' وہ شیطان بن چکا تھا۔

''آپ شرم کریں میں زوار کو اور امی کو بتا دونگی آپ کی اصلیت۔''

اب وہ تھوڑی دیر کے لیے ٹھٹھکا، مگر اگلے ہی لمحے پینترا بدل کر بولا ''تجھے معلوم ہے نہ کہ ہم جب چاہیں تجھے تیرے گھر بھیج دیں۔ اگر تُو نے زوار کی بیوی بن کر اس گھر میں رہنا ہے تو چپ چاپ میری بات مان جاؤ۔ ورنہ طلاق کی تیاری کرو۔''

''ابو جی خدا کا خوف کھاؤ میں زوار کے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔''

میرے سُسر نے ڈھٹائی اور بے غیرتی کی انتہا کر دی۔ مجھے اس نے یوں دبوچ رکھا تھا جیسے میں کوئی بکری کا بچہ ہوں اور وہ بھیڑیے کا کردار ادا کر رہا تھا۔ میں نے اسکے بازوؤں میں مچلتے ہوئے شور مچا کر لوگوں کو اکٹھا کرنے کی دھمکی دی جس پر اس کی گرفت ڈھیلی ہو گئی اور میں آنسوؤں کے سیلاب میں ڈوبی بھاگ کر کچن میں آ گئی اور اندر سے کنڈی چڑھا لی۔ میرا سُسر کافی دیر تک باہر کھڑا

مجھے کوستا رہا اور سنگین نتائج کی دھمکی دیتا گھر سے باہر دفع ہو گیا۔ میں نصیبوں جلی کچن میں بیٹھی آنسو بہاتی رہی۔ پہلے میں نے فیصلہ کیا کہ اپنی ساس اور اپنے شوہر کو اس بے غیرت کی ساری کاروائی بتا دوں پھر مجھے اس کی دی ہوئی دھمکی یاد آ گئی کہ اگر اس واقعہ کا ذکر کسی سے کیا تو اپنی طلاق پکی سمجھنا۔

میں ڈر گئی اور اپنی زبان بند کر لی۔ اس واقعہ کے بعد میرا سُسر بھی میری ساس کا کردار ادا کرنے لگ گیا۔ اگر میں اپنے شوہر سے اس کا تذکرہ کرتی تو وہ اُلٹا میری بے عزتی کر ڈالتا۔ میں نے اس ساری کاروائی کا ذکر اپنی والدہ سے کیا جس نے مجھے یہ کہہ کر چپ کروا دیا کہ تمہارے باپ اور بھائیوں کو پتہ چلا تو قیامت آ جائے گی۔ میں دو چار روز بعد تمہیں زچگی کے بہانے لے آؤں گی۔ میری بچی تم اس واقعہ کو بھول جاؤ۔ ماں کے سمجھانے پر میں نے اپنی زبان پر چپ کا تالا لگا لیا۔

کچھ عرصہ بعد میری ماں آئی اور مجھے ساتھ لے آئی۔ اپنے گھر آ کر میں نے اُس شیطان سے اپنی جان چھڑالی جو بھیڑ کی کھال میں بھیڑیا تھا۔

اللہ پاک نے مجھے بیٹی سے نوازا اس دوران میرا شوہر باقاعدگی سے آتا رہا اُسے اپنی بیٹی سے بہت پیار تھا۔ مجھے میرے گھر والوں نے رسم و رواج کے تحت اپنے گھر سے وداع کیا۔ میرا سسر اپنی جگہ پہ ڈٹا ہوا تھا اور میری ساس بارہا زوار کی دوسری شادی کرنے کا طعنہ دے چکی تھی مگر میں ہر بار سُنی ان سُنی کر دیتی مجھے کیا خبر تھی کہ گھر میں کون سی کھچڑی پک رہی تھی۔ میرے سُسر نے زوار کے لیے نہیں اپنے لیے لڑکی کا انتخاب کر رکھا تھا۔ زوار اپنے باپ کی ہر بات پر سر جھکانے کا تو عادی تھا ہی اپنی دوسری شادی کے لیے بھی تیار ہو گیا۔ میرے احتجاج پر اُس نے اپنے باپ کی طرف داری کرتے اپنا فیصلہ سنا دیا ''اگر تم نے میرے راستے میں کوئی ٹانگ اڑائی تو اس کا انجام اچھا نہ ہو گا۔ اور میں تمہیں تمہارے گھر بھیج دونگا۔'' یہ کہتے زوار کمرے سے باہر نکل گیا۔

میں کئی دنوں سے دیکھ رہی تھی کہ میرا سُسر گھر کی صفائی ستھرائی میں مصروف تھا۔ رنگ و روغن اور مکان کے اوپر والے حصہ کی خاص طور پر مرمت جاری تھی۔ واش روم میں نیا سامان فٹ ہو رہا تھا اور خاص کر اوپر نیا کچن بھی تعمیر ہو رہا تھا اُس نے میرے وہم کو یقین میں بدل دیا۔ زوار روز بروز بدلتا جا رہا تھا۔ ہماری بیٹی گوشی پر بھی اُس کی توجہ کم ہوتی جا رہی تھی۔ میرے ساتھ بھی اس کا تعلق صرف نام کا رہ گیا تھا۔ اوپر والا پورشن مکمل ہو چکا تھا۔ وہاں نیا بیڈ نیا فریج کارپٹ پردے نئی کراکری جس کا انتظام سُسر صاحب بڑے اہتمام سے کرتے پھر رہے تھے اوپر جانے والی سڑھیوں کو بھی نیا دروازہ لگ چکا تھا۔ غرض یہ کہ میری تباہی کا پورا پورا پروگرام ترتیب دیا جا رہا تھا۔ جب بھی کبھی کوئی بات چیت میرے اور میرے سسر کے درمیان ہوتی وہ بڑی حقارت سے جواب دیتا اور ساتھ میں یہ فقرہ ضرور ادا کرتا ''دیکھ لیا نا اپنی ہٹ دھری کا انجام۔'' میں ہر وقت پریشانی میں بتلا رہنے لگی۔

میں نے اپنے گھر والوں سے بھی اس پریشانی تذکرہ کیا، مگر میرے گھر والے ڈرپوک اور شریف لوگ تھے وہ مجھے صرف تسلیاں اور دعائیں دے کر خدا کے سپرد کر دیتے۔

کچھ دنوں بعد زوار میرے کمرے سے اپنا سامان اُٹھا کر اوپر شفٹ ہو گیا اور ادھر میرا جانا منع تھا۔ صرف میری ساس سُسر اور گوشی ہی اوپر جاتے۔ رات بھر میں اپنی بیٹی گوشی کے ہمراہ نیچے کمرے میں ہوتی مجال ہے کبھی زوار کو میرا خیال آیا

Gipsy®

www.lasaniindustries.com

نام بھی لاثانی معیار بھی لاثانی

مشہورِ زمانہ جپسی کاسمیٹکس کے مینوفیکچرنگ، مارکیٹنگ اور ٹریڈ مارک کے تمام تر جملہ حقوق بشمول کاپی رائیٹس اب لاثانی کاسمیٹکس (پرائیویٹ لمیٹڈ) کی ملکیت ہیں۔

"ان شاء اللہ"

لاثانی کاسمیٹکس (پرائیویٹ لمیٹڈ) کی زیرِ نگرانی، جپسی کاسمیٹکس کی تمام تر مصنوعات اور اس کے علاوہ معیاری کاسمیٹکس کی مکمل ورائٹی، نئی، جدید تر اور دلکش پیکنگ میں بہت جلد مارکیٹ میں دستیاب ہوں گی۔



Manufacturing and Marketing by:

Lasani Cosmetics
Private Limited

Manawan, Batapur, Lahore.
Ph: 042-37188844-37188855, Fax: 042-37188866.
lasanipharma@yahoo.com, info@lasanipharma.com

ہو۔ اس صورتِ حال کو پورا ایک سال گزر گیا مگر زوار کے رویے میں کوئی خاطر خواہ تبدیلی نہ آئی۔ زوار مال خریدنے کی غرض سے ایک دو دن شہر سے باہر جاتا تھا۔ پیچھے میرا سسر سٹور پر ہوتا، کئی ماہ سے زوار نے گھر پر واش روم وغیرہ صاف کرنے کا محلول تیار کرنے کا بھی دھندا شروع کر رکھا تھا۔ جس کو میں سارا دن بوتلوں میں بھر کر ان پر لیبل وغیرہ چسپاں کرتی رہتی۔ جب وہ کئی درجنوں تک پہنچ جاتا تو زوار وہ بوتلیں گھر سے سٹور لے جاتا۔ زوار نے مجھے اس محلول کو تیار کرنے کا فارمولا سمجھا رکھا تھا کہ کتنا تیزاب، کتنا پاوڈر وغیرہ ڈالنا ہے۔ میں خود وہ محلول تیار کرتی تھی۔ تیزاب کا کھیل اتنا خطرناک ہوتا کہ اگر اُنڈیلتے چھینٹ پڑ جاتی تو گوشت اُبل پڑتا۔ میری گوشی کو دوسرا سال لگ چکا تھا اور میں زوار کی بے اعتنائی کی آگ میں جل کر کندن بنتی جا رہی تھی۔ میں نے اپنے گھر کے ماحول میں خود عادی کر لیا۔ اپنی ساس اور سسر کے ظلم وستم سہتی اور زبان پر حرفِ شکایت نہ لاتی۔ بس زندگی کی گاڑی دھیمی رفتار سے چل رہی تھی۔

اُس روز زوار کراچی کا کہہ کر گھر سے گیا جب دس روز بعد واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک تیز طرار لڑکی بھی تھی جس کا لباس اور تیاری یہ ثابت کر رہی تھی کہ اس نے دوسری شادی کر لی ہے۔ میں سکتہ کی حالت میں رہ گئی تھی۔ میری ساس اور سسر نے دونوں کو سر آنکھوں پر بیٹھا لیا۔ زوار اوپر جاتے ہوئے گوشی کو بھی اٹھا کر ساتھ لے گیا۔ میں اپنے کمرے میں آ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ شام تک میں کمرے میں بند رہی۔ دروازہ کی دستک پر میں نے اُٹھ کر اندر سے کنڈی کھولی تو سامنے گوشی کو گود میں اُٹھائے زوار کی نوبیاہتا بیوی کھڑی تھی۔

''باجی میرا نام صائمہ ہے'' اُس نے اندر آتے گوشی کو بیڈ پر بیٹھایا اور بڑے تیکھے انداز میں بولی۔ ''میں بہت صلح پسند ہوں، زوار ہم دونوں کے برابری حقوق کی حق تلفی نہیں کریں گے۔ انہوں نے مجھے خود آپ کے پاس بھیجا ہے اور میں بھی آپ کو شکایت کا موقع فراہم نہیں کرونگی۔'' پھر اُس نے گوشی کو پیار کیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں تڑپ کر رہ گئی۔

میرے سُسر خوشی سے پھولے نہیں ساتے تھے۔ دوپہر کا کھانا میرے ہی ذمہ تھا دونوں میاں بیوی سارا وقت صائمہ کے پاس اوپر ہی گزارتے تھے ان کی تمام تر توجہ اُسی پر ہوتی۔ زوار نے اب یہ طریقہ اپنا لیا تھا کہ سٹور سے واپس آ

بزرگ کا جواب

تپتی دوپہر میں اس بزرگ کو ظہر کی نماز کیلئے دستی نل پر بڑی مشکل سے وضو کرتے دیکھا تو میں سوال کر بیٹھا ''بابا! کبھی اس خدا کو دیکھا بھی ہے، جس کیلئے اتنی صعوبت برداشت کر رہے ہو؟''

بزرگ میرے ہاتھوں پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مار کر بولے ''جی ہاں پتر! میں نے اپنے خالق کو دیکھا ہے کہ جب مخلوق خدا گرمی کی شدت سے تڑپ رہی ہوتی ہے تو اسے زمین سے ٹھنڈا ٹھار پانی فراہم کرتا ہے اور جب کڑاکے دار سردی میں مخلوق خدا ٹھٹھر رہی ہوتی ہے تو زمین کے بالکل اسی ٹکڑے سے تازہ گرم پانی نکال کر اپنی مخلوق کو طمانیت بخشتا ہے''

بزرگ کا جواب کسی تلوار کی طرح میری تمام علمی قابلیت کو کاٹتا چلا گیا۔

کر تھوڑی دیر کے لیے میرے پاس رُکتے اور اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اوپر صائمہ کے پاس چلے جاتے۔ میرے گھر والوں نے آ کر ان لوگوں سے بات کرنے کی کوشش کی مگر زوار نے یہ کہہ کر انکو واپس بھیج دیا کہ یہ ہمارے گھر کا معاملہ ہے۔ آپ کو فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ دوپہر کو میرے سُسر کھانا لینے آتے تو سیدھا صائمہ کے پاس جا رُکتے جو التفات پہلے مجھ پر جاری رہتیں۔ اب وہ صائمہ پر نچھاور ہو رہی تھیں۔

پہلے کبھی کبھی میری ساس بیٹی کے گھر جاتی اب میرا سُسر اُسے کسی نا کسی بہانے بیٹی کے گھر بھجوائے رکھتا۔ جب وہ گھر نہ ہوتی میرا سُسر گھر آ دھمکتا اور اوپر جا کر دروازہ بند کر لیتا۔ میں اُس کی ذہنیت کو خوب جانتی تھی اس لیے میں بے بسی سے پیچ و تاب کھا کر رہ جاتی۔ یہ کھیل زوار کی نگاہوں سے اوجھل تھا کیونکہ میرے ساتھ ہونے والے واقعہ کو بھی میں نے اس کے سامنے نہ رکھا اور نہ ہی میں اس سلسلہ کے بارے میں اسے کچھ بتانے کے قابل تھی۔ مجھے بخوبی علم تھا کہ میرے سُسر نے زوار کی یہ دوسری شادی کیوں کروائی تھی، اور وہ آتے ہی کیوں اس سے گھل مل گئی تھی۔ جب وہ اوپر سے نیچے اُترتا تو مجھ پر نظر پڑتے ہی بجائے ڈوب مرنے کے اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ ہوتی تھی۔ جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ میرے ساتھ دونوں میاں بیوی کا رویہ تو پہلے بھی جان لیوا تھا اوپر سے میری سوتن نے بھی میرے ساتھ ہتک آمیز رویہ شروع کر دیا تھا۔

دن رات میں اپنے ہی گھر میں اپنوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنی رہتی جب برداشت جواب دے دیتی تو میں گوشی کو اپنے ساتھ لپٹا کر چیخ چیخ کر رو پڑتی۔ جو تماشہ میرے گھر میں دن رات جاری رہتا میں اُسے سہہ کر ذہنی مریض بن چکی تھی۔

بہانے بہانے پہلے میری سوتن نے میری بے عزتی کی پھر ساس سسر مجھ پر پل پڑے، سارے زمانے کا گند مجھ پر طعنوں کی صورت میں ڈالتے رہے۔ میرے اندر اپنے سُسر کی کرتوتوں کا الاؤ تو پہلے ہی روشن تھا اوپر سے ان سب کے رویہ نے مجھے اتنا توڑا کہ میں نے ان تینوں کو عبرت کا نشان بنانے کا فیصلہ کر لیا۔

میں نے اس روز سٹور کا تالا کھولا اور تیزاب کے کنستر سے جگ بھر کر دوبارہ تالا لگا کر جگ سنبھالتے سیڑھیوں کی طرف چل پڑی۔ اوپر پہنچی تو وہ تینوں میرے ہی بارے میں باتیں کر کے دل کھول کر ہنس رہے تھے۔ میرے اندر کی کمزوری کو میری نفرت اپنے ساتھ بہا کر لے گئی اور میں چلتی ہوئی ان کے سامنے پہنچ گئی۔ وہ تینوں چائے پی رہے تھے مجھ پر نگاہ پڑتے یکدم وہ حیران رہ گئے۔ اس سے پہلے کہ کوئی بولتا میرا جگ والا ہاتھ اُٹھا اور وہ تینوں تیزاب سے نہا گئے۔ چیخ و پکار کی آواز سے آس پاس کے پڑوسی اکٹھے ہو گئے۔ میں بڑی دلیری سے ان پر تیزاب پھینک کر نیچے آئی، گوشی کو گود میں لیا اور گھر سے باہر نکل کر گزرتے رکشہ میں سوار ہو گئی۔ رکشہ والے کو تھانہ کا بتا کر میں سیٹ پر کٹے درخت کی مانند ڈھیر ہو گئی۔

میرے خلاف مقدمہ درج ہو گیا۔ مقدمہ چلا فرضی گواہان اور کمزور استغاثہ کی بنا پر مجھے سزا ہو گئی۔ جج صاحب نے میری درخواست پر میری بیٹی کو بھی جیل میں اپنے پاس رکھنے کی اجازت دے دی جو میرے ساتھ ہی ہوتی ہے۔ اُن تینوں کو میں نے عبرت کا نشان بنا دیا تاکہ مرتے دم تک وہ اپنی ناانصافیاں یاد رکھیں۔



کمپیوٹر ٹیکنالوجی اور آج کی عورت



خواتین کو جدید ٹیکنالوجی سے آراستہ کیے بغیر ترقی کا حصول ممکن نہیں، لیکن بعض لوگ منفی استعمال کے باعث اسکی مخالفت کرتے ہیں!

عارف محمود اپل

موجودہ دور میں نت نئی ایجادات نے ذہنوں کو وسعت عطا کر دی ہے۔ وہ وقت بالائے طاق ہوا جب لڑکی کو تعلیم دینا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ موجودہ سائنس و ٹیکنالوجی کے دور نے انسانی شعور کی گھتیوں کو کھولنا شروع کر دیا اور نت نئی ایجادات نے ذہنوں کو وسعت عطا کر دی ہے۔ جس کے باعث آج والدین سوچنے پر مجبور ہیں کہ تعلیم جیسی دولت پر صرف لڑکوں کی اجارہ داری نہیں بلکہ لڑکیوں کو بھی اس میدان میں آگے آنا ہوگا۔ آج یہ احساس بھی جاگزیں ہو گیا ہے کہ ان پڑھ عورت

سے ملک و معاشرہ ترقی نہیں پا سکتے کیوں کہ عورت کو جاہل رکھنا ایسے ہی ہے جیسے مخصوص مقاصد کی خاطر کسی پالتو جانور کو کھونٹے سے باندھ دیا جائے۔ اس ضمن میں احادیث مبارکہ ہیں:

☆علم حاصل کرو چاہے تمہیں چین جانا پڑے۔

☆علم حاصل کرنا مرد اور عورت دونوں پر فرض ہے۔

مذکور حدیثوں کی روشنی میں علم کی اہمیت اور بھی عیاں ہو جاتی ہے۔ بہر کیف آج کل نصابی تعلیم کے علاوہ جدید ٹیکنالوجی میں کمپیوٹر کا نیٹ ورک ہر شعبہ زندگی میں کار فرما دکھائی دے رہا ہے۔ والدین چاہتے ہیں کہ اُن کے بچے نرسری ہی سے کمپیوٹر کی تعلیم بھی حاصل کریں۔ لہٰذا پرائیویٹ سکولوں، کالجوں کی سطح پر کمپیوٹر تعلیم کے انتظامات تو کافی حد تک بہتر ہیں جب کہ حکومتی سطح پر بھی عمل درآمد جاری ہے۔ نیز آج کل کمپیوٹر اکیڈمیز جگہ جگہ کھلی ہوئی ہیں، جس سے لڑکے اور لڑکیاں استفادہ کر رہے ہیں۔ الغرض کمپیوٹر کی وجہ سے دنیا گلوبل ویلج بن کر رہ گئی ہے۔ خاص طور پر انٹرنیٹ پر چیٹنگ تو عروج پر ہے، جس کے پاس کمپیوٹر ہے وہ اس کا استعمال بھی خوب کر رہا ہے، جس وجہ سے ہماری زندگیوں پر مثبت اثرات کم بلکہ منفی رجحانات زیادہ بڑھتے جا رہے ہیں۔

آج کے دور میں ٹیکنالوجی کا نشہ بھی مضر صحت قرار دیا جا رہا ہے، کیوں کہ روز بروز بدلتی ٹیکنالوجی نے ایسے خدشات کو جنم دیا ہے کہ ٹیکنالوجی بھی ایک نشہ کی صورت اختیار کرتی جا رہی ہے، جس نے لوگوں کی زندگیوں کو مشکل بنا دیا ہے۔ ٹیکنالوجی کی بھرمار خصوصاً ساتھ لے کر چلنے والے آلات نے ایسی صورت حال کو جنم دیا، جس میں لوگوں کی ذاتی اور سماجی زندگی متاثر ہو رہی ہے۔ لہٰذا سوئٹزرلینڈ میں ہونے والی ایک ٹیکنالوجی کانفرنس میں اس معاملے پر غور کیا گیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ نت نئی ٹیکنالوجی نے لوگوں کی زندگیوں کو زیادہ آسان اور آپس میں روابط کر بڑھایا ہے۔ نارتھمپٹن بزنس سکول کے پروفیسر نادا کا کبدس کا خیال ہے کہ ایسی ٹیکنالوجی جو ہر وقت آپ پر اطلاعات کی بوچھاڑ کرتی رہتی ہے، اُس نے لوگوں کی فیصلہ کرنے کی قوت کو متاثر کیا ہے، جب کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ انفارمیشن ٹیکنالوجی کے سیلاب میں لوگوں کو معلومات تک رسائی پہلے کی نسبت بہت آسان ہو گئی ہے اور وہ اچھا فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں ہوتے ہیں۔

پروفیسر نادا کا کبدس کا خیال ہے کہ جدید آلات کو بیڈ روم، سنیما گھر، تھیٹر اور ڈنر پارٹی میں ساتھ لے جانا اس نشے کی نشاندہی کرتا ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ انسان کی کسی بھی طرح کے حالات میں اپنے آپ کو ایڈجسٹ کرنے کی صلاحیت نے انفارمیشن ٹیکنالوجی کے آداب وضع کرنے شروع کر دیے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص کسی کو ایس ایم ایس پیغام بھیجے اور اس کا فوراً جواب نہ دیا جائے تو اسے بُرا تصور کیا جاتا ہے جب کہ ای میل کا جواب دو دن کے اندر قابل قبول تصور کیا جاتا ہے، ماہرین کا کہنا ہے کہ انسان اپنی ترجیحات مقرر کرے۔

بہر کیف عام طور پر انٹرنیٹ کو جنس، رنگ، نسل، مذاہب کی تفریق اور جغرافیائی بندشوں سے بے نیاز دور جدید کا معلومات، رابطہ اظہار رائے اور تفریح وغیرہ کا عوامی اور سہل ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔

انٹرنیٹ پر چیٹنگ، ای میل، آن لائن فورمز، بلاگز وغیرہ جیسے بے تعصبانہ مواصلاتی ذرائع کی موجودگی، سائبر سپیس کا معاشرے میں رائج سماجی اور تہذیبی امتیازی اقدار سے بالاتر ہونا ایک ایسی ورچول دُنیا کا تصور پیش کرتا ہے جہاں جنسی مساوات کی گنجائش روایتی دنیا سے زیادہ ہے۔ لیکن کیا پاکستان میں انٹرنیٹ سے منسلک فوائد اور سہولتوں سے مرداور عورتیں، یکساں مستفید ہو رہے ہیں یا پھر انٹرنیٹ سے وابستہ جنسی مساوات کا تصور فرضی ہے؟ اس حوالے سے ہم نے مختلف شعبہ فکر سے تعلق رکھنے والی طالبات اور دیگر خواتین کے خیالات جاننے کی کوشش کی:

ڈاکٹر عالیہ تالپور سے جب یہ سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ انٹرنیٹ تو ضرورت بنتا جا رہا ہے۔ اس لئے میں کہتی ہوں کہ آپ کو اپنے شعبے سے معلومات کے علاوہ پوری دنیا سے رابطے میں رکھنے والا یہ جن ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے اثرات ہم کیا لیتے ہیں، کسی بھی میڈیا کو جیسے چاہیں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اپنے اردگرد کے ماحول سے آگاہ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ آپ اچھائی کو چھوڑ کر برائی کی طرف راغب ہو جائیں، کیوں کہ کسی بھی میڈیا کا کام آپ کو دونوں پہلوؤں کے متعلق معلومات دینی ہے۔ اب یہ ہم سب کی ذمہ داری ہے کہ مثبت حوالوں کو سامنے رکھا جائے اور اسی کی آگہی کو پھیلایا جائے۔ ہاں البتہ یہ نہیں ہونا چاہئے کہ نیٹ پر بیٹھ کر صرف دوستیاں نبھائی جائیں، کیوں کہ اس طرح اپنی صلاحیتوں کو ضائع کرنے والی بات ہے۔

عاصمہ محمود کمپیوٹر سائنس کی طالبہ ہونے کے ساتھ ساتھ صحافی کے طور پر خدمات بھی انجام دیتی ہیں۔ ان کو سپورٹس خصوصاً بیڈمنٹن کا شوق جنون کی حد تک ہے۔ اس لئے دفتری اوقات میں بھی وقتاً فوقتاً دیگر سپورٹس ویب سائٹس دیکھتی رہتی ہیں۔ عاصمہ کا کہنا ہے کہ موجودہ دور میں ٹیکنالوجی کا برق رفتاری کی طرح پھیلتے چلے جانا کسی شعبدہ سے کم نہیں کیوں کہ اتنی تیزی سے ایجادات کا عمل روز بروز بڑھتا جا رہا ہے کہ انسانی عقل بھی حیرت میں ہے۔ بہرکیف میں انٹرنیٹ سے جہاں دنیا جہاں کی معلومات سے استفادہ کرتی اور اپنے شوق کو بھی تکمیل دیتی ہوں۔

ان کے برعکس رخشندہ ذیشان جو کہ خاتون خانہ ہیں اور شادی کے بعد کراچی سے جا کر جدہ میں رہائش پذیر ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ جلد شادی ہو جانے کی وجہ سے اپنی بی اے کی تعلیم تو مکمل نہیں کر پائی مگر انٹرنیٹ سے صحت اور غذا کے متعلق معلومات اکٹھی کرنے کی وجہ سے وہ اپنے خاندان میں بطور عالم الغذا پہچان رکھتی ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ صحت، ورزش، کھانے پکانے اور غذا کی ویب سائٹس کے علاوہ میں اردو شاعری اور دینی ویب سائنس بھی دیکھتی ہوں اور وائس چیٹ کے ذریعے عزیز و اقارب سے بھی رابطہ رہتا ہے۔ مجھے انٹرنیٹ پر خبروں کے علاوہ باقی سب چیزیں پڑھنے کا شوق ہے۔ شادی سے پہلے میں نے کمپیوٹر کبھی استعمال نہیں کیا تھا۔ تب تو کمپیوٹر مانیٹر اور اصل کمپیوٹر کے درمیان فرق بھی معلوم نہیں تھا، پر اب تو یہ حال ہے کہ انٹرنیٹ کے بغیر اکیلا پن لگتا ہے۔

ڈاکٹر سیدہ کنیز عابدی اپنے پیشے کے ساتھ ساتھ فلاحی سرگرمیوں سے بھی منسلک ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ ہمیشہ زندگی میں وقت کے ساتھ ساتھ خداوند عالم

ہماری ضروریات کے تحت نعمتوں میں اضافہ فرماتا جاتا ہے۔ یہ انسان پر منحصر ہے کہ وہ اُن نعمتوں کا شکرادا کریں یا کفران نعمت کریں اور سب کو یہ جاننا ضروری ہے کہ نعمتوں کا شکر اُن نعمتوں کا ٹھیک ٹھیک استعمال کرنا ہے، اُن سے فائدہ اُٹھانا ہے اور اپنی زندگی کو بہتر سے بہتر کرنا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے معاشرے کے وہ لوگ جنہوں نے نسل در نسل یہ کام کرنا تھا انہوں نے اپنی ذمہ داری کا ثبوت نہیں دیا۔ کمپیوٹر باقی تمام وسائل زندگی میں سے ایک بہترین وسیلہ ہے معلومات حاصل کرنے کا اور دوسروں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کا۔ جس طرح ، اخبار کتابیں، استاد وغیرہ معلومات حاصل کرنے کا وسیلہ ہیں اور جس طرح ریڑھی، تانگہ، گاڑی اور پھر ہوائی جہاز لوگوں کو ایک دوسرے سے تعلقات قائم کرنے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کا وسیلہ ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ کمپیوٹر اس زمانے کی تیز ترین مشین ہے اور اس وقت اپنی نوعیت کے لحاظ سے بہترین اور تیز ترین انداز میں کام کر رہی ہے۔ مثلاً کسی زمانے میں ایک خط کہیں پہنچتے ہوئے عرصہ درکار ہونے کے ساتھ کتنی مشقت اور کتنے ہاتھوں سے گزرنے کے بعد ملا کرتا تھا یا وہ عرصہ دراز کے بعد لاپتا ہو جاتا تھا اور بعض اوقات سالہا سال تک بھیجنے اور موصول کرنے والا بے خبر ہوتا تھا لیکن اس وقت اگر آپ دیکھیں کہ ایک ای میل کرتے ہوئے چند سیکنڈ لگتے ہیں اور ساتھ ہی اگر دوسرا آدمی بھی کمپیوٹر پر چاہے وہ دنیا کے کسی بھی حصے میں بیٹھا ہوا سی لمحے آپ کو بتا دے گا کہ اسے آپ کی ای میل مل گئی ہے یا نہیں۔ جس طرح دنیا میں ہزاروں نعمتیں بکھری ہوئی ہیں جسے جو چاہے وہ مل جاتا ہے اسی طرح کمپیوٹر بھی صرف ایک وسیلہ ہے جو بہت سے کاموں میں آپ کی مدد کرتا ہے۔ رہا یہ سوال کہ کمپیوٹر کا غلط استعمال ہوتا ہے تو میں واضح کر دوں کہ کچھ لوگ خاص طور پر ایک مخصوص طبقہ فکر جنہوں نے قسم کھا رکھی ہے کہ لوگوں کو صرف گمراہ کرنا ہے اور ہر چیز سے ڈرائے رکھنا ہے۔ جب کہ دیکھا جائے تو انگور سے شراب بھی بنتی ہے، اس لئے اس کو کاشت نہ کیا جائے، نہیں ایسا نہیں ہے بلکہ ہمیں شعور آگہی اتنی ہونی چاہئے کہ منفی اور مثبت کا تعین کر سکیں۔

صدف وفا علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کی طالبہ ہیں اور ایک سکول ٹیچر بھی ہیں۔ انھوں نے انٹرنیٹ کے حوالے سے اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مجھے سکول کے زمانے سے ہی کمپیوٹر سیکھنے کا شوق تھا۔ جب سکول میں کمپیوٹر سیکشن کی کلاسز شروع ہوئی تو میں نے اپنے والدین سے اصرار کر کے خصوصی طور پر کمپیوٹر سیکھنے کی اجازت حاصل کی ۔ پہلے پہل تو اجازت لینے میں خاصی دشواری آئی۔ وہ ہی معمول کی باتیں سننی پڑیں کہ اتنا کچھ کر کے کیا کرنا ہے بس گریجویشن مکمل کر کے پڑھائی ختم کر دو، بہرحال اب جب کہ میں نے کمپیوٹر سیکھا، پہلے پہل تو عام گیمز وغیرہ اور سہیلیوں سے چیٹنگ کرتی تھی مگر اسی انٹرنیٹ سے اب میں اپنی تعلیم کے متعلق بھی استفادہ کر رہی ہوں، میرے خیال میں کمپیوٹر کی تعلیم نرسری سے ہی پرائیویٹ اور گورنمنٹ کے اداروں میں لازمی ہونی چاہئے اور لڑکیوں کو ضرور کمپیوٹر سیکھنا چاہئے کیوں کہ یہ موجودہ دور کی ضرورت بنتا جا رہا ہے۔

مطمینہ سید جو ایم اے اردو کی طالبہ ہیں۔ انہوں نے اظہار خیال کرتے کہا کہ انٹرنیٹ آج

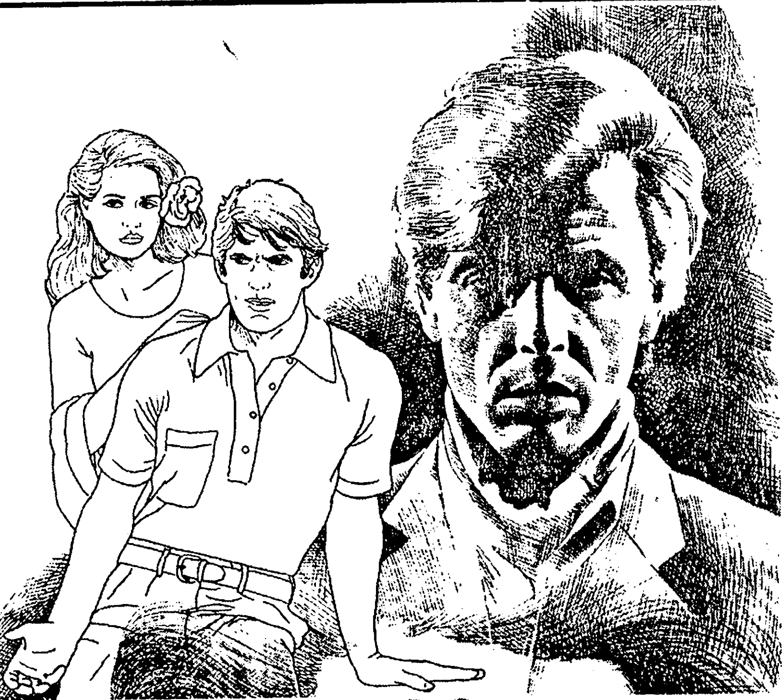
پہیلی

میرا ذہن یہ پہیلی حل نہیں کر پاتا کہ ہمارے کرنے کا سب سے اہم کام کیا ہے؟

معاشرے نے ہمارے لیے بہت ہی غیر ضروری فرائض متعین کر رکھے ہیں جن کا بظاہر کوئی فائدہ نظر نہیں آتا، اور ہم یہ کام انجام دیئے جا رہے ہیں، وقت ضائع کرتے جا رہے ہیں یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہماری ذہنیت، قابلیت، فطرت اور طاقت مسلسل غیر ضروری عوامل کا شکار ہو رہی ہے۔

(مرسلہ: عامر اسد۔ لاہور)

کے دور کی اہم ترین ضروریات میں سے ایک ہے۔ ایک ہی سیکنڈ میں ہمیں ایک ہی موضوع پر ہزاروں ویب سائٹس دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ اس طرح انٹرنیٹ نہ صرف معلومات کا بہت بڑا خزانہ ہے بلکہ ہم بہت ہی تھوڑے وقت میں بہت زیادہ معلومات اکٹھی کر سکتے ہیں۔ دنیا کے بہت بڑے بڑے محققین، ڈاکٹرز اور پروفیسر وغیرہ سے رابطہ کر سکتے ہیں اور بہت موثر انداز میں پہنچا سکتے ہیں۔ لوگوں کے نظریات جان سکتے ہیں اور ایسی ایسی انفارمیشن صرف چند ہی منٹوں میں حاصل کر سکتے ہیں کہ اگر انٹرنیٹ نہ ہوتو یا تو ہمیں کبھی پتا نہ چلے یا پھر ہمیں کتنی ہی لائبریریاں چھاننی پڑیں یا کتنے ہی ممالک میں بذات خود جانا پڑے۔ ای میل اور چیٹنگ تو انٹرنیٹ کا بہت چھوٹا سا استعمال ہیں، لیکن اس کے باوجود اہم ہیں۔ جو خطوط ہفتوں یا مہینوں کے بعد کہیں جا کر ملا کرتے تھے اب ایک سیکنڈ میں مل جاتے ہیں۔ آپ اپنے دوستوں کو دنیا کی کسی بھی جگہ پر ایک سے ایک Greeting Card بھیج سکتے ہیں۔ چیٹنگ بھی اتنی بُری چیز نہیں، جتنا اس کو بنا لیا گیا ہے اور اس کے بارے میں زیادہ تر غلط فہمی ان لوگوں کے ذہنوں میں پائی جاتی ہے جو کمپیوٹر کے استعمال سے ناواقف ہیں۔ جہاں تک انٹرنیٹ پر لڑکے لڑکیوں کی دوستی کا سوال ہے تو پہلی بات تو یہ ہے کہ دوستی کا معیار اچھائی اور خلوص ہے نہ یہ کہ لڑکا یا لڑکی ہونا۔ اگر کوئی لڑکا برا ہے تو نہ صرف لڑکیوں کو بلکہ لڑکوں کو بھی اس سے اجتناب کرنا چاہیے اور اگر کوئی اچھا اور قابل ہے تو اس کے خیالات سے سب کو فائدہ اٹھانا چاہئے۔ یہ قید لگائے بغیر کہ وہ لڑکا ہے یا لڑکی۔ آخر انٹرنیٹ کے ذریعے ہی کتنے پاکستانی لڑکوں غیر ملکی اور غیر مسلم لڑکیوں کو مسلمان بھی کیا گیا ہے اور اچھے بُرے لوگ تو ہر شعبہ میں پائے جاتے ہیں، اب اگر کوئی انٹرنیٹ کے تمام فوائد کو جو کہ نقصانات سے کہیں زیادہ ہیں، نظر انداز کر کے اس کا غلط استعمال کر رہا ہے، ہیکنگ کر رہا ہے، کریکنگ کر رہا ہے یا چیٹنگ کی بجائے چی ٹنگ کر رہا ہے تو اس میں انٹرنیٹ کا کیا قصور ہے؟ اچھی چیزوں کا بُرا استعمال ہر دور میں رہا ہے اور اس کے ذمہ دار غلط لوگ ہوتے ہیں وہ چیزیں نہیں۔ رہا والدین کی ذمہ داری کا سوال تو ماں باپ کو خود بھی کمپیوٹر سیکھنا چاہئے تا کہ بچے انہیں بے وقوف نہ بنا سکیں اور دوسری بات یہ کہ ہر وقت بچوں پر جاسوسوں کی طرح نظر رکھنے کے بجائے شروع سے اُن کی ایسی تربیت کریں کہ وہ غلط چیزوں کی طرف مائل ہی نہ ہوں۔



دل کے بونے

نائلہ بلیغ الرحمان

رشنا نے ایک نظر شوہر کی طرف دیکھا اور ایک نظر عماذ کی طرف۔ دونوں کی نظروں میں ایسا کچھ تھا جو دائم کو بہت کچھ سمجھا گیا تھا۔ وہ ایسی نظروں کو خوب پہچانتا تھا۔ لو میری بھی مت ماری گئی ہے رشنا میں تو بھول ہی گیا تھا' آج میرا دوست آ رہا ہے مجھے ملنے میں تو تم لوگوں کے ساتھ جا نہ سکوں گا۔

ایک شخص کی کہانی جو اپنے پیاروں کی خوشیوں میں رکاوٹ تھا

دکان بند کر کے وہ گھر پہنچا تو کافی تھک چکا تھا' صبح سے دکان پر جو بیٹھا تھا۔ رات کے گیارہ تو بج ہی جاتے تھے۔ اس کا رخ باورچی خانے کی طرف تھا مگر ہر چیز کا شاید صفایا ہو چکا تھا۔ اس نے چولہے پر دھری دیگچی کا ڈھکن اُٹھا کر دیکھا' دیگچی میں ایک آلو اور بالکل تھوڑا سا شوربہ پڑا تھا اور ہاٹ پاٹ میں آدھی روٹی کا ٹکڑا رکھا تھا۔ بھوک بھی زوروں پر تھی باورچی خانے میں اس کی کھٹ پٹ نے شاید بھابی کو جگا دیا تھا کیونکہ باورچی خانے کے دروازے پر بھابی کی بڑی بیٹی کھڑی تھی۔ وہ اپنی ماں کا پیغام لے

کے آئی تھی۔

چاچو امی کہہ رہی ہیں آج میری طبیعت خراب ہے اگر کچھ کھانا ہے تو بازار سے جا کر لے آؤ۔

اور بازار جانے کا مطلب وہ خوب سمجھ رہا تھا ایک نئی لسٹ اس کے لیے تیار ہوتی اور فرمائشی پروگرام شروع ہو جاتا۔ آج وہ بھی ضد میں آ گیا۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے بھلا' اس نے سوچا اور بازار نہ جانے کا پکا ارادہ کرتے ہوئے وہی آدھی روٹی اور سالن کھا کے باروچی خانے سے باہر نکل آیا۔ بھابی کی بیٹی ماورا نے حیرانی سے اسے دیکھا اور پھر خاموشف سے باہر نکل آئی۔ وہ سوچ کے آئی تھی کہ چاچو اپنا کھانا لانے بازار جائے گا تو وہ بھی برگر یا شوارمے کی فرمائش کر دے گی۔

دائم اپنے کمرے میں جا چکا تھا۔ پورا گھر نیند میں ڈوبا تھا مگر دائم کی نیند جانے کہاں کھو چکی تھی۔ وہ کروٹیں بدل کر سونے کی کوشش کرتا رہا مگر نیند تو جیسے اس کی آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔ رات کے جانے کون سے پہر اس کی آنکھ لگی تھی۔ دائم اس گھرانے کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا اس سے بڑے دو بھائی تھے دونوں شادی شدہ تھے اور اپنی اپنی زندگیوں میں مصروف تھے۔ دو بہنیں تھیں وہ اپنے سسرال میں تھیں۔ ایک دائم ہی تھا جسے زندگی روز ایک نیا سبق سکھا رہی تھی۔ اسکی بدقسمتی یہ تھی کہ وہ اپنے دوسرے بہن بھائیوں کی طرح نہ تھا۔ تمام بہن بھائی دراز قد تھے جبکہ دائم ساڑھے تین فٹ کا تھا۔ عام لفظوں میں اس جیسے لوگوں کو بونا بولا جاتا ہے۔ ان لوگوں کو دنیا کی تمسخرانہ نگاہوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ہر طرح کے مذاق سہنے پڑتے ہیں۔ دائم بھی یہ سب کچھ سہہ رہا تھا۔ وہ تو شکر ہے باپ نے اسے کریانہ کی چھوٹی سی دکان کھول دی تھی۔ دائم کی محنت نے اسے چھوٹی سی دکان سے ایک اچھا خاصا سٹور بنا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ گھر میں اسکی تھوڑی بہت عزت تھی۔ سب اس سے اپنے اپنے مطلب نکال رہے تھے۔ بھابیوں کا جب کھانا بنانے کا دل نہ کرتا وہ اپنے اپنے بچوں کو دائم کے سر پر سوار کروادیتیں پھر دائم چاچو سے طرح طرح کی فرمائشیں کی جاتیں۔ پیزا' برگر' شوارما اور جانے کیا کچھ فرمائشیں کی جاتیں اور جب دائم کی کبھی طبیعت خراب ہوتی وہ ماورا کو بلاتا۔

ماورا بچے میرا سوٹ استری کردو گی؟ منہ میں بڑبڑاتی وہ دائم سے سوٹ پکڑ لیتی اور استری بھی کر دیتی مگر اگلے دن اسے بھابی کا شکوہ ملتا' دائم کل ماورا کا ٹیسٹ تھا تم نے اپنے کپڑے دے دیئے اسے استری کرنے کو کچھ تو خیال کیا ہوتا۔

اب دائم نے نہ صرف ماورا بلکہ دونوں بھائیوں کے بچوں کو کچھ بھی کہنا چھوڑ دیا تھا۔ مگر وہ لوگ اپنی اپنی فرمائشیں کرنا نہیں بھولتے تھے۔ مہینے کے آخر میں دونوں بھائیوں کے ہاتھ اکثر تنگ ہو جاتے تو وہ بھی دائم کے سامنے آتے اور رونا روتے۔ دائم چپکے سے مطلوبہ رقم ان کے ہاتھ پر رکھ دیتا۔ بچوں کا ٹرپ ہے یا کوئی سکول فنکشن ماں باپ بچوں کو دائم کے سر منڈھ دیتے۔ دائم خوشی سے سب کرتا مگر بدلے میں اسے کیا ملتا؟ اکثر اوقات نہ اسے سالن ملتا اور نہ ہی روٹی نصیب ہوتی۔ بازار کا کھانا روز روز تو کھایا بھی نہ جاتا تھا۔ اور نہ ہی دائم کی ماں نے اپنی اولاد کو باہر کے کھانوں کا عادی کیا ہوا تھا۔ اکثر اوقات دائم بھوکا ہی سو جاتا۔ تب اسے ماں یاد آتی اپنا باپ یاد آتا۔ دونوں اسے بہت

پیار کرتے تھے۔ دوسری اولاد سے بڑھ کر پیارا تھا دائم ماں باپ کو' کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان کے بیٹے کو ساری زندگی اپنے قد کی وجہ سے لوگوں کے طرح طرح کے رویوں کو بھگتنا پڑے گا۔ بچپن تو جیسے تیسے گزر گیا تھا مگر اب جب کہ وہ عمر کی بتیس بہاریں دیکھ چکا تھا تو اسے سمجھ آیا کہ وہ تو اتنا بڑا خاندان والا ہو کے بھی اکیلا ہے۔ سب مطلبی تھے حتیٰ کہ اپنے سگے بہن بھائی بھی۔

☆☆☆☆☆☆☆

امینہ ابھی کام سے لوٹی تھی' گھر پہنچ کر اسے کھانے کو کچھ بھی نہ ملا' البتہ گھر میں ایک ہنگامہ ضرور برپا تھا۔ ہنگامہ کھانے کو لے کر ہی تھا۔ اس کا بیٹا عامر اور بیٹی رشما میں خوب جھگڑا ہوا تھا۔ بھائی کھانا مانگ رہا تھا۔ رشما بھلا کھانا کہاں سے لاتی اس نے روٹی تو بنائی تھی البتہ سالن کے نام پر خالی دہی کا رائتہ ہی بنایا تھا۔ گھر میں پکانے کو کچھ ہوتا تو بناتی۔ امینہ ایک فیکٹری میں شرٹس میں بٹن ٹانکنے کا کام کرتی تھی۔ اس سے اتنی آمدنی نہ ہوتی کہ گھر میں کچھ بہتری آ سکتی۔

امینہ نے بیٹے کو بہت سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ بھی بچہ تھا آج ضد کر ہی بیٹھا تھا۔ اب وہ بنا کچھ کھائے چارپائی پر لیٹ گیا تھا۔ امینہ کا دل اندر سے کٹ رہا تھا مگر ایک بیوہ عورت جس کی آمدنی بھی نہ ہونے کے برابر ہو وہ سوائے کڑھنے کے اور کر بھی کیا سکتی ہے۔

عامر جا بچے جا کر انڈا لے آ' میں آملیٹ بنا دیتی ہوں' مگر عامر اسی طرح آنکھیں موندے لیٹا رہا' اس نے ماں کو کوئی جواب نہ دیا تھا کیونکہ کل اس نے محلے کے دکاندار سے اچھی خاصی بے عزتی کروائی تھی۔ ماں نے کچھ سودا ادھار منگوایا تھا۔ مجھے تو معاف ہی کرو بھیا' سودا لے تو جاتے ہو مگر پیسے تمہارے گھر سے بڑی مشکل سے نکلتے ہیں۔ دکاندار نے جیسے اُس کے منہ پر تمانچہ مار دیا۔ عامر کے دوست ساتھ تھے اور بھی گاہک کھڑے تھے عامر کو شرمندگی نے گھیر لیا۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ آیندہ وہ کبھی بھی سودا ادھار نہیں مانگے گا۔ رشما نے صبر شکر کرتے کھانا کھایا' ماں کو کھلایا اور اب وہ ماں سے اجازت لے رہی تھی تاکہ وہ اپنی دوست کے گھر جا سکے۔ دوست کی ماں سلائی کڑھائی میں ماہر تھی اس کی دوست نے ہی اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ اس کے گھر آ کر اس کی ماں سے کچھ سلائی کرنا سیکھ لے تاکہ گھر کے حالات میں کچھ بہتری آ جائے۔

رشما نے چادر اوڑھی اور اکیلی ہی دوست کے گھر جانے کے لئے نکلی کیونکہ وہ جانتی تھی آج عامر کا موڈ خراب ہے وہ ہرگز اس کے ساتھ نہ جائے گا۔ دائم نے اسے دُور سے آتے دیکھا تو ایک گہرا سانس لیا وہ اسے اچھی لگتی تھی مگر وہ صرف سوچ سکتا تھا کچھ کر نہ سکتا تھا۔ وہ بھلا اس قابل کہاں کہ اس لڑکی کے خواب دیکھ سکے۔ وہ روزانہ اسی گلی سے گزرتی تھی۔ گو کہ وہ خوبصورتی کے پیمانے پر پورا تو نہ اُترتی تھی مگر اس میں کچھ ایسا تھا کہ وہ اسے پانے کی خواہش کرنے لگا تھا۔ وہ اس کی دکان سے گزر کے جا چکی تھی۔ دائم کا سٹور اچھا خاصا ترقی کر گیا تھا۔ وہ جانے کتنی دیر خیالوں میں گم رہا تب اسے اپنی دکان پر خالہ سکینہ آتی دکھائی دی۔ خالہ سکینہ رشتے وغیرہ کرواتی تھی۔

دائم بیٹا یہ پکڑو لسٹ اور ذرا کرسی ادھر کرو۔ اب اتنی ہمت نہیں ہے کہ بھاگ دوڑ کر سکوں' عمر کا تقاضا

ہے نا۔

ہاں خالہ یہ تو ہے۔ دائم نے رشا کے خیالوں سے باہر نکلتے ہوئے جواب دیا۔

ارے دائم تم کیا تمام عمر لنڈورے ہی پھرتے رہو گے' کچھ اپنے بارے میں بھی سوچا ہے تم نے؟ خالہ نے دائم کو شادی کا مشورہ دے ڈالا۔

واہ خالہ واہ کیسی بات کرتی ہو مجھ جیسے شخص کو بھلا کون اپنی بیٹی دے گا۔

کیوں نہ دے گا' تم کوئی انوکھے تو ہو نہیں یا صرف دنیا میں اک تم ہی ایسے پیدا ہوئے ہو؟ تم جیسے مردوں کی شادیاں بھی میں نے ہوتے دیکھی ہیں اور اولاد پیدا ہوتے بھی۔ لیکن تمہارے گھر والوں کو تو جیسے تمہاری پرواہ ہے ہی نہیں۔ پرواہ ہو بھی کیوں کمانے والا ہاتھ ہے نکل جائے گا ناں' بھلا کیوں کریں گے تمہاری شادی' سب جانتی ہوں۔ خالہ نے دائم کے دل کی بات کہہ دی تھی۔

تو خالہ اب میں کر بھی کیا سکتا ہوں' میرا مقدر جو ٹھہرا۔ دائم نے دکھی دل سے خالہ کو جواب دیا۔

مقدر جگانے کے لئے ہاتھ پیر ہلانے پڑتے ہیں' بیٹھے بیٹھے مقدر نہیں جاگا کرتے۔ کہو تو میں کہیں بات چلاؤں تمہاری؟ خالہ کو سچ میں دائم پر بہت ترس آ رہا تھا۔

دائم جانتا تھا کہ ٹھکرائے جانے کا عمل اس کو کہیں کا نہ چھوڑے گا اس نے خالہ کو کوئی جواب نہ دیا۔ مگر خالہ نے تو گویا ٹھان لیا تھا کہ دائم کا گھر بسا کے ہی چھوڑے گی۔ پھر ایسا ہوا کہ خالہ کو رشا کا خیال آیا' کھانے پینے کو ترستا خاندان غربت اور افلاس نے زندگی اجیرن بنا رکھی تھی۔ خالہ نے رشا کے گھر کی راہ لی۔

امینہ سوچ میں پڑ گئی۔ دائم کو دیکھتی تو دل انکار کر رہا تھا اپنے مسائل دیکھتی تو بیٹی راج کرتی نظر آ رہی تھی۔ دائم بہت اچھا سٹور چلا رہا تھا اب تو اس نے دو پلاٹ بھی لے رکھے تھے۔ زندگی میں کبھی خدانخواستہ برا وقت آن پڑے تو کام آ سکیں۔ امینہ کے لئے بہت مشکل گھڑی تھی وہ جانتی تھی کہ اس سیلن زدہ گھر میں جہاں کسی کو بٹھانے کے لئے بھی ڈھنگ کی جگہ نہ تھی کون اس کی بیٹی کو پوچھنے آئے گا۔ خالہ غور سے اس کی شکل کو دیکھ رہی تھی' تم سوچ لو اچھی طرح امینہ اب اتنی بھی مجھے جلدی نہیں ہے۔ اور ہاں استخارہ کر لو تو بہتر ہے' میں چلتی ہوں۔

خالہ تو جا چکی تھیں مگر امینہ کے لئے سوچوں کا در کھل گیا تھا۔ بیٹی کی خوبصورتی کو دیکھتی تو اسے رشا پر سراسر ظلم لگ رہا تھا۔ آخر اس نے بیٹی سے بات کرنے کا سوچا۔ رشا کے دل کو دھچکا سا لگا۔ وہ ماں کے منہ کی طرف دیکھتی رہی۔ امینہ ماں تھی بھلا بیٹی کے دل کا حال کیسے نہ جانتی۔

رشا میری بچی میں نے تو ویسے بات کی ہے تم سے میں تمہیں مجبور تو نہیں کرتی بیٹا' سب کچھ تمہاری مرضی سے ہوگا۔ میں تو اپنے گھر کے حالات کی وجہ سے کہہ رہی تھی۔ ہر ماں کا ارمان ہوتا ہے ناں اس کی بیٹی زندگی کا ہر سکھ حاصل کر سکے۔ میں جانتی ہوں تم خوبصورت ہو' پڑھی لکھی ہو' سگھڑ ہو مگر میری بچی غربت ایک ایسا عیب ہے جو ان تمام خوبیوں پر بھاری ہے۔ میں لاکھ کوشش کر لوں مگر ہمارے نصیبوں میں شاید بھوک اور افلاس ہی ہے۔ امینہ نے دل کا حال بیٹی کے سامنے کھول کے رکھ دیا۔ اب رشا سوچنے کے مراحل سے گزر رہی تھی۔ دائم کو اس نے دیکھ رکھا تھا۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ وہ انتہائی

شریف تھا۔ وہ ہر روز اس کی دکان کے سامنے سے گزرتی تھی رشا نے دائم میں کوئی اوچھی حرکت نہ دیکھی تھی اور دائم میں ہر خوبی موجود تھی حتیٰ کہ کھلا پیسہ بھی مگر اس کا قد ہی اس کی سب سے بڑی برائی تھا۔ وہ ایک بونا تھا کوئی بھلا اپنی بیٹی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں کیونکر دے سکتا تھا؟ امینہ نے دوبارہ رشا سے کوئی بات نہ کی تھی وہ اس پر دباؤ نہیں ڈالنا چاہ رہی تھی' یہ تمام عمر کا معاملہ تھا۔ خالہ نے بھی دائم کی دکان پر کوئی چکر نہ لگایا تھا۔ خالہ نے دائم کے دل میں اک امید کی جوت جگا دی تھی حالانکہ اس سے پہلے اس نے کبھی ایسا سوچا تو فوراً اپنے خیالات کو جھٹک دیا۔ وہ خوابوں میں رہنے والا انسان نہ تھا مگر اک امید کے لمحات کو سوچ رہا اور آہستہ آہستہ امید بھی دم توڑ گئی۔

رشا کے لئے کچھ رشتے اور بھی آئے مگر معاملہ وہ ہی تھا' کمانے والا ایک کھانے والے زیادہ' کوئی ڈھنگ کا رشتہ نہ آیا۔ اگر رشا کی خوبصورتی کو لے کر کوئی رشتہ آیا بھی یا تو رنڈوا ہوتا یا بڑی عمر کا دوسری شادی کا خواہش مند۔ رشا کی ماں کی پریشانی بڑھتی جارہی تھی۔ آج پھر کچھ لوگ اسے دیکھنے آرہے تھے پیسہ نہ ہونے کے باوجود امینہ نے ادھار پکڑ کے کھانے کی تیاری کی تاکہ آنے والے خالی چائے پانی کو دیکھ کر ناک منہ نہ چڑھائیں مگر ہوا وہی۔ لوگ آئے کھایا پیا ڈکار مارا اور عجیب وغریب نظروں سے کمرے کے چاروں اطراف نظریں دوڑائیں۔ گھر کی خستہ حالی کا اندازہ انہیں اندر داخل ہوتے ہی ہوگیا تھا اور سوچ کر جواب دیں گے کہتے ہوئے نکل گئے۔ امینہ نے تو ان کی نظروں سے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ معاملہ آگے بڑھنے کا نہیں ہے۔ اس کا دل بھر آیا وہ غریب ہے بیوہ ہے تو بھلا اس میں اس کا کیا قصور۔ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں میرے مالک' میری بیٹی کے نصیب بھی کھول دے' بس رب میں تجھ سے یہی مانگوں گی۔ وہ رو رہی تھی رشا جانتی تھی ماں کس اذیت سے گزر رہی ہے۔ بھائی کا داخلہ نہ ہو پا رہا تھا کتابوں اور فیسوں کے لئے رقم کہاں سے آتی؟۔

بس پھر اچانک ہی اس نے فیصلہ کرلیا' دائم سے شادی کا فیصلہ۔ امینہ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی' وہ سمجھ نہ پا رہی تھی کہ یہ اچانک رشا کو ہوا کیا ہے؟۔ خالہ نے دائم کو مطلع کردیا تھا پہلے تو کافی دیر وہ حیرانی سے خالہ کو تکتا رہا۔

اے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو بٹر بٹر' اپنے گھر میں بتا دینا آخر کو ہاتھ مانگنے تو گھر والوں نے ہی جانا ہے ناں۔

دائم کا گھر میں اپنی شادی کا ذکر کرنا اور رشا کے گھر جانے کا یہ اعلان ایک دھماکہ ہی تھا۔

شادی دائم کی شادی یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے۔

دائم کی دولت اور دکان کے حق دار آنے والے تھے۔ انہوں نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ایسا ہوسکتا ہے۔ ان کے دماغ میں تھا کہ دائم کے پلاٹ اور دکان آخر ان کی اولادوں کی تو ہے مگر اب یہ سن کر انہیں اچھا نہ لگ رہا تھا۔ بھابیوں کے منہ سوج گئے تھے بھائی خاموش تھے۔

جب سارے کام بالا بالا ہی کر لئے تو بیوی بھی خود لے آتے' کسی سے صلاح مشورہ لینے کی ضرورت بھی محسوس نہ کی۔ دائم بڑے بھائی باپ برابر ہوتے ہیں۔ آخر بھابی نے دل کا غبار نکال ہی دیا۔

کیسی بات کرتی ہیں بھابی یہ تو خالہ نے کہا تو

میرے دماغ میں آیا۔ میں نے بھلا شادی کا کب سوچا تھا۔ یہ تو خالہ نے ہی بات چلائی تھی' میں نے تو سوچا بھی نہ تھا کہ وہ لوگ مان جائیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے گھر میں ذکر نہ کیا تاکہ سب کے سامنے تماشا نہ بن جاؤں۔ ایک دو دن تو سب گم سم ہی رہے لیکن کب تک' ایسا کرتے زمانے کا بھی خوف تھا سو خالہ کو ساتھ لئے رشا کے گھر پہنچ گئے۔

دائم نے خالہ کو کہہ دیا تھا کہ جہیز کے نام پر اسے کچھ بھی نہیں چاہئے سو امینہ نے جھٹ منگنی پٹ بیاہ میں دیر نہ کی اور رشا ایک ٹوٹے پھوٹے کچے پکے مکان سے ایک سہ منزلہ گھر میں آ گئی تھی۔ اچھا خاصا خوبصورت گھر تھا گھر میں زندگی کی ہر آسائش موجود تھی۔ دائم نے بری کے کپڑے زیورات رشا کی پسند کے بنوائے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ جانے کتنے ارمان تھے رشا کے جو وہ پورے نہ کر سکی تھی اور جب زیور کپڑے اسی نے پہننے ہیں تو پسند بھی تو اس کی ہونی چاہئے۔ بھابیوں نے اور بہنوں نے خوب لتے لئے وہ سب کی سنتا رہا مگر اس نے کی اپنے من کی تھی۔

اتنا کچھ ہونے کے باوجود رشا کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ خوش ہے کہ دکھی اس کے دل میں کوئی احساس کوئی خوبصورت جذبات کچھ بھی تو نہیں آ رہے تھے جو عموماً ہر لڑکی شادی سے پہلے سوچتی ہے۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ پتھر کی ہوگئی ہے جس پر کچھ بھی اثر نہیں ہوا۔ اس کے برعکس دائم کی خوشی سنبھالے نہ سنبھل رہی تھی۔ شادی اس کی من پسند لڑکی سے جو ہو رہی تھی اس نے اپنے رب سے خواہش کی تھی جو رب نے اس کی سن لی تھی۔ کچھ دن دلہاپے کے گزرے اور پھر وہ بھی زندگی کی روٹین میں شامل ہوگئی۔ ابھی تک سب کھانا پینا اکٹھا ہی چل رہا تھا' پہلے دائم پر سب کی نظریں ہوتی تھیں اب اس کی بیوی پر۔ باورچی خانے کا سارا کام اب اس نے سنبھال لیا تھا۔ ناشتہ' دوپہر کا کھانا' رات کا کانا دائم سب دیکھ رہا تھا مگر چپ تھا۔ رشا بھی شکایتیں لگانے والی نہ تھی۔

اب دائم کو وقت پر کھانا ملنے لگا تھا۔ کپڑے استری شدہ ملتے' رشا اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی پھر بھی دائم کو لگتا کہ کچھ صحیح نہیں ہے۔ رشا خوش تھی کہ ناخوش وہ سمجھ نہ پا رہا تھا۔ دائم کے محبت کے اظہار پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے چہرے کا احاطہ کرتی۔ اس نے کبھی کھل کر اپنی کسی خواہش کا اظہار نہ کیا تھا نہ کوئی شکوہ نہ شکایت نہ فرمائش۔ دائم کا دل چاہتا وہ بھی محبت کے اظہار پر اپنی محبت کا اظہار کرے کبھی وہ سوچتا کہ وہ میرے ساتھ خوش ہی تو ہے تو تبھی تو ساری ذمہ داریاں نبھا رہی ہے۔ ادھر رشا سوچتی کیا اس نے فیصلہ درست کیا ہے؟ وہ دونوں جہاں بھی کہیں جاتے سب کی حیرت زدہ نظروں کے حصار میں رہتے۔ رشا کو الجھن ہوتی' کچھ لوگ تو ان کو دو چار جملے بھی سنا دیتے تھے۔ اس نے دیکھا دائم کا رنگ ایک دم پھیکا پڑ جاتا۔ وہ کافی دیر تک خاموش رہتا۔ رشا کی خوبصورتی اور دائم کے قد کو لے کر لوگ مذاق اڑاتے تب رشا کو لگتا کہ اس نے غلط فیصلہ کیا ہے کیا وہ لالچ میں آ گئی تھی کیا اس نے اپنی زندگی کا سودا کیا تھا؟ اس نے کسی اور کا انتظار کیوں نہ کیا ہوسکتا ہے کوئی اور اس کے نصیب میں لکھا ہوتا۔

وقت گزرا دائم دیکھ رہا تھا کہ وہ صرف گھر کی ہو کر رہ گئی ہے۔ کام سمیٹتے اسے کافی رات ہو جاتی۔ جب وہ اپنے کمرے میں آتی تو تھک کے چور ہو چکی ہوتی وہ ایسا شاید جان بوجھ کر کر رہی تھی۔ اس کا چہرہ بے

تاثر ہی رہتا۔ کسی خوشی یا غم کا اظہار اس کے چہرے سے کبھی نہ ملتا۔ دونوں کو حیرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا لوگوں کی نظروں میں ایسا کچھ ہوتا کہ رشا کو شرمندگی محسوس ہونے لگتی۔ اس نے دائم کے ساتھ جانا کم کردیا تھا۔ اکثر دائم اسے باہر گھمانے لے جایا کرتا تھا مگر اب رشا نے کوئی نہ کوئی بہانا بنا کر اس کے ساتھ جانا چھوڑ دیا تھا۔ وہ صرف گھر کی ہو کر رہ گئی تھی۔ گھر کی ذمہ داریاں بھی رشا نے ساری کی ساری اپنے سر لے رکھی تھیں۔ دائم یہی سوچ کر چپ ہو جاتا رشا اپنی زندگی کی ہر خواہش کو سمیٹ رہی تھی۔ مادی خواہشات جن چیزوں کا وہ تصور بھی نہ کرسکتی تھی اسے اب میسر تھیں۔ دائم نے گھر میں کسی چیز کی کمی نہ ہونے دی تھی ان کی زندگی میں کسی چیز کی کمی نہ رہی تھی۔ اولاد تھی بیٹا بھی تھا بیٹی بھی اور کچھ عرصہ بعد انہوں نے اپنا گھر بھی بنالیا تھا۔ اپنے نئے گھر میں شفٹ بھی ہوگئے تھے۔ بیٹا اور بیٹی اچھے سکول میں پڑھ رہے تھے دائم انہیں خود سکول چھوڑ آتا اور لینے جاتا۔

وہ بھی عام دنوں کی طرح ایک دن تھا' رشا ناشتہ بنا رہی تھی بچوں کو سکول لے جانے کے لئے لنچ بکس تیار کر رہی تھی۔

مجھے آج سکول نہیں جانا دائم کو بیٹے کی آواز سنائی دی۔ دائم ابھی اپنے کمرے میں تھا پہلے وہ بچوں کو چھوڑتا تھا پھر گھر آ کر ناشتہ کرتا تیار ہوتا اور اپنے سٹور کے لئے گھر سے نکلتا۔

لیکن کیوں سکول نہیں جاؤ گے؟

رشا بیٹے سے پوچھ رہی تھی۔

نہیں جانا تو نہیں جانا۔ وہ منہ پھلائے بولا۔

یہ کیا بات ہوئی بھلا' چلو جلدی ناشتہ کرو تیاری کرو سکول جانے کی۔ کوئی ضرورت نہیں ہے چھٹی کرنے کی۔ رشا اسے ڈانٹ رہی تھی۔ بیٹا عماذ بڑا تھا کلاس سوئم کا طالب علم تھا اور بیٹی عنایہ چھوٹی تھی دوسری جماعت میں تھی۔

مما مجھے پتہ ہے بھیا سکول کیوں نہیں جا رہا۔ عنایہ ماں سے مخاطب ہوئی۔

کیوں؟ رشا نے بیٹی سے سوال کیا۔

وہ اس لئے کہ سارے بچے میرا اور بھیا کا مذاق اُڑاتے ہیں کہ تمہارے پاپا تو چھوٹے سے ہیں۔ عنایہ نے اپنی دونوں انگلیوں سے چھوٹے سے کا اشارہ کیا۔

بھیا نہیں جائیں گے تو میں بھی نہیں جاؤں گی۔ وہ منہ بسورے ماں سے کہہ رہی تھی۔

چھن چھن دائم کے اندر کچھ ٹوٹا تھا۔ تو کیا اب اس کی اولاد کو اس کی بدولت بہت کچھ جھیلنا ہے۔

ٹھیک ہے نہ جاؤ' دائم کو رشا کی آواز سنائی دی۔ وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ کیا رشا بچوں کو سمجھا نہیں سکتی؟ اگر وہ پیار سے بچوں کو سمجھاتی تو وہ آرام سے مان جاتے کیونکہ وہ ابھی چھوٹے ہیں ناسمجھ ہیں مگر رشا تو ناسمجھ نہیں ہے۔

وہ دُکھی ہو گیا تھا۔ پھر وہ اُٹھا تاکہ بچوں کو کسی رکشہ پر سکول بھجوا دے۔ اسے رشا کی خاموشی کھائے جا رہی تھی۔

بچے چپ چاپ ناشتہ کر رہے تھے۔ رشا میری طبیعت خراب ہے آج بچوں کو رکشہ پر تم چھوڑ آ ؤ میں آج آرام کروں گا۔ اپنی بات مکمل کر کے وہ واپس کمرے میں آ گیا۔ رشا بچوں کو سکول لے جا چکی تھی اور دائم سوچوں میں گم تھا۔ بچوں کو سکول وین لگوا دی گئی تھی۔

اس دن کے بعد دائم کبھی بچوں کے سکول نہیں گیا۔ جب بھی کبھی کوئی مسئلہ ہوتا رشا ہی سکول جاتی۔ رشا نہیں جانتی تھی کہ دائم نے بچوں کی گفتگو سن لی تھی مگر وہ اور بچے مطمئن تھے کہ اب دائم ان کو سکول چھوڑنے نہیں جا رہا تھا۔ مگر وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ دائم کے اندر کتنی ٹوٹ پھوٹ ہو رہی تھی۔ وہ بیوی بچوں والا ہو کر بھی خود کو اکیلا محسوس کر رہا تھا۔ وہ خود کو مجرم تصور کر رہا تھا کہ اس کی وجہ سے اس کے بچے مذاق کا نشانہ بنتے ہیں۔ کیا تمام عمر اس کی اولاد اسی طرح جگ ہنسائی کا شکار رہے گی؟۔ زندگی اس طرح گزر رہی تھی سب کچھ ہونے کے باوجود بھی وہ سب کے سب خالی تھے۔ جوں جوں رشا کی خواہشات پوری ہوتی جا رہی تھیں ویسے ہی وہ اپنی شادی کو لے کر پچھتا رہی تھی۔ جب وہ بھوکی تھی پانی سے روٹی کھاتی تھی ہر چیز کو ترستی تھی تب اسے دائم سے بڑھ کر کوئی نہ لگا تھا مگر اب وہ کیوں ناشکری کر رہی تھی۔ شاید اپنی اوقات سے بڑھ کر اسے مل گیا تھا۔ اب اسے دائم کا ساتھ بوجھ لگنے لگا تھا۔ نہ صرف رشا کو بلکہ بچوں کو بھی دائم کے ساتھ چلنا اچھا نہ لگتا تھا۔ وہ سب کوشش کرتے کہ دائم ان سے الگ ہی رہے تو اچھا ہے۔

دائم محسوس کر رہا تھا وہ اپنے خول میں سمٹ کر رہ گیا تھا۔ جہاں سب کا جانا ضروری ہوتا تو وہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر گھر رہ جاتا اور بیوی بچوں کو جانے کا کہہ دیتا۔ ایسے میں وہ دُکھی ہو جاتا۔ رشا کی تو اور بات تھی مگر بچے تو اس کے اپنے تھے اس کا خون تھے۔ زندگی گزرتی جا رہی تھی مگر بے رنگ اور بے ڈھنگی۔ وقت کی چال جو بھی ہو وقت گزر ہی جاتا ہے عماذ اور عنایہ اب بڑی کلاسز میں آ گئے تھے۔ عماذ کی سالگرہ کا دن تھا وہ ماں سے باہر جانے کی ضد کر رہا تھا جبکہ رشا اسے گھر میں سالگرہ کا فنکشن کرنے کا کہہ رہی تھی۔

نہیں مما اس بار میں ہرگز گھر میں اپنی سالگرہ نہیں مناؤں گا۔ یاد ہے ناں پچھلے سال سب دوست پاپا کو کیسے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ گھر میں سالگرہ ہوگی تو پاپا بھی ضرور موجود ہوں گے اور مجھے اچھا نہیں لگتا کہ پاپا کی وجہ سے میں دوستوں میں شرمندگی محسوس کروں۔

ایک تیر تھا جو بیٹے کی طرف سے باپ پر پھینکا گیا تھا عماذ کے ایک جملے نے دائم کی روح تک کو چھلنی کر دیا تھا۔ رشا...... دائم نے اندر کمرے میں آ کر بیوی کو پکارا۔ تم لوگ بار بار کیوں دہراتے ہو کہ میرا وجود تمہاری خوشیوں کی راہ میں رکاوٹ ہے زندگی میں میں کب تم لوگوں کے ساتھ ہوں؟ جواب دو؟ میں سب جانتا ہوں تم لوگ میری وجہ سے زندگی کو انجوائے نہیں کر پا رہے۔ مگر کیا ضروری ہے تم بار بار ایک ہی بات کو لے کر میری روح کو زخمی کرتے رہو؟۔

جاؤ عماذ میری طرف سے اجازت ہے دوستوں کے ساتھ ملکر جہاں مرضی جاؤ جو مرضی کرو۔ دائم نے جیب سے پیسے نکالے اور بیٹے کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

دونوں ماں بیٹا چپ تھے۔ وہ بھلا دائم کو کیا جواب دیتے۔ دائم جا چکا تھا۔ عماذ نے کندھے اچکائے' ماں کی طرف مسکرا کے دیکھا اور باہر نکل گیا۔ باپ کا دل دکھایا گیا تھا نہ کوئی سوری نہ کوئی شرمندگی۔ آج کا دن دائم بیٹے کیساتھ بہت اچھی طرح منانا چاہتا تھا۔ دو دن پہلے ہی اس نے سوچ لیا

تھا کہ وہ عماذ کی سالگرہ پر کیا کرے گا' اسے کیا گفٹ دے گا؟ اور اسے عماذ کی پیدائش سے لے کر اب تک کی ہر ہر بات یاد آ رہی تھی۔ وہ بہت خوش تھا مگر آج اس کی خوشی دم توڑ گئی تھی۔ عماذ کے لئے خریدا گیا گفٹ اس نے الماری میں بند کر کے رکھ دیا تھا۔

آج اس کا جی بھر کر رونے کا دل کر رہا تھا۔

رشا حسب عادت باورچی خانے میں مصروف ہوگئی تھی۔ عماذ جا چکا تھا گھر میں گہری خاموشی تھی۔ وقت اور کھسکا عنایہ خوبصورتی میں بالکل ماں پر گئی تھی وہ جہاں جاتی سب کی نگاہوں کا مرکز بن جاتی۔ ابھی اس کی تعلیم بھی مکمل نہیں ہوئی تھی کہ روز کوئی نہ کوئی رشتہ آ جاتا۔ مگر اب کی بار جو رشتہ آیا وہ رشا گنوانا نہیں چاہتی تھی۔ ماں باپ کا اکلوتا بیٹا اور کافی جائیداد کا وارث۔ اللہ تعالیٰ نے عنایہ پر اپنی خاص رحمت کی تھی اور صرف پڑھائی کو لے کر رشا یہ رشتہ گنوانا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے دائم سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ اس نے بھلا کیا کہنا تھا' یوں اتوار کے دن ان لوگوں کو گھر بلایا گیا تا کہ وہ لوگ بھی گھر بار

قیمتی مسکراہٹ

چھوٹے چھوٹے بچے ابھی بات کرنا نہیں سیکھتے لیکن جب ان کی طرف دیکھو اور وہ اگر مسکرا دیں تو کتنے اچھے لگتے ہیں۔ جوانی کی بات یہ ہے کہ اس خاص دور میں انسان کی طبیعت میں رومانس کوٹ کوٹ کر بھر جاتا ہے۔ جو اچھا لگے وہ مسکرا دے تو: ''تمہاری مسکراہٹ کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے'' والا معاملہ ہو جاتا ہے۔

جب زندگی میں ''گم'' ہو جاتے ہیں تو مصنوعی مسکراہٹوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ بینک میں جاتے ہیں اور اگر نوٹ نئے لینے ہوں تو کیشیئر کو اپنے بتیس دانت دکھا کر اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہیں۔ ایئر ٹکٹ اگر چانس پر مل رہا ہو تو بہترین مسکراہٹ سے کنفرم ٹکٹ کی التجا کرتے ہیں۔ دفتر میں کوئی ایم این اے یا ایم پی اے آ کر دھمکانے لگے تو جواب میں مسکراہٹ کی ڈھال ہی کی پناہ لیتے ہیں۔

مسلسل مصنوعی مسکراہٹوں میں زندگی گزار کر مسکراہٹ کے اصل روپ سے ناآشنا ہو جاتے ہیں۔ آخر پھر ایک زمانہ آتا ہے کہ آپ بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ کاروبار سے چھٹی۔ سروس سے ریٹائر۔ دوست کچھ مر کھپ جاتے ہیں اور باقی یا بیمار یا اپنی اپنی بپتا میں اُلجھے ہوئے دُور دُور ہو جاتے ہیں۔

یادوں کی دنیا کے صحرا میں ایک بھٹکے ہوئے مسافر کی طرح کھوئے ہوئے جب تلخی بڑھ جاتی ہے تو وہ چھوٹا سا معصوم بچہ جو ابھی بولنا بھی نہیں سیکھا تھا اور اس کی مسکراہٹ سے آپ جھوم جاتے تھے اب جوان ہو چکا ہے۔ بچوں والا ہے۔

آپ اپنے کمرے میں بند ہیں۔ دنیا سے تقریباً کٹ چکے ہیں۔ مطلبی لوگ چھوڑ چکے ہیں۔ رشتے داروں کے لیے اب آپ کی کوئی وقعت نہیں۔

تو دروازہ پر دستک ہوتی ہے اور آپ کا وہ بچہ جو اب خود باپ یا ماں بن چکا ہے وہ ایک سچی مسکراہٹ کے ساتھ کمرے میں داخل ہوتا ہے تو...... اس مسکراہٹ کا مزہ وہی جان سکتے ہیں جو ریٹائر ہو چکے ہوں۔ بوڑھے ہو چکے ہوں۔ مطلبی دنیا سے چھٹکارا پا چکے ہوں۔

(مرسلہ: زاہد نواز۔ ملتان)

دیکھ لیں۔ رشا نے کھانے کا اچھا خاصا اہتمام کیا ہوا تھا عنایہ بھی دل سے تیار ہوئی تھی ہلکے پھلکے میک اپ میں وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ گھر کو خوب سیٹ کیا گیا تھا۔ مہمان آئے دائم اور رشا نے کسی چیز میں کوئی کمی نہ رہنے دی تھی۔ مہمان یہ کہہ کر چلے گئے کہ آپ کو جلد جواب دیں گے۔ اور رشا سوچ رہی تھی کہ جب انہیں عنایہ اتنی پسند ہے تو اب مہلت کس بات کی۔ خیر ادھر سے جواب آنے کا انتظار ہونے لگا۔

انتظار طویل ہوتا گیا آخر جب دونوں میاں بیوی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا تو انہوں نے لڑکے کے گھر فون کیا۔ اتنی چاہ سے مانگا گیا رشتہ انہوں نے یہ کہہ کر ٹھکرا دیا تھا کہ انہیں لڑکی کے باپ کو لے کر پریشانی ہے۔ کیا معلوم ان کا قد اگلی نسل کے لئے کوئی مسائل لے آئے وہ یہ رشتہ نہیں کرسکتے۔ پھر یہ سلسلہ تھما نہیں اس کا چھوٹا قد اس کی بیٹی کی خوشیوں میں رکاوٹ بن رہا تھا۔ یہ تو اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ زندگی اسے ایسے نازک موڑ پر لے آئے گی۔

عماذ کا ایم بی بی ایس مکمل ہوگیا تھا ماں باپ کا خواب پورا ہوگیا تھا' پورا گھر بے حد خوش تھا۔ آخر وہ دن آ ہی گیا جس کا سب کو شدت سے انتظار تھا۔ آج میڈیکل کالج میں طلباء کو ڈگری ملنے والی تھی رشا عنایہ بھی خوب تیاریاں کررہی تھیں آخر اتنا بڑا فنکشن جو ہونے والا تھا۔ دیکھو عنایہ بیٹا میرا یہ سوٹ کیسا رہے گا فنکشن کے لئے؟ دائم کپڑے استری کرتی عنایہ سے پوچھ رہا تھا۔

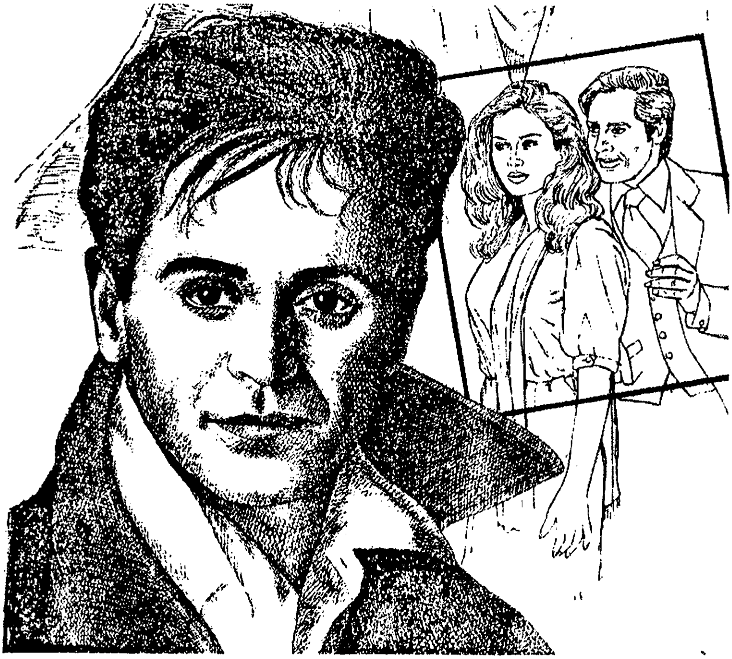
آپ بھائی سے پوچھیں ناں عنایہ نے جواب دیا۔

ہاں یہ بھی ٹھیک ہے' دائم مسکرایا۔

ڈاکٹر صاحب ذرا میرے کمرے میں تشریف لائیں گے آپ' یار میری بھی تیاری میں مدد کرو ڈاکٹر کا باپ ہوں ناں فٹ لگنا چاہیے۔ رشا نے ایک نظر شوہر کی طرف دیکھا اور ایک نظر عماذ کی طرف۔ دونوں کی نظروں میں ایسا کچھ تھا جو دائم کو بہت کچھ سمجھا گیا تھا۔ وہ ایسی نظروں کو خوب پہچانتا تھا۔ لو میری بھی مت ماری گئی ہے رشا میں تو بھول ہی گیا تھا' آج میرا دوست آرہا ہے مجھے ملنے میں تو تم لوگوں کے ساتھ جا نہ سکوں گا۔ دونوں ماں بیٹے کی نگاہوں میں اب سکون تھا جو صرف دائم محسوس کررہا تھا۔ وہ بوجھل قدموں سے چلتا کمرے سے نکل آیا۔ ابھی بھی ایک آس تھی کہ شاید عماذ اسے پکارے' لیکن آس آس ہی رہی۔

آج کی رات دائم پر بہت بھاری تھی وہ ان کی خوشیوں میں رکاوٹ بن رہا تھا جو اس کے رگ جان تھے۔

اس کی زندگی تو گزر گئی جیسی گزرنی تھی وہ اپنی اولاد کی خوشیوں میں رکاوٹ بننا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اپنے لخت جگر کو شرمندہ شرمندہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ صبح ہونے کو تھی اس نے فیصلہ کرلیا تھا سب کی خوشیاں لوٹانے کا۔ سوچ لیا تھا وہ ان کی زندگی سے دور رہ کر ہی ان کی خوشیاں لوٹا سکتا ہے۔ عماذ آج اس قابل ہوچکا ہے کہ گھر اور ماں کو سنبھال سکے۔ عنایہ کے لئے اس نے بہت کچھ بچا رکھا تھا۔ وہ اپنے کپڑے پیک کررہا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا وہ کہاں جائیگا ہاں یہ ضرور معلوم تھا کہ وہ ان لوگوں سے دور جارہا تھا کہ جن کے دل بونے تھے۔





عاصمہ زیدی

ایکسیڈنٹ

لڑکی کے والد نے کہا ’’بیٹا! یہ عمر ہے۔ بہت اچھا انسان ہے۔ انہوں نے میرا بڑا ساتھ دیا تمہیں یہاں لانے میں اور تمہارا علاج کرانے میں ان کا بڑا احسان ہے۔ میں بوڑھا آدمی تمہیں کیسے اور کہاں لے جاتا۔ اللہ ان کا بھلا کرے۔‘‘

ایک نوجوان کا فسانہ جو ہر خوبصورت لڑکی کو اپنی منزل سمجھ لیتا تھا

عمر کا تعلق اچھے خاصے امیر گھرانے سے تھا۔ عمر کے والد کا شمار پاکستان کے چوٹی کے تاجروں میں ہوتا تھا۔ یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہی اس کے والد نے اسے نئی کار لے کر دی تھی۔ اُس کا سب سے محبوب مشغلہ اپنی نئی کار میں دوستوں کے ساتھ گھومنا تھا۔ جب وہ اکیلا ہوتا تو اِدھر اُدھر گاڑی کے باہر دیکھتا رہتا۔ خاص طور پر موٹر سائیکل کے پیچھے بیٹھی ہوئی لڑکیوں کو گھورنا اسے بہت اچھا لگتا۔

ایک روز صبح جب وہ یونیورسٹی سے نکل کر جیل روڈ پر آیا تو اس کی نگاہ موٹر سائیکل کے پیچھے بیٹھی ہوئی ایک نوجوان لڑکی پر پڑی۔ لڑکی کا جسم قدرت

کا انمول شاہکار تھا۔ اس نے زندگی میں شاید ہی اتنی متناسب اور سمارٹ جسم کی لڑکی دیکھی ہو۔ اس نے فوراً رفتار تیز کی تا کہ قریب جا کر اس کا چہرہ دیکھے اور ساتھ ہی اس موٹرسائیکل کو چلانے والے شخص کا اندازہ کرے کہ لڑکی سے اس کا کیا رشتہ ہو سکتا ہے۔ اگر موٹرسائیکل چلانے والا اسے شوہر نظر آتا تو وہ فوراً اپنے دل میں سے اس لڑکی کا خیال نکال دیتا۔ وہ موٹرسائیکل کے قریب پہنچا تو اس نے دیکھا کہ لڑکی بہت ہی خوبصورت ہے۔ گول چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں، بالکل اُداس حُسن کی ایک تصویر اور سب سے اچھی بات کہ موٹرسائیکل چلانے والا اس کا والد تھا۔ اس نے گاڑی کی رفتار کم کر دی اور آہستہ آہستہ ان پر نظریں جمائے پیچھا کرنے لگا۔

اچانک ایک عجیب واقعہ ہوا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ لڑکی چکرا کر موٹرسائیکل سے گر پڑی تھی۔ دوسری طرف اس کا والد زمین پر پڑا کراہ رہا تھا۔ موٹرسائیکل دُور جا گری تھی۔ اس نے گاڑی ایک طرف کھڑی کی اور نیچے اُتر آیا۔ لوگ دائیں بائیں سے ان کی طرف بھاگ رہے تھے۔ عمر بھی بھاگ کر ان کے قریب پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ لڑکی بیہوش پڑی ہے اگرچہ اس کا والد اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے سہارا دے کر اس کے والد کو کھڑا کیا اور ساتھ لے کر لڑکی کی طرف بڑھا۔ لوگوں کی آوازیں آ رہی تھیں کہ لڑکی کے سر پر زیادہ چوٹ آئی ہے۔ 1122 پر فون کریں۔

عمر نے اس کے والد کو کہا ”قریب ہی پرائیویٹ ہسپتال ہے وہاں لے کر چلتے ہیں۔ جلدی کریں۔“

اس نے دوسروں کے سہارے سے لڑکی کو گاڑی میں پیچھے کی سیٹ پر لٹایا اور اپنے ساتھ لڑکی کے والد کو بٹھا کر ہسپتال روانہ ہو گیا۔

راستے میں اس نے اپنے والد کو فون کیا اور کہا کسی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اس لیے ہسپتال والوں سے کہیں جلدی سے اچھی طرح میڈیکل ٹریٹمنٹ دیں۔ جب وہ ہسپتال پہنچا تو ہسپتال کا عملہ اسی کا منتظر تھا۔ دو تین ڈاکٹروں نے لڑکی کا چیک اپ کیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ہسپتال کے عملے کو اوپر سے خاص طور پر ہدایات دی گئی ہیں۔ ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ مریضہ کا سی ٹی سکین کرائے جانے کے بعد ہی کوئی حتمی رائے دی جا سکے گی۔ لڑکی کو ڈرپ لگا دی گئی تھی اور ضروری انجکشن لگانے کے بعد سی ٹی سکین کے لیے شفٹ کر دیا گیا۔

سی ٹی سکین کی رپورٹ آنے میں جو ایک گھنٹہ لگا وہ لڑکی کے والد اور خود عمر کے لیے ایک صبر آزما مرحلہ تھا۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ رپورٹ میں کوئی خطرناک بات ظاہر نہیں ہوئی۔ امید کی جا سکتی ہے کہ مریضہ کو کسی بھی وقت ہوش آ جائے گا۔

لڑکی کے والد نے عمر کو کہا ”بیٹا ہم بالکل ہی درمیانے درجے کے لوگ ہیں اس ہسپتال کا خرچہ ہماری طاقت سے باہر ہے۔ اس لیے ہمیں یہاں سے جلدی فارغ کروا دو۔“ مگر عمر کا اصرار تھا کہ ”آپ بالکل فکر نہ کریں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اس ہسپتال کے مالک میرے ابو کے بہت اچھے دوست ہیں۔ آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔“

لڑکی کا والد اور عمر ہسپتال میں لڑکی کے ہوش میں آنے کا انتظار کرتے رہے۔ رات کے دو بجے ڈاکٹر نے اسے باہر آ کر بتایا کہ مریضہ کو ہوش آ گیا ہے۔

عمر اور لڑکی کا والد جلدی سے کمرے میں داخل ہوئے اور لڑکی کے بیڈ کے پاس جا کر لڑکی کے والد نے اپنی بیٹی سے پوچھا ''بیٹا کیسا محسوس ہو رہا ہے اور تم کیسے موٹر سائیکل سے گر پڑی تھیں؟''

بیٹی نے بتایا ''اب میں کافی بہتر ہوں اور میرے دوپٹے کا ایک کونہ موٹر سائیکل میں پتہ نہیں کیسے پھنس گیا اور اس نے مجھے کھینچ کر نیچے پھینک دیا۔ اس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہیں رہا۔''

لڑکی کے والد نے کہا ''بیٹا! یہ عمر ہے۔ بہت اچھا انسان ہے۔ انہوں نے میرا بڑا ساتھ دیا تمہیں یہاں لانے میں اور تمہارا علاج کرانے میں ان کا بڑا احسان ہے۔ میں بوڑھا آدمی تمہیں کیسے اور کہاں لے جاتا۔ اللہ ان کا بھلا کرے۔''

بیٹی نے نظریں اٹھا کر عمر کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ تشکر کے جذبات مچل رہے تھے۔ عمر صرف اتنا ہی کہہ سکا ''آپ مجھے کیوں شرمندہ کر رہے ہیں۔ میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو وہ ایسا ہی کرتا۔''

اس دوران ڈاکٹر صاحب راؤنڈ پر آ گئے اور انہوں نے کہا کہ مریضہ کو دو دن اور ہسپتال میں زیر نگہداشت رکھنا پڑے گا تاکہ گھر جا کر کوئی پیچیدہ صورت حال پیش نہ آئے۔

عمر ہر روز یونیورسٹی سے چھٹی لے کر ہسپتال جاتا اور گھنٹوں لڑکی کے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہتا۔ وہ لڑکی کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتا تھا۔ اس کے اصرار پر لڑکی نے اسے بتایا ''میرا نام ذکیہ ہے۔ میری عمر 20 سال ہے۔ میں بی اے کے فائنل ایئر کی طالبہ ہوں۔ ہمارا گھرانہ چار افراد پر مشتمل ہے۔ میں، میرا بھائی، میری ماں اور میرے والد صاحب۔ گھر کا خرچ والد صاحب کی پنشن اور بھائی کی تنخواہ پر چل رہا ہے۔ ہم لوگ غریب ہیں۔ گزارا کر لیتے ہیں مگر کسی کا احسان لینا ہمیں گوارا نہیں۔ خوددار لوگ ہیں۔ میری پڑھائی اچھی جا رہی ہے۔ گھر کے حالات کی وجہ سے مجھ میں کچھ تلخی سی آ گئی ہے۔ زیادہ تر رنجیدہ رہتی ہوں۔ پڑھنے کے علاوہ کوئی مشغلہ نہیں۔

عمر کو امید بندھ گئی تھی' اسے لگ رہا تھا کہ اگر وہ دوستی کی پیشکش کرے گا تو لڑکی فوراً قبول کر لے گی اور اسے ہرگز اعتراض نہ ہوگا۔ ابھی عمر اس بارے میں بات کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ لڑکی کا والد اور اُن کے ساتھ ایک نوجوان کمرے میں داخل ہوئے۔ عمر نے سوچا یہ نوجوان یقیناً لڑکی کا بھائی ہوگا۔ اُس نے مسکرا کر لڑکے سے ملنا چاہا لیکن اسی لمحے لڑکی کے والد نے نوجوان کا تعارف کرواتے ہوئے کہا:

''عمر بیٹے اس سے ملو' یہ میرا بھتیجا اور ذکیہ کے بچپن کا منگیتر نعمان ہے۔ بڑا ہونہار بچہ ہے۔ میں نے اور میرے بھائی نے بچوں کی منگنی بچپن میں ہی کر دی تھی۔ نعمان کمپیوٹر سائنس کی تعلیم حاصل کر رہا ہے اور اتنا لائق ہے کہ سکول کالج سے لیکر اب تک سکالر شپ پر تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ بس ہماری امیدیں اسی سے ہیں کہ جلد یہ اچھی ملازمت پر لگ جائے۔''

عمر کے دل میں جیسے کوئی چیز چھن کر کے ٹوٹ گئی۔ اُس نے نم آنکھوں سے زبیدہ کی طرف دیکھا مگر وہ پلکیں جھکائے بیٹھی تھی جیسے مستقبل کے سپنے دیکھ رہی ہو۔ عمر بوجھل قدموں سے کمرے سے نکلا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔



تصویر

ناجیہ ملک

اس بے وقت کی راگنی نے مجھے شدید کوفت میں مبتلا کردیا۔ جی چاہا ایک کرارا سا تھپڑ جڑ دوں۔ سرکرسی کی پشت سے ٹکا کر اشتعال کی اس لہر کو اپنے اندر جذب کیا اور پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر پھر اس کے رونے کی وجہ پوچھی۔ چپ ہونا تو درکنار اُس نے سر بھی اوپر نہ اٹھایا۔

ایک طالبہ کا فسانہ جو ہر وقت اپنی کتاب سینہ سے لگائے رکھتی تھی

کھانا پکاتے ہوئے صبیحہ کے آنسوؤں نے اتنا پریشان کیا کہ عجیب سے احساسات میں گھری میں کمرے میں چلی آئی۔ ہنڈیا میں بھی مجھے اس کے آنسو تیرتے نظر آرہے تھے۔ بیڈ پر بیٹھ کر میں نے کمبل لپیٹا اور رمتاز مفتی کی کتاب ''ان کہی'' کھول لی۔ مقصد صرف اُن آنسوؤں سے پیچھا چھڑانا تھا لیکن یہ کوشش بھی زیادہ دیر کامیاب نہ ہوسکی۔ وہ بھیگی بھیگی آنکھیں کتاب کے صفحے پر اُبھر آئیں اور سارے لفظ ادھر اُدھر بھاگ گئے۔ کتاب ہاتھ سے کھسک کر نیچے جا پڑی اور ذہن اُن آنسوؤں میں ڈوبتا چلا گیا۔ سردی کا احساس ہوا میں نے کمبل سر تک تان لیا اور کتاب تکیے کے نیچے رکھ دی۔

دن بھر کی تھکن دماغ پر بُری طرح حاوی ہوئی ایسے میں نیند کی دیوی فوراً مہربان ہوجایا کرتی کیونکہ سارا دن بچوں کے ساتھ مصروفیت اس قدر تھکا دیتی تھی۔ مجھے سکول میں پڑھاتے چند ہی دن ہوئے تھے۔ وہی گورنمنٹ کے سکولوں کے عام مسائل کلاسز زیادہ اور سٹاف کی کمی کے باعث ایک وقت میں دو، دو، تین، تین کلاسز کو سنبھالنا ایک مشکل اور صبر آزما کام تھا۔ 8 اکتوبر کے سانحے نے عمارت ڈھا کر رہی سہی کسر پوری کر دی تھی۔ لیکن ان تمام مسائل کے باوجود اس سکول کا معیارِ تعلیم بے حد اچھا تھا وجہ انتھک محنت تھی۔ جو شدید قسم کی تھکن سے دوچار کر دیتی۔ یوں تھک کر بستر پر لیٹتے ہی نیند کی وادی میں اُتر جاتی، لیکن آج نیند کی جگہ بھی اُن آنسوؤں نے لے لی تھی۔ چند لمحے بے چینی سے کروٹیں بدلنے کے بعد میں باہر کھلی فضا میں نکل آئی۔

ساری وادی اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی ستاروں کے ساتھ تنہا سفر کرتی رات بھی اپنے اندر اُداسیاں سمیٹے ہوئے تھی۔ ذہن ایک بار پھر دن کے اُس واقعے کی طرف جانکلا اور اعصاب شکن لمحوں نے مجھے اپنے شکنجے میں جکڑ لیا۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کوئی ایک واقعہ آپ کو تمام تر حسیات کے ساتھ اپنی طرف متوجہ کر لیتا پھر آپ اُس لمحے میں مقید ہو کر رہ جاتے ہیں۔

تیسرے پیریڈ کا آغاز ہوا تو سورج نے بھی پہاڑوں کے پیچھے سے طلوع ہو کر اپنی شکل دکھائی۔ جاتی ہوئی سردیوں کی نرم سی دھوپ خوشگوار حرارت لیے ہوئے تھی۔ جماعت سوئم کی طالبات کو لکھنے کا کام دے کر میں نے اُن کی ہوم ورک کاپیاں اُٹھا لیں۔ ابھی تین چار کاپیاں ہی چیک کی تھیں جب سسکیوں

ڈاک ٹکٹوں کے شائقین کے لئے

پاکستان کے ڈاک ٹکٹ کی تاریخ بھی بڑی دلچسپ ہے۔ جب پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو اس کے اپنے ڈاک ٹکٹ چھپے ہوئے نہیں تھے، ڈیڑھ ماہ بعد یکم اکتوبر 1947ء کو پاکستان نے ٹکٹوں کا ایک سیٹ جاری کیا۔ یہ وہی جارج پنجم کے ٹکٹوں کا سیٹ تھا۔ جس پر انگریزی میں لفظ پاکستان اوور پرنٹ (Over Print) کیا۔ ان کی قیمت تین پائی سے لے کر پچیس روپے تک ہے۔

☆ 9 اکتوبر کو ہر سال ڈاک ٹکٹوں کا عالمی دن منایا جاتا ہے۔

☆ 1835ء میں ڈاک ٹکٹ جیمز کا مرز نے ایجاد کیے۔ اسی سال راؤلینڈ ہل نے انگلستان میں ڈاک ٹکٹ استعمال کرنا شروع کر دیئے۔

☆ دنیا کا سب سے زیادہ قیمتی ٹکٹ برطانوی گنی کا ہے۔ جو 1856ء میں جاری کیا گیا تھا اس ٹکٹ کی قیمت ساٹھ ہزار ڈالر ہے۔

☆ دنیا کا سب سے پہلے ڈاک ٹکٹ 6 مئی 1840ء کو فروخت ہوا تھا۔

☆ ڈاک کا ٹکٹ سب سے پہلے 1840ء میں جاری ہوا۔ اس پر ملکہ وکٹوریہ کی تصویر تھی۔

یوں تو پاکستان میں 1947ء تا 2013ء کے درمیان اکتوبر میں کافی ٹکٹ شائع ہوئے ہیں مگر پانچ بار ڈاک ٹکٹ 9 اکتوبر میں شائع ہوئے۔ ٹکٹوں کے بارے میں کافی کیٹلاگ اور پاکستان انڈیا، بنگلہ کی سٹیشنری مثلاً خطوط، لفافے، ٹکٹیں اور فرسٹ ڈے کورز وغیرہ بھی۔ جاتے ہیں۔

(حاجی محمد وارث۔ راولپنڈی)

کی آواز بے حد قریب سے آئی۔ وقت کم تھا اور مقابلہ سخت والا حال تھا۔ بے تحاشا مصروفیت میں نہ چاہتے ہوئے بھی ان سسکیوں کے تعاقب میں دیکھا کرسی کے عین پیچھے بیٹھی صبیحہ بے تحاشا رو رہی تھی۔

ہر دم ہنستا مسکراتا سرخ و سفید چہرہ آنسوؤں سے بھرا تھا۔ دُکھ اور خوف کی پرچھائیاں واضح دکھائی دے رہی تھیں۔

''کیا ہوا؟ جواب تو دو۔''

کاپیاں میز پر رکھ کر میں پیچھے مڑی اور اُس کا چہرہ اوپر کرنا چاہا جو اُس نے گھٹنوں میں چھپا کر مزید تیزی سے رونا شروع کر دیا۔

رونے کی وجہ جاننے کی ہر ممکن کوشش کرنے کے بعد ناکام ہو کر میں نے دوبارہ کاپیاں اُٹھالیں۔

اس بے وقت کی راگنی نے مجھے شدید کوفت میں مبتلا کر دیا۔ جی چاہا ایک کرارا سا تھپڑ جڑ دوں۔ سر کرسی کی پشت سے ٹکا کر اشتعال کی اس لہر کو اپنے اندر جذب کیا اور پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر پھر اس کے رونے کی وجہ پوچھی۔ چپ ہونا تو درکنار اُس نے سر بھی اوپر نہ اٹھایا۔ اچانک خیال آنے پر میں نے ساتھ بیٹھی بچی سے پوچھا۔

''اس کی کتاب گم ہوگئی ہے اس لیے رو رہی ہے۔ ہر طرف ڈھونڈ لی نہیں ملی۔'' وجہ جان کر مجھے اطمینان کا احساس ہوا تو میں بھی مطمئن ہو کر اپنے کام کی طرف متوجہ ہوگئی۔ ''کون سی کتاب تھی؟''

''اُردو کی۔''

''اوہو یہ کوئی رونے والی بات ہے' میرے پاس اُردو کی کتاب ہے وہ لے لو اور چپ ہو جاؤ۔'' لیکن آنسو شدید تیزی سے بہنے لگے۔ میں نے حیران سا ہو کر صبیحہ کو دیکھا۔ ''رونا ہر مسئلے کا حل نہیں ہوتا۔ کتاب تھی کوئی انسان نہیں جو کھو جائیں تو ملتے نہیں۔'' یہ جملہ بے اختیار میری زبان سے پھسلا

تھا جس پر بعد میں افسوس بھی ہوا۔ ''چلو میں آپ کو نئی کتاب لے دُوں گی۔ بس اب خاموش''۔

''مِس یہ کہہ رہی ہے اپنی والی کتاب لوں گی''

''اب میں اپنی والی کتاب کہاں سے لاؤں؟''

لیکن آنسوؤں کی شدت سے اُس کے منہ سے ایک لفظ تک نہ نکلا۔ کام ختم کر کے میں نے کاپیاں بچوں کو تھمائیں تو میز کے اوپر ایک کتاب رکھی نظر آئی۔

''ایک کتاب تو یہ ہے۔ یہ رکھی ہے یہ تو نہیں۔'' یہ سُنتے ہی اُس نے جھٹکے سے سر اٹھایا اور تیر کی طرح لپکی۔

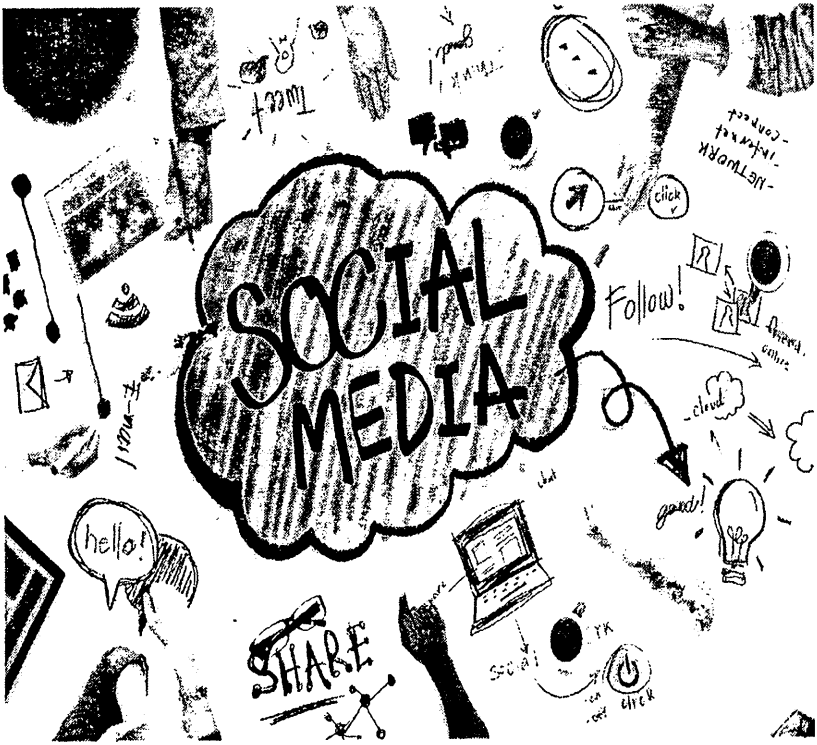
چوتھے پیریڈ کی گھنٹی بجی تو سارے بچے بیگ اُٹھائے باہر بھاگ گئے۔ جب کہ وہ اردگرد سے بے خبر تیزی سے کتاب کے صفحے پلٹ رہی تھی چہرے پر شدید اُلجھن کے آثار تھے۔ ایک جگہ پہنچ کر وہ رُک گئی اور چہرے پر سکون پھیل گیا۔ ہونٹوں پر پھیلنے والی مسکراہٹ بڑی دلفریب تھی۔ وہ کتاب کے صفحے پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ میں نے یہ منظر نہایت دلچسپی سے دیکھا اور بے اختیار ہی ہاتھ بڑھا کر کتاب لے لی۔ صفحوں کے بیچوں بیچ ایک آدمی کی تصویر تھی جس کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔

''یہ...... یہ میرے ابو ہیں۔ یہ کراچی کی تصویر ہے جب وہ وہاں کام کرتے تھے۔'' بے پناہ پیار اُس کے لہجے میں سمٹ آیا تھا۔ ''میرے ابو چھٹی پر گھر آئے تھے اور پھر زلزلہ آیا اور وہ بھی شہید ہو گئے۔ اب میں اُن کی تصویر اپنے پاس رکھتی ہوں۔''

اوہ میرے خدا' تو وہ کتاب کیلئے نہیں تصویر کیلئے روئی تھی۔ اُس نے کتاب میرے ہاتھ سے لی کسی قیمتی متاع کی طرح سینے پر لگائی اور باہر نکل گئی۔

کیا بے جان تصویریں انسانوں کا نعم البدل ہوتی ہیں میرا دل دکھ کی گہرائیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

اور اب صبیحہ کے آنسو......................!



کامران امجد خان

سوشل میڈیا کا بڑھتا استعمال

یوٹیوب سے غیر اخلاقی مواد ہٹانے کا مطالبہ کافی نہیں

ضابطہ اخلاق کی پابندی اور پی ٹی اے کو فعال بنایا جائے

پاکستان میں سوشل میڈیا استعمال کرنے کے رجحان میں تیزی سے اضافہ ہورہا ہے۔ خاص طور پر یوٹیوب اور ٹک ٹاک جیسے سوشل میڈیا پلیٹ فارم ہر خاص و عام میں مقبول ہوچکے ہیں۔ بچے' بوڑھے' مرد و خواتین سب ان سوشل میڈیا ذرائع کا استعمال کررہے ہیں۔ یوٹیوب چونکہ اب کمائی کا بھی ذریعہ بن گیا ہے اور بے شمار پاکستانی اپنے یوٹیوب چینل بنا کر ڈھیروں پیسے کمارہے ہیں اس لیے ایک بھیڑچال شروع ہوگئی ہے اور لوگ بغیر سوچے

سمجھے ایسا مواد اپ لوڈ کر رہے ہیں جو کئی لحاظ سے نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ سبسکرائبرز اور ویوز حاصل کرنے کے لیے غیر اخلاقی اور انتہائی بے ہودہ ویڈیوز بھی اپ لوڈ کردی جاتی ہیں۔ اور چونکہ ہر عمر کے لوگ یوٹیوب استعمال کرتے ہیں اس لیے اس طرح کی ویڈیوز بے حد تباہ کن ثابت ہورہی ہیں۔ اس کے علاوہ چونکہ ویڈیوز بنانے والے چونکہ ہر طرح کی سوچ رکھنے والے غیر تربیت یافتہ لوگ ہیں اوران پر کوئی روک ٹوک یا پابندی بھی نہیں اس لیے مذہبی منافرت اور فرقہ وارانہ تقاریر، اعلیٰ عدلیہ، ملکی اداروں اور قومی سلامتی کے خلاف تجزیئے بھی اپ لوڈ کیے جارہے ہیں۔ اس حوالے سے مسلسل شکایات پر پاکستان ٹیلی کمیونیکیشن اتھارٹی (پی ٹی اے) نے ویڈیو شیئرنگ پلیٹ فارم یوٹیوب سے رابطہ کرکے کہا ہے کہ وہ پاکستان میں غیر اخلاقی، فحاشی اور عریانی پر مبنی مواد اور نفرت انگیز تقاریر پر مبنی مواد کو فوری طور پر ہٹائے۔ پی ٹی اے کی جانب سے یوٹیوب پر موجود نامناسب، غیر اخلاقی، فحش مواد کے انتہائی منفی اثرات کے پیش نظر اور نفرت انگیز تقاریر اور فرقہ وارانہ مواد کی موجودگی کی بدولت یہ ہدایات جاری کی گئیں۔ پی ٹی اے نے قابل اعتراض مواد کو فوری طور پر ہٹانے اور اس طرح کا مواد اس پلیٹ فارم کے ذریعے پھیلانے سے روکنے کے لئے یوٹیوب سے رابطہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ پی ٹی اے کی جانب سے یوٹیوب پر اس بات پر بھی زور دیا گیا ہے کہ وہ مواد کی نگرانی کے لئے ایک موثر اور اعتدال پسند حکمت عملی اختیار کرے تاکہ پاکستان میں اس طرح کے مواد تک رسائی کو روکنے کے ساتھ ساتھ غیر قانونی مواد کا پتہ لگانے اور حذف کرنے کے حوالے سے بھی اقدامات کیے جاسکیں۔

پاکستانی ریگولیٹرز نے ویڈیو شیئرنگ پلیٹ فارم یوٹیوب سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ ان تمام ویڈیوز تک ملک میں رسائی کو فوری طور پر بلاک کردے جنہیں وہ قابل اعتراض سمجھتے ہیں۔ پاکستان ٹیلی کمیونیکیشن اتھارٹی نے یوٹیوب حکام سے رابطہ ضرور کیا ہے لیکن یوٹیوب حکام نے فی الحال کوئی ردعمل نہیں دیا۔ اور یہاں سوال یہ ہے کہ کیا صرف یہ مطالبہ کافی ہے؟

یاد رہے کہ کچھ عرصہ قبل سپریم کورٹ آف پاکستان نے بھی سوشل میڈیا، بالخصوص یوٹیوب پر قابل اعتراض مواد کا نوٹس لے لیتے ہوئے کہا تھا کہ ہم تحمل کا مظاہرہ کر رہے ہیں آخر اس کا اختتام تو ہونا ہے۔ فرقہ وارانہ جرم کے ایک مقدمے میں نوٹس لیتے ہوئے جسٹس قاضی امین نے کہا تھا کہ ہمیں آزادی اظہار رائے سے کوئی مسئلہ نہیں، ہماری کارکردگی اور فیصلوں پر عوام کو بات کرنے کا حق ہے۔ تاہم انہوں نے اپنے ریمارکس میں کہا کہ نجی زندگی کا حق بھی ہمیں آئین دیتا ہے، کیا ایف آئی اے اور پی ٹی اے نے دیکھا ہے یوٹیوب پر کیا ہورہا ہے؟ جسٹس قاضی امین نے یہ بھی کہا تھا کہ گذشتہ روز ہم نے فیصلہ دیا اور وہ یوٹیوب پر شروع ہوگیا، یوٹیوب اور سوشل میڈیا پر ہمارے خاندانوں کو بخشا نہیں جاتا، کوئی یوٹیوب پر چاچا تو کوئی ماما بن کر بیٹھ

جاتا ہے اور ججز کو شرمندہ کیا جاتا ہے۔
اس موقع پر پی ٹی اے حکام نے موقف اپنایا تھا کہ ہم انفرادی مواد کو ہٹا نہیں سکتے' صرف رپورٹ کر سکتے ہیں۔ حالانکہ یہ سراسر غلط بات ہے بہت سے ممالک میں یوٹیوب مواد کو سینسر کیا جا رہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ پاکستانی حکام ایسا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے یا کرنا نہیں چاہتے۔ اسی حوالے سے اعلیٰ عدلیہ کے فاضل جج جسٹس مشیر عالم نے ریمارکس دیے تھے کہ کئی ممالک میں یوٹیوب بند ہے' کئی ممالک میں سوشل میڈیا کو مقامی قوانین کے تحت کنٹرول کیا جاتا ہے۔ امریکہ اور یورپی یونین کے خلاف مواد یوٹیوب پر ڈال کر دکھائیں۔ جسٹس قاضی امین نے استفسار کیا کہ آرمی عدلیہ اور حکومت کے خلاف لوگوں کو اکسایا جاتا ہے' بتایا جائے ایسے جرم کے مرتکب کتنے لوگوں کے خلاف کارروائی ہوئی۔ عدالت نے پاکستان میں یوٹیوب بند کرنے کا عندیہ دیتے ہوئے وزارت خارجہ اور اٹارنی جنرل کو نوٹس بھی جاری کیے تھے۔
رواں برس جولائی میں پی ٹی اے نے چینی ملکیت میں چلنے والی سوشل میڈیا ایپ ٹک ٹاک کو حتمی انتباہ جاری کرتے ہوئے اسے فحش مواد کو

تبدیلی

ایک سر پھری بیوی جس نے خاوند کے ناک میں دم، اور اپنے اسلوب اور معاملات سے خاوند کا جینا حرام کیا ہوا تھا۔ اُس نے ایک دن خاوند کو صبح سویرے نیند سے جگایا اور نہایت احترام اور محبت سے کہا:
"میرے سرتاج...... اُٹھیئے، صبح ہو گئی ہے۔" اور پھر شاندار تیار کیا ہوا ناشتہ خاوند کے بستر پر ہی لے آئی۔ خاوند جو پہلے ہی نیند سے جاگ کر بیوی کے رویہ پر حیرت زدہ بیٹھا تھا، ناشتہ دیکھ کر چپ نہ رہ سکا اور پوچھ لیا: "آج کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ یہ اچانک کیسی تبدیلی آگئی ہے تم میں؟"
بیوی نے کہا: "کل ہمسایوں کے گھر میں تبلیغ والی بیبیاں آئی ہوئی تھیں۔ کہہ رہی تھیں کہ جس مرد کی بیوی بدزبان اور بداخلاق ہو گی اللہ اُس مرد کی مغفرت فرما دے گا۔ اور ہو سکتا ہے کہ اُس مرد کو بیوی کی بداخلاقی اور بدتمیزی برداشت کرنے پر جنت میں بھی داخل کر دے۔"
خاوند نے کہا: "یہاں تک تو ٹھیک ہے، آگے؟"
بیوی نے غراتے ہوئے کہا: "جنت جانا ہے تو اپنے اعمال سے جا، میسنا بن کر میری وجہ سے کیوں جاتا ہے؟"

(مرسلہ: عابد رحیم۔ کراچی)

فلٹر کرنے کا حکم دیا تھا۔دوسری جانب پی ٹی اے کی جانب سے ویڈیو سٹریمنگ ایپ بیگو لائیو کو بھی بند کردیا گیا تھا جسے بعد میں بحال کردیا گیا۔

یہ پہلا موقع نہیں ہے جب پاکستانی حکام کی جانب سے یوٹیوب سے اس طرح کا مطالبہ کیا گیا ہے۔یوٹیوب کو 2012 میں اس وقت بھی ملک میں بند کردیا گیا تھا جب ایک امریکی فلم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں گستاخی کی گئی تھی اور اس کے کچھ حصوں کو یوٹیوب پر اپ لوڈ کردیا گیا تھا۔یوٹیوب حکام کی جانب سے ایسی ویڈیوز ہٹانے سے انکار پر پوری دنیا میں پرتشدد مظاہرے ہوئے تھے۔توہین آمیز سمجھے جانے والے مواد کی فلٹرنگ کو یقینی بناتے ہوئے یوٹیوب نے پاکستان کے لیے ایک ورژن شروع کیا تھا اور 2016 میں اس کو ملک بھر میں بحال کردیا گیا تھا۔

آزادی اظہارِ رائے کی مہم چلانے والوں نے پی ٹی اے کے نئے مطالبے پر تنقید کی ہے۔ڈیجیٹل رائٹس کی حامی نگہت داد کے مطابق اگرچہ کچھ ممالک سوشل میڈیا پلیٹ فارمز سے مقامی قانون کے مطابق مخصوص مواد حذف کرنے کا مطالبہ کرسکتے ہیں مگر یہ مطالبے یوٹیوب کے بین الاقوامی اصولوں اور ضابطوں کے خلاف ہوں تو وہ ہمیشہ اس کی تعمیل نہیں کرتا ہے۔

یوٹیوب ایک ایسی ویب سائٹ ہے جہاں صارفین اپنی وڈیو شامل اور پیش کرسکتے ہیں۔پے پال کے تین سابق ملازمین نے 2005ء میں یوٹیوب قائم کی۔ 2006ء میں گوگل ان کارپوریٹڈ نے 1.65 ارب ڈالر کے عوض یوٹیوب کو خرید لیا اور اب یہ گوگل کے ماتحت ادارے کے طور پر کام کررہا ہے۔ادارے کے صدر دفاتر سان برونو، کیلیفورنیا، امریکہ میں واقع ہیں۔یوٹیوب پر پیش کردہ بیشتر مواد انفرادی طور پر اس کے صارفین کی جانب سے پیش کیا جاتا ہے البتہ سی بی ایس، بی بی سی، یو ایم جی اور دیگر ابلاغی ادارے بھی یوٹیوب شراکت منصوبے کے تحت اپنا کچھ مواد پیش کرتے ہیں۔

سب سے زیادہ تشویشناک بات یہ ہے کہ اس ویب سائٹ پر غیر رجسٹرڈ صارفین بھی وڈیوز دیکھ سکتے ہیں۔اگرچہ غیر اخلاقی مواد دیکھنے کے لیے 18 سال سے زائد عمر کے صارفین کی شرط رکھی گئی ہے۔لیکن کوئی بھی فرضی آئی ڈی بنا کر ان تک رسائی حاصل کرسکتا ہے۔

پی ٹی اے نے یوٹیوب سے غیر اخلاقی اور نفرت انگیز مواد ہٹانے اور اس کی روک تھام کے لیے اقدامات کا مطالبہ ضرور کیا ہے لیکن یہ ایک کمزور مطالبہ ہے اور یوٹیوب حکام نے اس کا جواب دینا بھی ضروری نہیں سمجھا۔پاکستان میں بھی' چین' ایران' روس اور دیگر کئی ممالک کی طرح یوٹیوب سمیت دیگر سوشل میڈیا ویب سائٹس کو سینسر کرنے کی پالیسی اپنائی جانی چاہیے' اس کے لیے پی ٹی اے اور ایف آئی اے کو زیادہ فعال بنایا جائے اور اُن کی تربیت کی جائے کہ کیسے ایسے مواد کو کم از کم پاکستانی صارفین کی رسائی سے دُور رکھنا ہے۔

نواز خان

چھوٹی بیگم

نوجوان جاگیردارنی کسی انجانی مصیبت میں گرفتار تھی۔ نواز خاں اسے اس مصیبت سے نکالنا چاہتا تھا۔ وہ بھی نکلنا چاہتی تھی مگر پھر ایک دیوار ان دونوں کے درمیان آ گئی!

میری زندگی کے اس یادگار واقعہ کا تعلق راجستھان سے ہے۔ ان دنوں میں جودھ پور کے نزدیک ایک تھانے میں تعینات تھا۔ دوپہر کے وقت موٹی گردن اور ہشاش بشاش چہرے والا ایک شخص تھانے میں داخل ہوا۔ اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا۔

میں گڑھی سے آیا ہوں چھوٹی بیگم نے بھیجا ہے اور یہ خط آپ کے لئے دیا ہے۔

گڑھی اور چھوٹی بیگم کا نام سن کر میں بے اختیار چونک گیا۔ جس علاقے کو گڑھی کہا جاتا تھا وہ چھوٹی موٹی ریاست سے کم نہیں تھا یہاں کے جاگیردار کنور امر سنگھ کو میں اچھی طرح جانتا تھا۔ علاقے میں ان کی شہرت تھی شکار اور نسل نسل کے کتے پالنے سے انہیں خاص لگاؤ تھا۔ وہ کافی عرصہ بیمار رہنے کے بعد چند ہی ماہ پہلے سورگ باسی ہوئے تھے۔ اب کنور امر کی بڑی بیٹی نرملا نے جاگیر کا انتظام سنبھال لیا تھا۔ چھوٹی بیگم دراصل نرملا ہی کو کہا جاتا تھا۔ اب اس چھوٹی بیگم نے میرے نام کوئی خط بھیجا تھا میں نے موٹی گردن والے سے خط لے کر پڑھنا شروع کیا' لکھا تھا:۔

انسپکٹر نواز خاں صاحب! اپنے منیجر راجپال کو یہ خط دے کر بھیج رہی ہوں پتا جی آپ کی بڑی تعریف کیا کرتے تھے۔ آپ کو یاد ہوگا ایک مرتبہ آپ کے سامنے ہی انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر مجھے کسی وقت مدد کی ضرورت ہو تو بلا تکلف آپ سے رابطہ کرسکتی ہوں۔ اس وقت میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ اتنی جلدی پتا جی ہم سے جدا ہو جائیں گے اور مجھے ایک اہم مسئلے کے لئے آپ کو مدد کے لئے پکارنا پڑے گا۔ نواز صاحب سچی بات یہ ہے کہ میں دل سے آپ کی مداح ہوں۔ مجھے وشواس ہے کہ اگر کوئی اس وقت میری مدد کرسکتا ہے تو وہ آپ ہیں۔ پلیز آپ اپنے قیمتی وقت میں سے چند روز کی فرصت نکال کر گڑھی آ جائیں۔ باقی باتیں آپ کو یہاں پہنچنے پر بتاؤں گی۔ میں آپ کی مجبوری سمجھتی ہوں اس لئے میں نے ایک خط ایس ایس پی مسٹر اسمتھ والٹر صاحب کے نام بھی

چھوٹی بیگم



نواز خان

تحریر کر دیا ہے۔ امید ہے ایس ایس پی صاحب کو آپ کے گڑھی آنے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ فقط آپ کی پرستار، نرملا دیوی۔

میں نے اپنی تعریف کا یہ مختصر خط دو دفعہ پڑھا۔ نرملا کی صورت نگاہوں میں گھومنے لگی۔ آج سے دو سال پہلے میں اکثر گڑھی میں آتا جاتا تھا۔ ان دنوں نرملا آگرہ یونیورسٹی میں پڑھتی تھی۔ وہ بڑی ذہین اور سمجھدار لڑکی تھی۔ جاگیردار کنور امر سنگھ اکثر جاگیر کے معاملات میں اس سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایک کیس کے سلسلے میں، میں پورے دو ماہ گڑھی میں رہا تھا۔ ان دنوں نرملا سے میری کافی جان پہچان ہو گئی تھی اس کیس کی روئیداد آپ ان ہی صفحات میں پڑھ چکے ہیں، میں نے خط دیکھنے کے بعد ایک طرف رکھ دیا اور منیجر راجپال سے پوچھا کہ ایس ایس پی صاحب والا خط کہاں ہے۔

راج پال نے جواب دیا میں جودھ پور سے ہو کر آیا ہوں وہ خط میں نے انہیں دے دیا تھا۔ جواب میں ایس ایس پی صاحب نے یہ رقعہ آپ کے لئے بھیجا ہے۔

منیجر نے ایک بار پھر جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک دوسرا رقعہ نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔ یہ ایس ایس پی صاحب نے لکھا تھا کہ اگر تھانے میں کوئی زیادہ اہم کیس نہیں اور میں سب انسپکٹر کو قائم مقام بنا کر گڑھی جا سکتا ہوں تو ایک چکر وہاں کا لگا آؤں۔ کنور امر سنگھ نے اپنی زندگی میں ہمیشہ قانون کی مدد کی ہمیں اسکی بیٹی کو مشکل میں تنہا نہیں چھوڑنا چاہئے۔

اس کا مطلب تھا نرملا دیوی نے مجھے گڑھی بلانے کا پکا انتظام کیا ہے، مگر میں بھی اپنی مرضی کا مالک تھا اس کے علاوہ مجھے تھانے میں ایک دو کام بھی تھے۔ میں نے ٹال مٹول کر کے منیجر کو واپس بھیج دیا۔ منیجر چلا تو گیا لیکن ٹھیک دو روز بعد پھر آ دھمکا۔ اس دفعہ اسکے ساتھ نرملا کا طویل درخواست نامہ تھا جس میں مجھ سے جلد از جلد گڑھی پہنچنے کی درخواست کی گئی تھی۔ اس سارے معاملے کی خبر تھانے کے عملے کو ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ جودھ پور ہیڈ کوارٹر میں بھی چرچے ہو رہے تھے کہ نواز خاں کو گڑھی کی جاگیردارنی نے بلوایا ہے۔ ایک طرح یہ بڑے اعزاز کی بات تھی کہ جاگیردارنی نے ایس ایس پی کو خط لکھ کر مجھ پر اپنے اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ کنور امر سنگھ کا خاندان بڑا بااثر تھا۔ اگر وہ لوگ چاہتے تو کمشنر تک کام کاج چھوڑ کر وہاں پہنچ سکتا تھا اور انکے نخرے اٹھا سکتا تھا۔ خط والا واقعہ مشہور ہونے کے بعد ایک ڈی ایس پی صاحب جودھ پور سے چل کر مجھ سے ملنے آ چکے تھے۔ وہ صرف میری صورت دیکھنے آئے تھے کہ وہ کون سی ذات شریف ہے جسے گڑھی کی جاگیردارنی خط لکھ لکھ کر بلوا رہی ہے اور جس پر کنور امر سنگھ اتنا بھروسہ کرتے تھے۔

بہر حال اپنے منہ سے زیادہ تعریف اچھی نہیں لگتی جب نرملا دیوی کا منیجر دوسری مرتبہ پیغام لیکر میرے تھانے پہنچا تو میں نے فیصلہ کر لیا کہ ایک چکر وہاں کا لگا ہی آنا چاہئے۔ میں نے منیجر سے کہا کہ کل شام یا پرسوں دوپہر میں گڑھی پہنچ جاؤں گا۔ وہ مجھے ساتھ لے جانا چاہتا تھا اور اس مقصد کے لئے ایک شاندار بگھی بھی لے کر آیا تھا۔ بہر حال جب اس نے میری نیت بھانپ لی تو ہتھیار ڈال کر بولا

نواز صاحب بہتر ہے اب آپ اور تاخیر نہ کریں میں آپ کو بتا نہیں سکتا چھوٹی بیگم کس قدر پریشان ہیں۔ کھاتی ہیں نہ پیتی ہیں ساری ساری رات جاگتی ہیں۔ ہمیں تو دیکھ کر ڈر لگتا ہے، پتہ نہیں کیا بات ہے؟

میں نے کہا' راجپال تم چھوٹی بیگم کے منیجر ہو یا حویلی میں گھاس کھودتے ہو۔ ایک منیجر کو ہر معاملے کی خبر ہونی چاہئے یا پھر تم جان بوجھ کر چھپانے کی کوشش کر رہے ہو۔

جواب میں راجپال نے فوراً گیتا کی قسم اٹھائی اور بولا مجھے کچھ پتہ نہیں ہے۔ دو تین ہفتے پہلے حویلی میں

چوری کی واردات ہوئی تھی۔ چور ابھی حویلی کے احاطہ میں ہی تھے کہ چوکیداروں کو پتہ چل گیا انہوں نے چوروں کو للکارا ان میں سے ایک تو بھاگ گیا لیکن دو پکڑے گئے۔ دونوں کو مقامی پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ چوری چکاری علاقے کا معمول ہے یہ کوئی ایسی خوفناک بات نہیں تھی مگر میرا اندازہ ہے کہ چھوٹی بیگم کی پریشانی اس واردات کے بعد ہی شروع ہوتی ہے شاید ان کے دل میں کوئی وہم جڑ پکڑ گیا ہے۔ میں نے منیجر سے پوچھا کیا تم پورے یقین سے کہہ سکتے ہو کہ حویلی میں گھسنے والے چور ہی تھے۔

منیجر نے کہا' جناب یہ معلوم کرنا تو پولیس کا کام ہے۔ ویسے پکڑے جانے والوں میں سے ایک لنگڑے کو میں اچھی طرح جانتا ہوں وہ پیشہ ور چور ہے۔ نقب لگانے میں اسے ماسٹر سمجھا جاتا ہے۔ جب وہ گرفتار ہوا اس کے لباس میں نقب لگانے کا سامان چھپا ہوا تھا۔

میں نے منیجر کو مزید کریدنے کی کوشش کی لیکن یا تو اسے معلوم ہی اتنا تھا یا وہ چھپانے کا فریضہ انجام دے رہا تھا۔

اگلے روز میں اور بلال شاہ گڑھی کے لئے روانہ ہو رہے تھے۔ ہم سادہ لباس میں تھے۔ گڑھی کو دو راستے جاتے تھے ایک تو گھوڑوں اور تانگوں وغیرہ کے لئے تھا اس راستے سے گڑھی کا فاصلہ پندرہ کوس کے قریب تھا دوسرا راستہ بذریعہ بس تھا۔ بس گڑھی سے تین میل دور پختہ سڑک پر اُتار دیتی تھی۔ وہاں سے پیدل یا تانگے پر جانا پڑتا تھا۔ یہ راستہ طویل تھا مگر نسبتاً آرام دہ تھا۔ ہم نے یہی راستہ اختیار کیا۔ بس ملنے میں کچھ دیر لگی جس کی وجہ سے ہم شام سے تھوڑی دیر پہلے گڑھی پہنچ گئے۔ گڑھی میں کنور امر سنگھ کی حویلی اپنی مثال آپ تھی۔ اسے دیکھ کر کسی چھوٹے موٹے قلعے کا گمان ہوتا تھا۔ ہم حویلی کے صدر دروازے پر پہنچے تو دو باوردی چوکیداروں نے استقبال کیا۔ گیٹ کے بعد ایک نیم تاریک ڈیوڑھی سے گزر ہوا۔ یہاں دیواروں پر دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں نقش تھیں۔ ڈیوڑھی کے بڑے محرابی دروازے سے گزر کر ہم حویلی کے احاطے میں آ گئے۔ یہاں گھاس کے خوبصورت قطعے تھے فوارے تھے اور پھولوں سے سجی ہوئی روشیں تھیں۔ احاطے کے عین وسط میں سرسبز گھاس پر بہت سی کرسیاں میزیں لگی تھیں اور خوش لباس مہمان خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ایک طرف سنگ مرمر کے چبوترے پر علاقے کا سب سے مشہور سارنگی نواز استاد ستارے خاں اپنے فن کا جادو جگا رہا تھا۔

مہمانوں میں کالے انگریزوں کے علاوہ گورے انگریز بھی موجود تھے۔ گوری میمیں سب سے نمایاں نظر آ رہی تھیں لیکن ان میموں سے بھی گورے اور خوبصورت چہرے والی ایک اور عورت یہاں موجود تھی اور وہ تھی نرملا دیوی۔ اپنے زرق برق لباس اور لمبے بالوں کے ساتھ وہ واقعی کوئی راج کماری نظر آتی تھی پچھلے دو سالوں میں اس کا ملکوتی حسن کچھ اور نکھر گیا تھا۔ اسے میری آمد کی اطلاع ہو چکی تھی لہٰذا جونہی میں بلال شاہ کے ساتھ احاطے میں پہنچا وہ میری طرف متوجہ ہوگئی۔ اُٹھ کر ہمارے پاس آئی نمستے کر کے حال احوال پوچھا اور معزز مہمانوں کے ساتھ بیٹھنے کے لئے جگہ دی۔ بلال شاہ ایک دُبلے پتلے انگریز کے پہلو میں بیٹھ کر بڑا خوش ہو رہا تھا اور پھر سامنے میز پر بسکٹوں اور پیسٹریوں کا ڈھیر بھی تو لگا تھا اس کے دل میں لڈو نہ پھوٹتے تو اور کیا ہوتا؟۔

بیشتر مہمان ہماری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے لہٰذا نرملا دیوی کو ہم دونوں کا تعارف بھی کرانا پڑا۔ اس تعارف میں ظاہر ہے میری تعریف شامل رہی ہوگی۔ نرملا دیوی نے اس دو برس پہلے کے کیس کا ذکر بھی کیا جس کی وجہ سے مجھے کئی ہفتے اسی حویلی میں گزارنے پڑے تھے۔

تنہائی میں نرملا دیوی سے میری پہلی ملاقات اسی روز رات کو ہوئی۔ ایک اردلی ہمارے کمرے میں پہنچا

اور اس نے اطلاع دی کہ نشست گاہ میں چھوٹی بیگم آپ کو یاد کر رہی ہیں۔ مجھے معلوم تھا ایسا ہوگا لہٰذا گیارہ بجنے کے باوجود میں نے ابھی تک شب خوابی کے کپڑے نہیں پہنے تھے۔ مہمان خانے سے نکل کر میں اردلی کے ہمراہ نشست گاہ میں پہنچا۔ اس وسیع وعریض کمرے میں نرملا دیوی تنہا بیٹھی تھی۔ نشست گاہ میں درجنوں فانوس تھے لیکن صرف دو جل رہے تھے اور ان کی مدہم روشنی میں نرملا دیوی کا چہرہ بے حد زرد دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے لگا جیسے چند گھنٹے پہلے باہر لان میں جو لڑکی مہمانوں کے ساتھ چہک رہی تھی وہ کوئی اور تھی اور اس کمرے میں جو اُداس اور خوفزدہ چھوٹی بیگم بیٹھی ہے وہ کوئی اور ہے۔

میرے آنے سے پہلے ہی چائے کے برتن میز پر رکھے ہوئے تھے۔ نرملا نے اپنے ہاتھ سے چائے بنائی اور ایک پیالی میری طرف سرکا دی۔ سرد ہوا کسی ادھ کھلے روشندان سے گزر کر فانوس کی روشنی سے اٹکھیلیاں کرنے لگی۔ نرملا نے اپنے شانوں پر قیمتی شال کو سنبھالا اور کھڑکیوں سے باہر گہری تاریکی کو گھورتی ہوئی بولی۔

انسپکٹر صاحب! جیسا کہ آپ جانتے ہیں ہم زمیندار لوگ نہ بھی چاہیں تو بہت سی دشمنیاں خوامخواہ پیدا ہو جاتی ہیں۔ مجھے بھی پتا جی کی طرف سے بہت سی عداوتیں ورثے میں ملی ہیں۔ معلوم نہیں کیوں کچھ دنوں سے مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ کوئی شخص میری جان کا دشمن بنا ہوا ہے۔ ایک دو واقعے ایسے ہوئے ہیں جنہوں نے مجھے بہت زیادہ پریشان کیا ہے۔ میں کوئی بزدل لڑکی نہیں ہوں اور یہ بات آپ بھی جانتے ہوں گے مگر کچھ دنوں سے میرا دل ڈرا ہوا ہے۔ پچھلے ہفتے کی بات ہے میں ساری رات جاگتی رہی اور روتی رہی مجھے پتا جی بڑی شدت سے یاد آرہے تھے۔ وہ تھے تو زندگی کتنی سہل اور محفوظ تھی کوئی غم نہیں تھا، فکر اندیشہ نہیں تھا مگر اب بکھیڑوں اور نت نئے مسئلوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ اس رات اچانک مجھے پتا جی کی بات یاد آئی جو انہوں نے آپ کے بارے میں کہی تھی نواز صاحب! سچ پوچھئے تو مجھے یوں لگا جیسے ایک دم بہت بڑا بوجھ میرے سر سے اُتر گیا۔ بے میں خود کو کوسنے لگی کہ اس سے پہلے میں نے اس انداز میں کیوں نہیں سوچا۔ اب آپ کو ان دیواروں میں اپنے سامنے دیکھ رہی ہوں تو یوں محسوس ہو رہا ہے کہ کئی راتوں کے بعد آج پہلی بار چین کی نیند آئے گی

نرملا دیوی کافی دیر باتیں کرتی رہی اور میں سنتا رہا صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ زبردست ذہنی دباؤ کا شکار رہی ہے اور اب میری موجودگی سے اسے حوصلہ ملا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی میں نے یہ اندازہ بھی لگایا کہ وہ اپنی پریشانی کا سبب چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔

میں نے پوچھا، نرملا دیوی آپ نے اپنے ڈر کی وضاحت نہیں کی۔ آخر کس کی طرف سے خطرہ ہے آپ کو؟ اور اس خطرے کا سبب کیا ہے؟

نرملا نے کہا، نواز صاحب میں آپ سے کچھ چھپانا نہیں چاہتی اور مجھے چھپانا بھی نہیں چاہئے لیکن میں ابھی خود کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی۔ اگر آپ مجھے چند دن کی مہلت دیدیں تو میں زیادہ آسانی کے ساتھ آپ سے بات کر سکوں گی۔

میں نے کہا، نرملا دیوی میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے شاید کل یا پرسوں مجھے یہاں سے واپس جانا پڑے۔ میں چاہتا ہوں کہ مجھے آپ کے مسئلے کا پتہ لگ جائے اور اگر کوئی کام میرے لائق ہے تو میں وہ انجام دے دُوں۔

یکا یک نرملا کے خوبصورت چہرے پر بے پناہ مایوسی پھیل گئی۔ وہ بولی، نواز صاحب مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو اپنی بات ٹھیک طرح سمجھا نہیں سکی۔ یہ بڑا گمبھیر مسئلہ ہے سمجھئے کہ...... کہ میری زندگی اور موت کا سوال ہے۔ اگر آپ مجھے زندگی اور موت کی کشمکش میں چھوڑ کر جانا چاہتے ہیں تو پھر بے شک چلے جائیے میں آپ کو نہیں روکوں گی۔

مرحبا سبوس اسپغول

قدرت کی صحت بخش غذا اور دوا

مرحبا کا سبوس اسپغول جو کہ پلانٹیگو اوویٹا (Plantago Ovata) سے حاصل کیا جاتا ہے بغیر اسٹارچ کے کاربوہائیڈریٹ پر مشتمل انتہائی حل پذیر فائبر ہے۔ یہ قطعی طور پر بے ضرر اور خاص طور پر دائمی قبض اور بیسلری پیچش کے لئے مفید ہے۔

خواص: قبض روز مرہ کی شکایات میں سب سے زیادہ عام ہے جبکہ بیسلری پیچش اور دائمی قبض تو عالمگیری حیثیت اختیار کرچکی ہے۔ ان بیماریوں میں سبوس اسپغول کا استعمال لیکوئیڈ پیرافین یا اس کی مصنوعات سے بالکل جدا' آرام دہ اور بہتر ہے کیونکہ لیکوئیڈ پیرافین آنتوں میں حیاتین اور غذا کے معدنی اجزاء کے انجذاب کو روک دیتا ہے جبکہ چھلکا اسپغول کے استعمال سے ایسی کوئی پیچیدہ صورتحال پیدا نہیں ہوتی مزید برآں یہ امیبائی پیچش' السٹریٹیو کولائٹس (Ulcerative) اور بواسیر میں بھی انتہائی مؤثر علاج ہے جدید تحقیق سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ چھلکا اسپغول کا باقاعدہ استعمال موٹاپے اور خون میں چربی جمنے جیسی مہلک بیماریوں کا تدارک کرتا ہے۔

طریقہ عمل: مرحبا کا سبوس اسپغول معدہ اور آنتوں میں پانی کی کافی مقدار جذب کرتا ہے جس سے اس کی شکل جیلی کی طرح ہوجاتی ہے۔ جو نہ صرف آنتوں کی دیواروں کو خراشوں سے محفوظ رکھتی ہے بلکہ چکناہٹ بھی پیدا کرتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ معدے اور آنتوں سے مضرصحت اجزاء جیسے چکنائی اور کولیسٹرول کے مالیکول' فالتو کاربوہائیڈریٹ وغیرہ کو دبوچ لیتی ہے جس کی بدولت جسم میں ان اجزاء کا توازن برقرار رہتا ہے جو کہ موٹاپے کو کم کرتا ہے اور خون کی نالیوں کو تنگ ہونے سے بچاتا ہے حال ہی میں نیشنل کولیسٹرول ایجوکیشن پروگرام برائے ایڈلٹ اور ٹریٹمنٹ گائیڈلائینز یو۔ ایس۔ اے (U-S-A) نے سبوس اسپغول کے استعمال پر کافی زور دیا ہے جو کہ خون میں کولیسٹرول گھٹانے کا ایک آسان طریقہ ہے۔ اسپغول میں پیکٹن' میوکی لیجز' کئی ایک ہیمی سیلولوزیز اور پوٹاشیم جیسے اجزاء شامل ہیں جن میں کولیسٹرول گھٹانے کی صلاحیت موجود ہے۔

خوراک: بالغ افراد کے لئے دو چائے کے چمچ ایک گلاس پانی کے ساتھ دن میں دو یا تین بار بچوں کے لئے آدھا چمچ سے ایک چمچ تک دان میں دو سے تین بار

ہدایات: **مرحبا** کا سبوس اسپغول' دودھ' مشروبات اور دیگر اشیاء کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے' چھلکا اسپغول کو نگل لیں' چبا کر نہ کھائیں' شیر خوار بچوں کو نہ دیں' بدہضمی کی صورت میں استعمال نہ کریں' ضرورت کے مطابق خوراک کو کم یا زیادہ کیا جاسکتا ہے۔

142 مین قائد اعظم انڈسٹریل اسٹیٹ لاہور۔ پاکستان
فون 04235156068-042-111152-152
E-mail info@marhaba.com.pk
Website:www.marhaba.com.pk
مرحبا لیبارٹریز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
مرحبا
SINCE 1975

میں نے دیکھا نرملا کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے ہیں۔ اس کا دل بہت بُری طرح دُکھا ہوا تھا۔ وہ لڑکی جسے علاقے کے لوگ چھوٹی بیگم کہتے تھے اور مہارانی کا رتبہ دیتے تھے تنہائی میں میرے سامنے بے چارگی کی تصویر بنی بیٹھی تھی۔ ایک دم مجھے اس پر ترس سا آنے لگا۔ میں نے کہا' اس کا مطلب ہے آپ مجھے یہاں روکنا چاہتی ہیں اور یہ بھی بتانا نہیں چاہتیں کہ کیوں روک رہی ہیں۔

وہ بولی' میں بتانے سے انکار نہیں کر رہی صرف تھوڑا سا وقت چاہتی ہوں تا کہ جو کچھ بتاؤں وہ آپ کے لئے سودمند ہو نہ کہ آپ کو اُلجھا کر رکھ دے۔

اس بات پر نرملا دیوی سے لمبی بحث کی جا سکتی تھی مگر اس کی شیشہ آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک دیکھ کر میں نے بحث کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ کچھ دیر کی گفتگو کے بعد ہم دونوں میں یہ طے پا گیا کہ میں کم از کم پانچ روز یہاں قیام کروں گا اور اس دوران نرملا مجھے اصل بات سے آگاہ کر دے گی۔ نرملا نے میرے اور بلال شاہ کے لئے ایک ایسا کمرہ خالی کرا دیا جو اس کی خواب گاہ کے بالکل قریب تھا۔ اگلی دو راتیں ہم نے اسی کمرے میں گزاریں جو نرملا کی خواب گاہ کے بالکل ساتھ تھا۔

تیسری رات گیارہ بجے کے قریب میں سونے کے لئے لیٹ گیا لیکن بلال شاہ بدستور جاگ رہا تھا اور کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ بار بار رُکتا' گردن کو کبھی لمبا اور کبھی چھوٹا کر کے زوردار ڈکار لیتا اور پھر ٹہلنا شروع کر دیتا۔ اب آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے اسے نیند کیوں نہیں آ رہی تھی۔ پیٹ میں اوپر سے نیچے تک اناج ہی اناج بھرا ہو تو نیند بیچاری کیا کرے۔ میں بظاہر آنکھیں بند کئے لیٹا تھا لیکن کبھی کبھی درزیدہ نگاہوں سے بلال شاہ کی حرکات و سکنات دیکھ لیتا تھا۔ جلد ہی بلال شاہ تاڑ گیا کہ میں جاگ رہا ہوں وہ اپنی ڈکار بازی چھوڑ کر میرے پاس آ بیٹھا کہنے لگا۔

خان صاحب مجھے ایک بات کی سمجھ نہیں آئی چھوٹی بیگم نے ہمیں اپنے گودے سے لگا کر کیوں رکھا ہوا ہے؟

بلال شاہ کا مطلب یہ تھا کہ نرملا نے ہمیں اپنی خواب گاہ کے اتنا قریب کمرہ کیوں دیا ہے؟ میں نے کہا۔

شاہ جی یہ تو وہی بتا سکتی ہے' وہ میزبان ہے اور ہم مہمان وہ جہاں جی چاہے ٹھہرائے۔ لیکن تم اپنی آواز ذرا دھیمی رکھو بیچ میں صرف ایک دیوار ہے یہ نہ ہو وہ سن لے۔

بلال شاہ دھیمی آواز میں بولا' خان صاحب کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے میرا مطلب ہے...... وہ آپ پر بڑی مہربان نظر آتی ہے۔

میں بلال شاہ کی بات کا مطلب سمجھ گیا' کسی عورت کو میرے قریب دیکھ کر اس کے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگتے ہیں۔ اس نے جیسے قسم کھا رکھی تھی کہ مجھے عورت کے سائے سے بھی محفوظ رکھنا ہے۔ میں نے اس کی غلط فہمی دُور کرتے ہوئے کہا' بھلے مانس اس کی تو شادی بھی ہو چکی ہے اور وہ اپنے شوہر سے اتنی ہی محبت کرتی ہے جتنی تمہیں مٹر پلاؤ کوفتے اور سری پائے سے ہے۔

واقعی؟ بلال شاہ نے حیرانگی سے پوچھا۔

بالکل۔ میں نے جواب دیا۔ دو برس پہلے اس کا بیاہ ہوا تھا ویسے وہ ابھی تک کنواری ہے۔

بلال شاہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں اس سے کوئی مذاق نہیں کر رہا تھا حقیقتاً نرملا کی شادی ہو چکی تھی لیکن ابھی تک رخصتی نہیں ہوئی تھی۔ معلوم نہیں اس کی وجہ کیا تھی۔ مجھے صرف اتنا معلوم تھا کہ نرملا اس شادی پر بہت خوش تھی اور اس کا شوہر اجمیر کے ایک کھاتے پیتے زمیندار کا پڑھا لکھا بیٹا ہے۔ مجھے یہ ساری باتیں اس لئے معلوم تھیں کہ جن دنوں یہ شادی ہوئی میں گڑھی کے علاقے میں ہی کام کر رہا تھا۔

بلال شاہ یہ باتیں سن کر حیران ہوا' کہنے لگا کہیں یہ بکھیڑا اسی آدھی شادی کا تو نہیں۔

فی الحال تو کچھ نہیں کہا جاسکتا' میں نے جواب دیا۔ دیوی کچھ بتائے گی تو پتہ چلے گا۔

اور وہ کب بتائے گی؟

جب بھی بتائے تمہیں کیا' تم نے واپس جا کر کونسا کوئی کام کرنا ہے کھاؤ پیئو اور موج اُڑاؤ۔

وہ پیٹ پر ہاتھ پھیر کر بولا' ویسے خان صاحب آپس کی بات ہے نرملا دیوی آپ کی عزت بہت کرتی ہے۔ صبح میرے سامنے مسلمان قصائی سے بکرا حلال کروایا تھا اس نے۔

میں نے کہا' یہ کیا بات ہوئی مسلمان قصائی نے بکرا حلال کیا تو تم نے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ میری بہت عزت کرتی ہے۔

آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کیا کریں جی' میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ ہمارے کھانے پینے کا خاص الخاص خیال رکھتی ہے اور......

یکا یک بلال شاہ بولتے بولتے رُک گیا' اس کے خاموش ہونے کی وجہ ایک سایہ تھا جو کھڑکی کے سامنے سے لہرا کر گزر گیا تھا۔ گزرنے والا یوں دبے پاؤں گزرا تھا کہ پاؤں کی مدہم سی آہٹ بھی نہیں آئی تھی۔ میں نے بلال شاہ کی طرف اور بلال شاہ نے میری طرف دیکھا میں تیزی سے اُٹھ کر دروازے پر آیا۔ آہستگی سے پٹ کھول کر باہر دیکھا سایہ برآمدے کی مدہم روشنی سے باغیچے کی تاریکی میں گم ہو رہا تھا۔ میں کمرے سے نکل کر دبے پاؤں باغیچے کی طرف بڑھا برآمدے کے آخری سرے پر پہنچ کر میں نے دیکھا ایک فربہ جسم کی عورت یا لڑکی فوارے کی روشنی میں درختوں کے پیچھے گم ہوتی نظر آئی۔ اس کا انداز بالکل چوروں کا سا تھا۔ اتنی رات گئے ایک عورت کا اس طرح گھومنا پراسرار تھا۔ تمام اندیشے بالائے طاق رکھ کر میں بھی عورت کے پیچھے لپکا۔ میرے جسم پر معمولی لباس تھا اور سرد ہوا کپکپی طاری کر رہی تھی۔ پاؤں میں چپل تھی اور مجھے خاص طور پر پاؤں دبا کر چلنا پڑ رہا تھا۔ فوارے کے نزدیک سے میں نے دیکھا کہ عورت سیدھی حویلی کے اصطبل کی طرف جا رہی ہے۔ یکا یک اندھیرے میں اسے نجانے کیا نظر آیا کہ وہ ٹھٹھک کر رُکی پھر چیخی اور مڑ کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ جھاڑیوں سے ایک سایہ نکل کر اس کے پیچھے لپکا۔ عورت کے پیچھے بھاگنے والا بھی کوئی فربہ اندام شخص تھا۔ اب میں خاموش تماشائی بنا نہیں رہ سکتا تھا۔ جونہی وہ دونوں مہندی کے پودوں میں گھسے' میں بھی بھاگتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ میرے وہاں پہنچنے تک فربہ اندام شخص عورت کو چھاپ چکا تھا۔ وہ اس کی گرفت میں مچل رہی تھی اور چلا رہی تھی۔ میرے سامنے اس نے ایک زوردار دوہتڑ مرد کے سر پر مارا جواب میں مرد چیخ کر بولا۔

خان صاحب پکڑلی ہے' پکڑلی ہے۔

میرے چودہ طبق روشن ہوگئے' موٹی عورت سے لپٹا ہوا موٹا مرد بلال شاہ تھا۔ عورت کی چیخ و پکار دُور دُور تک گونج رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اصطبل کی طرف سے کئی افراد بھاگتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں لالٹینیں تھیں۔ ایک شخص کے ہاتھ میں طاقتور رائفل بھی نظر آ رہی تھی۔ عورت اب اُٹھ کر کھڑی ہوگئی تھی اور دوپٹہ آنکھوں پر رکھے اونچی آواز میں رونے لگی۔

بشیراں تم اس وقت یہاں؟

بلال شاہ دلیر ہوکر بولا۔ یہ چوروں کی طرح اصطبل کی طرف جا رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر بھاگ کھڑی ہوئی یہاں پہنچ کر ٹھوکر لگی اور گر گئی۔

عورت کے لباس اور حلیئے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کے پاس اس سوال کا کوئی معقول جواب نہیں ہے۔ رائفل بردار نے ایک بار پھر پوچھا' بشیراں کیا ہوا ہے تمہیں کچھ بتاؤ بھی؟

وہ اس سوال کے جواب میں بھی روتی ہی رہی۔

اب یہاں اچھا خاصا مجمع لگ چکا تھا۔ اتنے میں نرملا دیوی بھی وہاں پہنچ گئی۔ اس نے ابھی شب خوابی کا لباس نہیں پہنا تھا وہ خاصی برہم دکھائی دیتی تھی۔ ایک خادم گیس لیمپ اُٹھائے اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

کیا ہوا بشیراں؟ نرملا نے قریب آ کر پوچھا۔

بشیراں نے روتے روتے بلال شاہ کی طرف اشارہ کیا اور بولی چھوٹی بیگم اس نے مجھے نیچے گرایا ہے اور میرے منہ پر تھپڑ بھی مارا ہے۔ یہ دیکھئے گرنے سے میرا سارا بازو چھل گیا ہے۔

اس نے روتے روتے اپنا ایک بازو روشنی کی طرف کر دیا۔ کہنی سے کھال اُتر گئی تھی اور خون بہہ رہا تھا۔ نرملا نے گھور کر بلال شاہ کی طرف دیکھا بلال شاہ تیزی سے بولا۔

چوہدرانی جی! یہ چوروں کی طرح اصطبل کی طرف جا رہی تھی۔ میں نے پوچھا کون ہے تو یہ بھاگ کھڑی ہوئی..... اور تم نے اسے پکڑ کر تھپڑ مارنے شروع کر دیئے؟ نرملا نے غصے سے بات مکمل کی۔ میں نے بلال شاہ کی طرفداری کرتے ہوئے کہا' نرملا دیوی بات دراصل یہ ہے کہ میں اور بلال شاہ کمرے میں بیٹھے تھے کہ ایک سایہ سا کھڑکی کے پاس سے گزرا۔ گیارہ بج چکے ہیں ہمارا چونکنا لازمی تھا۔ ہم کمرے سے نکل آئے......

میں آپ کی بات سمجھ رہی ہوں۔ نرملا نے بیزاری سے میری بات کاٹی۔ لیکن بندے کو اپنے پرائے کی پہچان تو ہونی چاہئے۔ بشیراں اس حویلی کی پرانی ملازمہ ہے اور میری ہدایت پر یہاں آئی تھی' آپ کے ساتھی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور حشر کر دیا بیچاری کا۔

نرملا کے لہجے نے مجھے حیران کر دیا۔ مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ وہ ۔ ۔ کے سامنے ایسی سرد مہری سے بات کرے گی۔ کہاں دوپہر تک آپ جناب ہو رہی تھی اور کہاں یہ غیروں جیسا رویہ۔ میں کوئی بچہ نہیں تھا

اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ پچھلے چند گھنٹوں میں حویلی کے اندر کوئی اہم تبدیلی رونما ہو گئی ہے۔ شام کے وقت بھی میرا اور بلال شاہ کا کھانا کمرے میں ہی بھجوا دیا گیا تھا حالانکہ اس سے پہلے ہمارا کھانا اہل خانہ کے ساتھ ایک ہی میز پر ہوتا تھا۔

میں نے اپنی حیرانی پر قابو پاتے ہوئے نرملا سے پوچھا' تو کیا اس عورت کو آپ نے بھیجا تھا؟۔

نرملا نے اس بات کا جواب اثبات میں دیا اور بتایا کہ ایک بوڑھی ملازمہ کی طبیعت خراب تھی اسے ہسپتال پہنچانا تھا بشیراں کو اصطبل بھیجا گیا تھا تاکہ وہ بگھی بان کو بگھی تیار کرنے کی ہدایت کرے۔

اتنے میں نرملا کی دو چھوٹی بہنیں بھی وہاں آ گئیں ان میں سے بارہ تیرہ سالہ کوشل خاص طور پر بہت تیز و طرار تھی اس نے ملازمہ کی زخمی کہنی دیکھی تو بلال شاہ کو گھورنا شروع کر دیا۔ مجھے یہ سب کچھ بڑا بُرا لگ رہا تھا یہ تو عرش سے فرش پر پھینکنے والی بات تھی۔ کچھ دیر بعد یہ معاملہ رفع دفع ہو گیا اور ہم اپنے کمرے میں واپس آ گئے۔ بلال شاہ ڈر رہا تھا کہ شاید میں اسے بُرا بھلا کہوں گا لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میری نظر میں بلال شاہ بالکل بے قصور تھا۔ چور تو ملازمہ کے دل میں خود تھا جو بلال شاہ کو دیکھ کر ڈر گئی تھی اور دوڑ پڑی تھی۔

اگلے روز صبح آٹھ بجے کے قریب حویلی کے دو ملازم کھانا لے کر آئے تو کھانے کی ٹرے میں ایک پرچی بھی تھی۔ یہ پرچی نرملا کی طرف سے تھی اس نے لکھا تھا۔

سوری انسپکٹر صاحب! حویلی میں کچھ مہمان آ رہے ہیں میں ایک دو دن بہت مصروف رہوں گی بہتر تو یہی تھا کہ آپ چند روز یہاں اور قیام کرتے لیکن اگر زیادہ مصروفیت ہے تو فی الحال آپ جودھ پور کا ایک چکر لگا آئیں۔ میں آپ کو بعد میں دوبارہ بلوا لوں گی تعاون کے لئے بے حد شکریہ۔

تحریر کا صاف مطلب یہ تھا کہ نرملا کو اب ہماری

ضرورت نہیں اور وہ ہمیں یہاں سے چلتا کرنا چاہتی ہے۔ میں نے پرچی کی پشت پر لکھ دیا نرملا دیوی ہم آپ کے کہنے سے پیشتر ہی جانے کیلئے تیار بیٹھے ہیں' مہمان نوازی کا بے حد شکریہ۔ میں نے پرچی ناشتے سمیت واپس بھیج دی۔ تھوڑی ہی دیر بعد میں اور بلال شاہ حویلی سے رخصت ہو رہے تھے۔ نرملا کا منیجر ہمیں دروازے تک چھوڑنے آیا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہم حویلی سے پختہ سڑک تک جانے کے لئے حویلی کی بگھی استعمال کریں لیکن میں نے یہ پیش کش قبول نہیں کی۔ دو اڑھائی فرلانگ پیدل چلنے کے بعد ہمیں ایک تانگہ مل گیا اور ہم اس پر سوار ہو کر واپس روانہ ہو گئے۔ بلال شاہ کا منہ پھولا ہوا تھا وہ راستے بھر گڑھی اور گڑھی کی چھوٹی بیگم کو کوستا رہا۔

بھلا یہ بھی کوئی بات ہے ہم کوئی درخواست دے کر تو یہاں نہیں آئے تھے اپنی ضرورت کے لئے بلایا تھا ہم کوئی بھوکے تھے ان کی روٹیوں کے بد دماغ کہیں کے ایسے پڑھے لکھوں سے تو گنوار اچھے۔

میں بلال شاہ کو بار بار ٹوکتا رہا کہ کوچوان سُن لے گا لیکن اس کے دماغ کو تو ہوا چڑھی ہوئی تھی۔ وہ بولتا رہا' یہ لوگ مطلب کے یار ہوتے ہیں مطلب تھا تو قدموں میں بچھے جا رہے تھے مطلب نہ رہا تو تم کون ہم کون۔ مجھے تو زہر لگی ہے یہ چھوٹی بیگم میرے بس میں ہو تو اب کبھی تھوکوں بھی نہ اس کے منہ پر......

ہماری منزل آ چکی تھی' کرایہ دے کر ہم تانگے سے اُتر آئے۔ جب بس سٹاپ کی طرف جا رہے تھے میں نے بلال شاہ سے کہا' بلال شاہ تم نے نرملا کے بارے میں جو اندازہ لگایا ہے وہ زیادہ صحیح نہیں ہے۔

کیا مطلب؟ اس نے تنک کر پوچھا۔

مطلب یہ کہ نرملا کسی گہرے چکر میں پھنسی ہوئی ہے اور اس نے ہمارے ساتھ جو بدسلوکی کی ہے وہ کسی مجبوری کی وجہ سے ہے۔

بلال شاہ نے کہا' خان صاحب بدسلوکی مجبوراً ہو یا مرضی سے بدسلوکی ہوتی ہے۔ اسے کیا حق پہنچتا تھا رات میری بے عزتی کرنے کا؟ اس نے ہمیں اپنی حفاظت کے لئے بلایا تھا' اگر ہم ایک مشکوک عورت سے اُلجھ پڑے تھے تو یہ ہماری ڈیوٹی کا حصہ تھا اس میں ہمارا کیا فائدہ تھا ہم نے کوئی رشوت کھانی تھی؟

میں نے کہا' بلال شاہ میں تمہاری باتیں سمجھ رہا ہوں لیکن جو میں کہہ رہا ہوں وہ تم نہیں سمجھ رہے۔ ہمیں غور کرنا چاہئے کہ ایک ہی دن میں نرملا دیوی کا رویہ ہم سے کیوں بدل گیا؟ ملازمہ والا واقعہ تو بعد میں ہوا اس سے پہلے ہی وہ ہم سے بیزار سی ہو گئی تھی۔ آخر کیا قصور تھا ہمارا؟ یہ ایک پیچیدہ معاملہ ہے اور ہمیں نرملا کے رویئے کو خواہ مخواہ عزت بے عزتی کا مسئلہ نہیں بنانا چاہئے۔

تو پھر کیا کرنا چاہئے؟ بلال شاہ نے اُکتا کر پوچھا۔

واپس چلنا چاہئے۔

واپس تو جا رہے ہیں۔

تھانے کی طرف نہیں نرملا دیوی کی طرف۔

کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ وہ بے حد حیران ہو کر بولا۔

ٹھیک کہہ رہا ہوں۔

میں نے ہاتھ کے اشارے سے ایک تانگے والے کو روکا اور اسے کہا کہ وہ ہمیں جھوک پال لے جائے۔ جھوک پال نام کا یہ گاؤں گڑھی کے نزدیک ہی تھا۔ یہاں کا نمبردار ہنس مکھ میرا شناسا تھا۔ مجھے امید تھی کہ وہ ہمارے ساتھ پورا تعاون کرے گا اور ہمیں جھوک پال میں رہنے کے لئے ٹھکانہ بھی مل جائے گا۔

میری توقع کے مطابق ہنس مکھ ہمارے ساتھ بڑی مہربانی سے پیش آیا خاطر مدارت کی اور فراخدلی سے بولا کہ ہم جب تک چاہیں وہاں رہ سکتے ہیں۔

میں نے کہا' ہنس مکھ بات جب تک کی نہیں ہم صرف دو تین روز یہاں رہنا چاہتے ہیں لیکن رازداری

سے۔ میرا مطلب ہے کہ ہماری یہاں موجودگی کا پتہ چھوٹی بیگم کو نہ چلے۔

ہنس مکھ کے چہرے سے ظاہر ہوا کہ میں نے اسے کڑی آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ بہرحال میرے اصرار پر وہ آمادہ ہوگیا کہ اصول کی خلاف ورزی کرتے ہوئے وہ اس معاملے کی خبر چھوٹی بیگم کو نہیں ہونے دے گا۔

ٹھکانہ مل گیا تو میں نے ٹھنڈے دل سے اس سارے معاملے پر سوچ بچار شروع کی۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھے نرملا سے ہمدردی محسوس ہورہی تھی۔ میں نے حویلی میں اپنے تین روز قیام کے دوران نرملا کے بارے کافی کچھ جان لیا تھا۔ اس بے چاری پر کم عمری ہی میں بھاری ذمہ داریاں پڑ گئی تھیں۔ کنور امر سنگھ کی اولاد میں سب سے بڑی وہی تھی۔ ماں بچپن میں ہی مر چکی تھی باپ کی موت کے بعد اب وہی گھر کی کرتا دھرتا تھی۔ نرملا سے چھوٹی تین بہنیں تھیں اور سب سے چھوٹا بھائی تھا۔ وہ آگرہ کے کسی سکول میں پڑھتا تھا چاروں بہن بھائیوں کی دیکھ بھال کے ساتھ جاگیر کی ذمہ داری بھی نرملا پر عائد ہوچکی تھی۔ وہ جو ایک برس پہلے تک یونیورسٹی کی طالب تھی اب چھوٹی بیگم کہلاتی تھی۔ بھاری بھرکم زیور اور لبادے پہن کر باپ کی کرسی پر بیٹھتی تھی اور جاگیر کا کاروبار چلاتی تھی۔ میں نے ایک بات کا اور بھی اندازہ لگایا تھا۔ جاگیردار گھرانے کے مالی حالات اتنے اچھے نہیں تھے جتنے لوگ سمجھتے تھے۔ جاگیر کی بہت سی زمین ایک سرکاری سکیم میں آرہی تھی اور پچھلے چار پانچ سال سے اس کا مقدمہ چل رہا تھا۔ اس کے علاوہ بھی یہ گھرانہ کئی مقدموں میں الجھا ہوا تھا۔ مقدموں پر خرچ بڑھتا جارہا تھا اور جاگیر کی آمدن وہیں کی وہیں تھی۔

خیر یہ تو نرملا کے سوچنے کی باتیں تھیں میں ایک بات جانتا تھا اگر نرملا نے مجھے یہاں بلایا تھا تو کسی نہایت اہم مسئلہ کے لئے بلایا تھا۔ پھر وہ مجھے بتا بھی نہیں سکتی تھی کہ مسئلہ کیا ہے ایک اور بات بھی میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا تھا ملازمہ بشیراں اگر اصطبل کی طرف جارہی تھی تو کسی خاص مقصد سے جارہی تھی اور نرملا نے جھوٹ بولا تھا کہ کسی بیمار ملازمہ کو ہسپتال پہنچانا تھا۔ جس وقت یہ واقعہ ہوا رات کے ساڑھے گیارہ بج چکے تھے اور نرملا نے اس وقت تک شب خوابی کا لباس نہیں پہنا تھا۔ عین ممکن تھا کہ بیمار ملازمہ کے بجائے اسے خود کہیں جانا ہو۔ میں ان معاملات پر جتنا سوچ رہا تھا اتنا ہی الجھن کا شکار ہورہا تھا۔ پھر میرا دھیان نرملا کی ادھوری شادی کی طرف چلا گیا۔ شروع میں میرا خیال تھا کہ شاید نرملا کی پریشانیوں کا سبب یہ شادی ہے لیکن اب میں مختلف انداز میں سوچ رہا تھا۔ پچھلے تین روز میں میں نے جو معلومات حاصل کی تھیں ان کے مطابق اس معاملے میں کوئی پیچیدگی نہیں تھی۔ یہ شادی نرملا کی دادی ساس کے اصرار پر ہوئی تھی۔ اس کی دادی ساس قریب المرگ تھی اور وہ ہر صورت اپنے پوتے کے سر پر سہرا دیکھنا چاہتی تھی۔ نرملا اس شرط پر شادی کے لئے رضامند ہوئی تھی کہ رخصتی کچھ عرصہ بعد ہوگی۔ وہ بیمار باپ کو نوعمر بہنوں کے سہارے چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی تھی بعدازاں باپ فوت ہوگیا اور نرملا کی ذمہ داریاں اور رنگ اختیار کر گئیں۔ اب وہ چاہتی تھی کہ اس کی چھوٹی بہن ایم ایس سی کے امتحان سے فارغ ہوجائے اور بہن بھائیوں کی نگہبانی کرنے لگے تو وہ شوہر کے گھر رخصت ہوجائے گی۔ نرملا کا زمیندار شوہر راج پانڈے بڑا بھلا مانس نوجوان تھا۔ پڑھا لکھا بھی تھا اس نے نرملا پر کسی طرح کا دباؤ نہیں ڈالا تھا۔ وہ جاگیر کے مسائل حل کرنے میں بھی اس کی مدد کرتا رہتا تھا

ان حالات کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا بہت مشکل تھا کہ نرملا کے مسئلے کا تعلق اس کی ازدواجی زندگی سے ہے۔ میں دیر تک اپنے خیالوں میں الجھا رہا۔ بیٹھے بیٹھے اچانک میرے دل میں آئی کہ آج رات حویلی کی نگرانی کرنی

چاہئے اگر واقعی کل رات نرملا کہیں جارہی تھی تو ممکن تھا کہ آج رات وہ پھر کوشش کرے۔ یہ سوچتے ہی میں اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا اس وقت سہ پہر کے تین بجے تھے۔ بلال شاہ لمبی لسی پی کر اور لمبی تان کر سویا ہوا تھا۔ میں نے نمبردار ہنس مکھ کو بلایا اور اس سے کہا کہ مجھے ایک رات کے لئے کسی کھیت مزدور کے کپڑے چاہئیں۔ میری یہ فرمائش پوری کرنے میں ہنس مکھ نے زیادہ دیر نہیں لگائی۔ وہ مختلف رنگوں اور ناپوں کے تین چار جوڑے لے آیا۔ ان میں سے ایک جوڑا مجھے ٹھیک آیا۔ پرانی سی دھوتی قمیص پر میں نے پھٹی پرانی ڈبی دار چادر اوڑھ لی اور دیسی جوتی پہن کر بالکل تیار ہوگیا۔ پولیس ملازمین کو اکثر بھیس بدلنا پڑتا ہے ویسے دیہاتی علاقوں میں بھیس بدلنا زیادہ مشکل نہیں ہوتا خاص طور پر سردیوں میں تو بہت آسانی رہتی ہے ہر شخص منہ سر چادر میں لپیٹے پھرتا ہے۔

بلال شاہ نے مجھے کھیت مزدور کے روپ میں دیکھا تو حیران ہوا۔ میں اسے سب کچھ سمجھا کر خاموشی سے روانہ ہوگیا۔ نمبردار ہنس مکھ نے میرے لئے ایک مریل سی گھوڑی کا انتظام کردیا تھا۔ بغیر زین کی گھوڑی پر بیٹھ کر شام کے جھٹپٹے میں' میں گڑھی کی طرف چل دیا۔ گڑھی کا فاصلہ جھوک پال سے قریباً دو میل تھا میں کھیتوں کے درمیان سفر کرتا گڑھی کی حدود میں پہنچا تو اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ قصبے کے کچے پکے گھروں میں چراغ جل رہے تھے اور حویلی کی دوسری منزل پر جگمگاتے فانوس بھی دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے پہلے گڑھی کے چاروں طرف ایک چکر لگایا پھر اس نیم پختہ راستے کے کنارے گھات لگا کر بیٹھ گیا جہاں سے حویلی کا تانگہ یا بگھی گزر سکتی تھی۔ جس جگہ میں نے ڈیرہ لگایا وہ ایک پرانا کنواں تھا۔ ساتھ ہی برگد کے دو بڑے بڑے درخت تھے۔ میں ان کے نیچے اُپلے جلا کر بیٹھ گیا۔ گھوڑی کو ساتھ رکھنا مناسب نہیں لگا اسے میں نے قریب ہی سرکنڈوں کے اندر کھوٹا ٹھونک کر باندھ دیا۔ میں ساری رات بھی اس جگہ بیٹھا رہتا تو کسی کو شک نہیں گزر سکتا تھا۔ دیہات میں مسافر اسی طرح سرراہ آگ جلا کر بیٹھ جاتے ہیں اور بعض اوقات ساری رات گزار دیتے ہیں۔

میں نے بھی وہ ساری رات اسی ویران کنوئیں کے اردگرد گھومتے ہوئے گزار دی۔ نیم پختہ راستے کی طرف دیکھ دیکھ کر میری آنکھیں پتھرا گئیں لیکن جس کا انتظار تھا وہ شاہکار نہیں آیا۔ صبح پو پھٹنے سے پہلے میں نے سرکنڈوں سے گھوڑی نکالی اور واپس جھوک پال روانہ ہوگیا۔ یہ عمل اگلی رات پھر دہرایا گیا شام سے ذرا پہلے ہی میں اپنے اڈے پر پہنچ گیا۔ آج میں اپنے ساتھ وقت گزاری کے لئے حقہ بھی لایا تھا۔ دیر تک میں حقہ گڑگڑاتا رہا اور موہوم امید کے سہارے راستے کی طرف دیکھتا رہا۔ اس وقت دس بجے تھے جب مجھے نیم پختہ راستے پر بگھی کی ہچکولے کھاتی روشنیاں نظر آئیں۔ اچانک میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہوگئی۔ یقینی بات تھی کہ یہ حویلی ہی کی بگھی ہے۔ اگر بگھی میں نرملا بھی موجود تھی تو پھر آج رات کوئی نہایت اہم انکشاف ہونے والا ہے۔

میں برگد کی آڑ میں کھڑا ہوگیا اور خوب توجہ سے بگھی کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ ایک شاندار بگھی تھی میں دن کی روشنی میں اسے اچھی طرح دیکھ چکا تھا کار کی طرح کیبن میں شیشے لگے ہوئے تھے۔ گھنٹی کی جگہ بیٹری سے بجنے والا ہارن تھا۔ پہیوں اور پائیدانوں پر دھات کے خوبصورت نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ خوب غور سے دیکھنے کے باوجود مجھے بگھی کے اندر کچھ دکھائی نہیں دیا۔ بگھی گزر گئی تو میں نے بھی گھوڑی سنبھالی اور مناسب فاصلے سے تعاقب شروع کردیا۔ ویران راستوں پر تعاقب کرنا خاصا دشوار کام ہوتا ہے بہرحال مجھے زیادہ مشکل پیش نہیں آئی کیونکہ بگھی کی روشنیاں میری رہنمائی کررہی تھیں۔ قریباً تین میل کا فاصلہ طے کرکے بگھی تحصیل کے ہسپتال میں پہنچ گئی۔

یہ ہسپتال قصبے سے باہر ایک ریلوے لائن کے کنارے واقع تھا۔ درختوں سے گھری ہوئی سنسان سی جگہ تھی۔ بگھی ہسپتال کے نیم روشن گیٹ کے سامنے رُک گئی۔ بگھی بان نے اُتر کر عقبی دروازہ کھولا۔ پہلے ایک تنومند چادر پوش عورت نیچے اُتری۔ مجھے یہ پہچاننے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوئی کہ یہ بشیراں ہے۔ بشیراں کے بعد ایک دوسری عورت نے نیچے قدم رکھا وہ بھی چادر میں چھپی ہوئی تھی۔ بشیراں نے ہاتھ تھام کر اسے نیچے اُتارا اور لے کر ہسپتال کی طرف چل دی۔ ایک لمحے کے لئے میرے ذہن میں آیا کہ شاید واقعی کسی بیمار بڑھیا کو یہاں لایا گیا ہے مگر فوراً یہ خیال ذہن سے نکل گیا۔ چادر پوش عورت کی چال دیکھ کر میرا ذہن پکار اُٹھا کہ یہ گڑھی کی چھوٹی بیگم کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ میرے اس یقین کو ایک اور چیز پختہ کررہی تھی۔ بشیراں کا انداز بڑا مودبانہ تھا اور وہ دوسری عورت سے ایک قدم پیچھے جھکی جھکی چل رہی تھی۔ بگھی بان نے گھوڑوں کے سامنے چارہ ڈالا اور گیٹ کے قریب ایک بنچ پر بیٹھ کر بیڑی کے کش لگانے لگا۔

دونوں عورتیں قریباً ایک گھنٹہ ہسپتال کے اندر رہیں پھر باہر نکلیں اور بگھی میں بیٹھ کر خاموشی سے روانہ ہوگئیں۔ وہ واپس جارہی تھیں مجھے یقین تھا اب بگھی حویلی کے اندر پہنچ کر ہی رُکے گی' تعاقب بے فائدہ ہے۔ میں نے بگھی کو جانے دیا۔ تھوڑی دیر اِدھر اُدھر گھومتا رہا پھر ہسپتال کے اندر چلا گیا۔ یہاں کوئی مجھے پہچانتا نہیں تھا لہٰذا بھیس بدل کر بہت لطف آرہا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا بیکار ہسپتال تھا کمروں میں جالے لگے ہوئے تھے۔ دوائیں تو دُور کی بات ہے روشنی کا مناسب انتظام بھی نہیں تھا۔ ایک برآمدے میں چند بدنصیب مریض ٹوٹی پھوٹی چارپائیوں پر پڑے کراہ رہے تھے۔ پورے ہسپتال میں صرف ایک کمپاؤنڈر اور ایک ڈاکٹر تھا۔ کمپاؤنڈر ایک کمرے میں لمبی تان کر سویا ہوا تھا۔ ڈاکٹر کمرے میں تھا اس نے ٹانگیں اٹھا کر میز پر رکھی ہوئی تھیں۔ پاؤں میں ولایتی جوتے تھے جوتوں کے پاس ہی دو پلیٹوں میں کچھ کیک پیسٹریاں اور بسکٹ رکھے تھے۔ چائے کی تین پیالیاں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ آثار سے نظر آتا تھا کہ حویلی کی دونوں خواتین تھوڑی دیر پہلے تک اس کمرے میں موجود تھیں۔ مجھے اندر آتے دیکھ کر ڈاکٹر پہلے تو چونکا پھر اس کا پارہ ساتویں آسمان کو چھو گیا۔ اس کے بے حد کالے ہونٹ کچھ اور بھی کالے ہوگئے۔ وہ غرا کر بولا کہ مجھے اندر آنے کی اجازت کس نے دی ہے؟ میں نے کراہ کر کہا' میرے سینے میں درد ہورہا ہے۔ اس نے ایک کڑک گالی میرے سینے کو دی اور چوکیدار کو آوازیں دینے لگا۔ پٹھان چوکیدار بگولے کی طرح چکراتا ہوا آیا اور ڈاکٹر کا اشارہ پانے کے بعد مجھے گھسٹ گھسیٹ کر باہر لے آیا۔

خوچے اَم کو بولو کیا تکلیف ہے تمہارے سینے میں؟

میں نے عاجزی سے کہا' میں ڈاکٹر صاحب کو دکھانا چاہتا ہوں۔

وہ غصے سے بولا' اوئے خدائی خوار تم اِم کو جاہل سمجھتا ہے۔ اِم ساڑھے گیارہ برس سے اس ہسپتال میں ہے تمہارے سینے کا تو معمولی بات ہے ہم تو چھوٹا موٹا آپریشن بھی کرلیتا ہے۔

بڑی مشکل کے ساتھ اس خود ساختہ ڈاکٹر سے جان چھوٹی اور میں واپس جھوک پال روانہ ہوا۔

میری بے قراری اب عروج پر پہنچ چکی تھی۔ رات والے واقعے کے بعد یہ بات صاف ہوگئی تھی کہ گڑھی کی چھوٹی بیگم کسی خطرناک معاملے میں اُلجھی ہوئی ہے اسے کیا ضرورت تھی اتنی رات گئے ڈاکٹر کے پاس جانے کی اور پھر یہ سب کچھ چھپانے کی۔ کبھی دل میں یہ بات بھی آتی کہ ہوسکتا ہے اس معاملے میں نرمد کا اپنا قصور ہو۔

میرا دھیان رہ رہ کر اس سیاہ ہونٹوں والے ڈاکٹر کی طرف جا رہا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ میں بطور انسپکٹر اس سے ملاقات نہیں کرسکتا تھا ایسی صورت میں میری یہاں موجودگی کا راز کھل جاتا۔ اگر میں کسی دوسری حیثیت سے ڈاکٹر کے پاس جاتا تو وہ مجھے کچا چبا جانے کا پروگرام بنالیتا۔ بڑا غصیلا شخص تھا وہ۔ اگلی رات اسی کش مکش میں گزر گئی' آخر میں نے فیصلہ کیا کہ اب نرملا کے بجائے اس ڈاکٹر پر نظر رکھی جانی چاہئے۔ آخر کچھ پتہ تو چلے کہ یہ کون ذات شریف ہے۔ یہ کام میری بجائے بلال شاہ زیادہ بہتر طریقے سے انجام دے سکتا تھا وجہ یہ تھی کہ ڈاکٹر نے ابھی اس کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ علی الصبح میں اس بارے میں بلال شاہ سے بات کرنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ ایک سنسنی خیز اطلاع میرے کانوں تک پہنچی اور اس اطلاع کے ساتھ ہی سارا پروگرام درہم برہم ہوکر رہ گیا۔ اطلاع یہ تھی کہ چھوٹی بیگم کل رات حویلی سے غائب ہوگئی ہے۔

یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح گڑھی کے تمام دیہاتوں میں پھیل گئی۔ لوگ حیران تھے کہ نوجوان جاگیردارنی کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ بعض لوگ ابھی تک اس خبر پر یقین نہیں کررہے تھے ان کا خیال تھا کہ بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا جارہا ہے۔ چھوٹی بیگم کسی کام سے نکلی ہوں گی اور بہت ہوا تو رات تک واپس آجائیں گی۔ میں نے فوری طور پر نمبردار ہنس مکھ کو حویلی بھیجا تاکہ وہ اصل بات معلوم کرکے آئے۔ نمبردار کی واپسی قریباً تین گھنٹے بعد ہوئی وہ خاصا گھبرایا ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ خبر سو فیصد درست ہے چھوٹی بیگم حویلی سے غائب ہے۔ اس کے علاوہ حویلی کا بگھی بان راجو اور ملازمہ بشیراں بھی بگھی سمیت غائب ہیں۔ بڑا الجھا ہوا معاملہ ہے حویلی والے کچھ بتاتے نہیں ہیں۔ ہنس مکھ نے یہ بھی بتایا کہ نرملا کا ایک تایا حویلی میں پہنچا ہے اور اس نے قریبی تھانے میں اس واقعہ کی اطلاع دی ہے۔

اب میرا اور بلال شاہ کا چھپے رہنا فضول تھا ہم نرملا دیوی کی وجہ سے چھپے ہوئے تھے جب وہ ہی نہیں رہی تھی تو چھپنا کس سے تھا۔ ہم جھوک پال سے نکلے تو سیدھے حویلی پہنچ گئے۔ حویلی میں پولیس پہلے سے آئی بیٹھی تھی۔ ایک موٹا سا انسپکٹر دو اے ایس آئی اور کوئی نصف درجن سپاہی تھے۔ انسپکٹر کا نام انت سنگھ تھا وہ بڑا سٹپٹایا ہوا نظر آتا تھا۔ غالباً اسے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کیا کرے۔ اس نے گڑھی کے قریب دو درجن افراد کو مرغا بنا رکھا تھا اور سپاہی ان پر چھتروں کی بارش کررہے تھے۔ ان مصیبت زدہ لوگوں میں حویلی کے ملازمین بھی شامل تھے۔ انت سنگھ مجھے پہچان کر کھڑا ہوگیا۔ آؤ آؤ انسپکٹر نواز خاں مجھے پتہ تھا تم ضرور آؤ گے۔ پھر آہستگی سے بولا" ویسے میں مجرم کے قریب قریب پہنچ گیا ہوں گھیرا تنگ کرلیا ہے میں نے۔

میں نے کہا' تمہارا خیال ہے کہ ان مرغوں میں سے ہی کوئی مجرم ہے؟

سو فیصد بادشاہو' ابھی دیکھنا تمہارے سامنے بکیں گے۔ تم انہیں کوئی ایویں شیویں شے نہ سمجھو بڑے بڑے چھپے رستم ہیں ان میں۔ میں انت سنگھ کے گدھے پن پر مسکرانے کے سوا اور کیا کرسکتا تھا اور اس میں انت سنگھ کا بھی کیا قصور تھا۔ زیادہ تر دیہاتی تھانیداروں کی تفتیش کا انداز یہی ہوتا ہے۔ میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ ان مشتبہ افراد میں سے کوئی ایک بھی اتنے حوصلے کا مالک نہیں کہ گڑھی کی چھوٹی بیگم کو دو ملازمین اور بگھی سمیت اُٹھا کر لے آئے۔ یہ تو چھوٹے موٹے آوارہ گرد تھے جو تقدیر کی خرابی کے سبب انت سنگھ کے چنگل میں پھنسے ہوئے تھے۔ میں نے انت سنگھ سے کہہ سن کر پہلے تو ان مصیبت زدگان کی جان چھڑائی پھر تنہائی میں جاکر انت سنگھ کو سمجھایا کہ چھوٹی بیگم کی گمشدگی کا معمہ ذرا گہرائی میں جاکر حل کرنا ہے۔

وہ بولا اور دوسرا کیس۔
میں نے پوچھا' دوسرا کون سا؟
اس نے کہا بادشاہو وہی بگھی اور دو نوکروں والا بلکہ تین نوکروں والا کیونکہ بگھی بان بھی تو ساتھ ہی غائب ہوا ہے۔ میرا دل سر پیٹنے کو چاہا۔ انت سنگھ ابھی تک یہی سمجھ رہا تھا کہ بگھی کے غائب ہونے کا معاملہ علیحدہ ہے اور چھوٹی بیگم کی گمشدگی علیحدہ واردات ہے میں نے کہا۔
سردار جی مجھے ذرا اتنا بتا دیں کہ آپ کی نگاہ میں یہ سارا معاملہ ہے کیا؟
وہ سنجیدگی سے بولا' دیکھو بادشاہو بگھی والا معاملہ تو میں نے قریب قریب حل کر ہی لیا ہے۔ یہ تو سیدا سادہ کیس ہے حویلی کی کوئی ملازمہ بیمار تھی کل رات دس بجے اس کی طبیعت اچانک زیادہ خراب ہوگئی۔ حویلی کا بگھی بان نذیر خان ایک دوسری ملازمہ بشیراں کے ساتھ بیمار ملازمہ کو لے کر تحصیل ہسپتال روانہ ہوا۔ بندہ پوچھے رات رات دس گیارہ بجے اتنی مہنگی بھگی کو ویران راستے پر ڈالنے کی کیا لوڑ تھی' تھی کوئی لوڑ؟ کچھ نہیں کچھ نہیں تو ایک ہزار روپے کے تو گھوڑے ہی تھے دس بارہ سیر چاندی لگی ہوئی تھی۔ سونے کا پانی پھرا ہوا تھا پائیدانوں پر بس وارے نیارے ہوگئے باچا سنگھ کے تو۔
میں نے حیران ہو کر پوچھا' یہ باچا کون ہے؟
وہ سرگوشی میں بولا' ڈکیت ہے علاقے کا' بڑی ات اُٹھائی ہوئی ہے آج کل' یہ سارا کام اسی کا ہے میں نے پورا پتہ لگالیا ہے۔ وہ مونچھوں والا بھنگی جس نے تیسری قطار میں کان پکڑ رکھے تھے نا خاص بندہ ہے باچے کا۔ اس نے اقبال کیا ہے کہ یہ کام باچے کے سوا اور کسی کا نہیں۔ بس یہ کیس تو تم حل ہی سمجھو لیکن یہ جو جاگیردارنی کا معاملہ ہے ناں یہ بڑا الٹا سیدھا ہے۔ گھر کے بھیدی کے سوا یہ کام اور کوئی نہیں کرسکتا۔ اپنے بھدے ہاتھوں سے وہ ڈاڑھی کھجا کر بولا۔ ایک تو میرے دماک (دماغ) میں یہ بات آتی ہے کہ ہوسکدا ہے جاگیردارنی خود ہی کہیں چلی گئی ہو۔ یہ بڑے لوک ہیں بابا ان کی آونی جاونی کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔
انت سنگھ کی باتوں سے کم از کم ایک بات تو واضح ہوگئی تھی کہ وہ انگوٹھا چھاپ قصائی ٹائپ تھانیدار ہے اور یہ معمہ حل کرنا اس کے بس کا روگ نہیں۔ شاید اس لئے نرملا کا دھیان سیدھا میری طرف گیا تھا اور اس نے مجھے جودھ پور سے لانے کے لئے اپنا منیجر بھیج دیا تھا میں نے مطمئن لہجے میں انت سنگھ سے کہا۔
سردار جی چھوٹی بیگم نہ تو خود کہیں گئی ہے اور نہ اسے حویلی کے اندر سے اغوا کیا گیا ہے بلکہ یہ کوئی اور معاملہ ہے۔ انت سنگھ نے کہا بادشاہو میں سمجھا نہیں۔
میں نے جواب دیا' بادشاہو سمجھنے کے لئے تھوڑا سا وقت چاہیئے (حالانکہ مجھے وقت کی جگہ دماغ کا لفظ استعمال کرنا چاہیئے تھا)۔
وہ احتجاجی لہجے میں بولا' انسپکٹر نواز وہ بندا اقبال کر رہا ہے۔
میں نے کہا' اقبال کو چھوڑو تم تھوڑی سی پھینٹی لگاؤ گے تو آدھا شہر اقبال کرنے لگے گا۔ میرے خیال میں یہ کسی باچے شاچے کا کام نہیں آؤ میں تمہیں اس بندے تک لے جاؤں جو ہمیں اس بارے میں کچھ بتا سکتا ہے۔
انت سنگھ بڑی مایوسی سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں بار بار اس کے جوش و خروش کو ٹھنڈا کرنے کا سبب بن رہا تھا۔ اسے سمجھا بجھا کر میں نے اپنے ساتھ چلنے پر راضی کرلیا۔ حویلی میں گمشدہ بگھی کے علاوہ دو شاندار تانگے بھی موجود تھے۔ ہم نے ان میں سے ایک تانگہ لیا اور تحصیل ہسپتال کی طرف روانہ ہوگئے۔ روانہ ہونے سے پہلے میں نے انت سنگ کے اے ایس آئی کو ہدایت کردی کہ وہ حویلی میں رہے اور مشتبہ افراد سے پوچھ گچھ جاری رکھے۔

حویلی سے تحصیل ہسپتال کا فاصلہ قریباً تین میل تھا ہم دوپہر سے تھوڑی دیر بعد روانہ ہوئے تھے لیکن راستے میں تانگے کا درہ ٹوٹ گیا۔ آخر حویلی سے ایک دوسرا تانگہ منگوانا پڑا۔ اسی چکر میں ہسپتال پہنچتے پہنچتے شام ہوگئی۔ میں نے سیدھے اس کمرے کا رُخ کیا جہاں دو روز پہلے بدمزاج ڈاکٹر سے ملاقات ہوئی تھی۔ خوش قسمتی سے وہ اپنے کمرے میں ہی تھا۔ سانولے رنگ اور موٹے کولہوں والی ایک نرس میز پر چڑھی بیٹھی تھی اور ڈاکٹر اس سے باتیں کر رہا تھا۔ میں تو آج بھی سادہ لباس میں تھا لیکن باوردی انت سنگھ کو دیکھ کر ڈاکٹر ذرا گڑبڑا گیا۔ انت سنگھ نے نرس کو باہر جانے کا اشارہ کیا' نرس نے پہلے تو اس توہین آمیز انداز پر احتجاج کرنا چاہا مگر پھر ارادہ بدل کر کولہے مٹکاتی ہوئی کھسک گئی۔ میں نے کمرے کی کنڈی اندر سے بند کر دی میرے جارحانہ انداز نے ڈاکٹر کو بوکھلا دیا۔

کیا بات ہے جی آپ کچھ پریشان نظر آتے ہیں؟ اس نے اپنی پریشانی چھپاتے ہوئے پوچھا۔ پھر اس نے بڑے غور سے میرا چہرہ دیکھا اس کی یادداشت اچھی تھی معمولی کوشش کے بعد وہ مجھے پہچان گیا۔ اس نے اپنی انگلی میری طرف اٹھائی اور کالے ہونٹ پھڑکا کر بولا۔

تم......تم تو پرسوں رات

ہاں پرسوں رات میرے پیٹ میں درد تھا۔ میں نے اس کی بات کاٹی اور اب تم تسلی سے کرسی پر بیٹھ کر میرے چند سوالوں کے جواب دے دو میں تمہارا قیمتی وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔

ایکا ایکی ڈاکٹر کو اندازہ ہوگیا کہ میں وہ نہیں جو وہ مجھے سمجھتا رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں خوف اُمڈ آیا۔

ٹھیک ایک گھنٹے بعد جب ہم اس کے کمرے سے روانہ ہونے والے تھے۔ کمرے کا نقشہ مکمل طور پر بدل چکا تھا اور کمرے پر ہی بس نہیں ڈاکٹر کے مزاج شریف پر بھی بڑے اچھے اثرات مرتب ہو چکے تھے۔ وہ ایک لنگڑی کرسی پر نڈھال سا پڑا تھا۔ ٹائی کھل چکی تھی قمیص کے بٹن ٹوٹ چکے تھے دونوں رخساروں پر انت سنگھ کی بھاری انگلیوں کے نشان تھے اور نیچے والا ہونٹ جو کچھ زیادہ ہی کالا تھا پھٹ کر سرخرو ہو چکا تھا۔ کچھ یہی حال کمرے کا بھی تھا۔ یہ ساری تبدیلیاں انت سنگھ کی کوشش سے رونما ہوئی تھیں۔ ان تبدیلیوں سے خوش ہو کر ڈاکٹر نے ہمارے ساتھ بے پناہ تعاون کیا تھا اور وہ باتیں بھی بک دی تھیں جو ہم اس سے بکوانا نہیں چاہتے تھے۔

ڈاکٹر کا اصل نام نجے دیو تھا۔ اس کی ڈگری بھی کچھ مشکوک سی تھی بہرحال ہمیں ان باتوں سے کوئی غرض نہیں تھی۔ ہماری غرض ان باتوں سے تھی جو نجے نے نرملا دیوی کے بارے میں بتائیں۔ یہ بے حد سنسنی خیز انکشافات تھے ان انکشافات کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

ڈاکٹر نجے کا نرملا دیوی سے کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا اسکا تعلق واسطہ گساجن نامی ایک طالب علم لیڈر سے تھا اور گساجن کا تعلق نرملا دیوی سے تھا۔ گساجن کا تعلق نرملا دیوی سے کیا تھا اور یہ تعلق کیسے پیدا ہوا؟ اس کا جواب آگرہ یونیورسٹی سے ملتا ہے۔ گساجن اس تعلیمی ادارے کا سب سے بدنام لڑکا تھا اور نرملا بھی یہیں پڑھتی تھی۔ بظاہر گساجن اور نرملا کی کبھی مڈبھیڑ نہیں ہوئی۔ نہ ہی کوئی ایسا واقعہ ہوا جس سے شبہ ہوتا کہ گساجن نرملا سے تعلق پیدا کرنا چاہتا ہے لیکن اندر خانے بات کچھ اور تھی۔ من موہنی صورت والی نرملا گساجن کی شکاری نگاہوں کے نشانے پر تھی۔ وہ کوئی عام لڑکی ہوتی تو گساجن کب کا اسے کھا پی کر ہضم کر چکا ہوتا لیکن وہ ہر طرح اس کے لئے لوہے کا چنا تھی ایک تو وہ کسی شہدے کو لفٹ ہی نہیں کراتی تھی دوسرے ایک بااثر خاندان کی فرد تھی۔ گساجن اسے دیکھ کر رال تو ٹپکا سکتا تھا لیکن اس پر اپنے دانت نہیں آزما سکتا تھا

وہ اندر ہی اندر جلتا اور سلگتا رہتا تھا۔ انہی دنوں وہ ایک بینک ڈکیتی کے الزام میں گرفتار ہوکر جیل چلا گیا اس کے جیل جانے سے نرملا کی طرح اور بھی کئی شریف لڑکیوں نے سکھ کا سانس لیا ہوگا۔

جیل جانے کے بعد گساجن جو ایک کچا پکا غنڈا تھا صحیح بدمعاش بن کر اُبھرا۔ جیل کے اندر ہی اس نے ایک چھوٹا سا گروہ بھی بنالیا۔ چھ مہینے پہلے گساجن جیل سے رہا ہوا تھا اور اسی روز سے وہ ہاتھ دھوکر نرملا دیوی کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ وہ اب تک گڑھی کے کئی چکر لگا چکا تھا اور ایک سے زائد بار نرملا سے ملاقات کرنے میں کامیاب رہا تھا...... چند ہفتے پہلے حویلی کے اندر سے جو آدمی پکڑے گئے تھے وہ بھی گساجن کے ساتھی تھے فرار ہوجانے والا تیسرا شخص گساجن خود تھا۔ وہ نرملا پر اپنی دھاک بٹھانے کے لئے اس سے ملنے حویلی کے اندر چلا آیا تھا۔ چوکیداروں کو بروقت پتہ چل گیا اور یوں اس کا منصوبہ ناکام ہوگیا۔ ہماری تفتیش کے دوران ڈاکٹر نے جو سب سے سنسنی خیز انکشاف کیا وہ یہ تھا کہ اب نرملا دیوی بھی گساجن کے دباؤ میں آ چکی تھی۔ وہ رقم دے کر یا کسی بھی طرح گساجن سے اپنا پیچھا چھڑانا چاہتی تھی۔ دو روز پہلے رات کو جو وہ یہاں آئی تھی تو گساجن سے بات چیت کرنے کے لئے آئی تھی۔ گساجن نے اسے ہسپتال میں ڈاکٹر سنجے کے کمرے میں وقت دے رکھا تھا لیکن وہ پروگرام کے مطابق یہاں نہیں آیا۔ دراصل اسے شبہ تھا کہ نرملا اپنے ساتھ پولیس لگالائے گی۔ نرملا اپنی ملازمہ اور بگھی بان کے ساتھ یہاں آئی اور بیٹھ بیٹھ کر واپس چلی گئی۔

اگلے روز گساجن ڈاکٹر سنجے سے ملا اس نے سنجے سے کہا کہ وہ آج رات پھر آئے گی اور آج رات سارا معاملہ نبٹ جائے گا۔ پروگرام کے مطابق گساجن کل رات نو بجے ہی ہسپتال میں آکر بیٹھ گیا۔ وہ دو مسلح ساتھی بھی لے کر آیا تھا جو ہسپتال کی چھت پر بیٹھے ہوئے تھے۔ دس بجے کے قریب تیز آندھی چلنا شروع ہوگئی' ہر شے گردوغبار سے اٹ گئی۔ سنجے نے گساجن سے کہا گساجن صاحب موسم خراب ہو چکا ہے میرا خیال ہے اب انتظار فضول ہے وہ نہیں آئے گی۔

گساجن نے جواب میں کہا' پیارے وہ آئے گی اسے آنا ہی پڑے گا وہ لوہے کے جال میں پھنسی ہوئی ہے جتنا مرضی پھڑک لے مگر بچ نہیں سکتی۔

گساجن کی باتوں سے ڈاکٹر سنجے نے اندازہ لگایا کہ وہ نرملا کو کسی طریقے سے بلیک میل کر رہا ہے۔ بہرحال اس نے گساجن کو زیادہ کریدنے کی کوشش نہیں کی۔ ان دونوں میں زیادہ بے تکلفی نہیں تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ گساجن سے خوف کھاتا تھا۔ کل رات گساجن اور اس کے ساتھی قریباً گیارہ بجے تک نرملا کا انتظار کرتے رہے آخر گساجن ڈاکٹر کے پاس سے اُٹھ کھڑا ہوا اس نے اپنے دونوں ساتھیوں کو چھت سے بلایا اور وہ تینوں اپنی جیپ پر بیٹھ کر گڑھی کی طرف روانہ ہوگئے۔ گساجن کو پورا یقین تھا کہ نرملا اسے ملنے کے لئے حویلی سے نکلی ہوگی اور راستے میں کسی وجہ سے رُک گئی ہوگی عین ممکن تھا کہ خراب راستے میں بگھی ہی کہیں پھنس گئی ہو۔ وہ تینوں ہسپتال سے روانہ ہوگئے تو ڈاکٹر سنجے لمبی تان کر سو گیا۔ وہ آج صبح دس بجے تک سویا رہا۔ بیدار ہونے پر اسے یہ اطلاع ملی کہ حویلی کی چھوٹی بیگم اپنے ملازموں اور بگھی سمیت غائب ہے۔

یہ تو تھا ڈاکٹر سنجے کا بیان جو اس نے انت سنگھ سے پھینٹی کھانے کے بعد دیا اس بیان کی روشنی میں بہت کچھ واضح ہوگیا تھا لیکن اس کیساتھ کئی نئے سوال بھی پیدا ہوگئے تھے۔ مثلاً یہ کہ نرملا دیوی ایک غنڈے کے ہاتھوں کیوں بلیک میل ہورہی ہے؟ کیا اس کی کوئی کمزوری گساجن کے ہاتھ آ چکی ہے؟ یا وہ خوامخواہ کی بدنامی سے بچنا چاہتی ہے۔ وہ گساجن سے کیا بات چیت کرنا چاہتی تھی اور اس بات چیت کے لئے اس نے اتنی رات گئے گھر سے باہر نکلنے کا خطرہ کیوں مول

لیا؟ پھر جب وہ گھر سے باہر نکل ہی آئی تھی تو وقت پر ہسپتال میں کیوں نہ پہنچ سکی؟ یہ سارے سوال اہم تھے لیکن ان سب سے اہم سوال یہ تھا کہ نرملا اس وقت کہاں ہے؟ ڈاکٹر سنجے کے کمرے سے نکلنے سے پہلے ہمیں اس سوال کا جواب درکار تھا۔ میں نے نیچے جھک کر سنجے کے بال مٹھی میں جکڑے اور اس کا چہرہ اپنی طرف گھماتے ہوئے کہا۔

دیکھو سنجے تمہارے ساتھ بہت ہو چکی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہیں تھانے لے جانا پڑے اور وہاں تم انت سنگھ کا اصل روپ دیکھو بہتری یہی ہے کہ اب تم ہمیں گساجن کے ٹھکانے سے آگاہ کردو۔

سنجے صحیح معنوں میں ڈنڈے کا یار تھا شروع میں جب ہم نے اس سے گساجن کا پتہ پوچھا تھا تو وہ بالکل انجان بنا رہا تھا مگر اب اس نے یہ پتہ فرفر بتا دیا اس کی معلومات کے مطابق گساجن اجمیر کے ایک مضافاتی گاؤں میں قیام پذیر ہے۔

گڑھی سے اجمیر شہر کا فاصلہ قریباً نوے میل ہے ہمیں گساجن کے ٹھکانے تک پہنچنے کے لئے ساٹھ ستر میل کا سفر کرنا تھا۔ انت سنگھ کا خیال تھا کہ اب گڑھی واپس جا کر آرام کیا جائے اور صبح تازہ دم ہوکر نرملا کے کھوج میں نکلا جائے۔ بلال شاہ بھی لمبی لمبی انگڑائیاں اور جمائیاں لے کر اپنی نیت کا اظہار کر رہا تھا۔ مگر میں یہ قیمتی وقت کھونا نہیں چاہتا تھا ممکن تھا کہ یہ وقت جو ہمارے لئے زیادہ اہم نہیں تھا کسی کے لئے بہت اہم ہو۔ ڈوبنے والے کے لئے ایک ایک لمحے کی قیمت ہوتی ہے جبکہ کنارے پر سونے والا گھنٹوں بے خبر سویا رہتا ہے۔ میں نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا کہ ہم ابھی اور اسی وقت گساجن کی تلاش میں روانہ ہونگے۔ میں نے سنجے سے کہا کہ اسے ہمارے ساتھ چلنا ہوگا مگر ساتھ ہی یہ تسلی بھی دیدی کہ اگر اس نے درست معلومات فراہم کی ہیں تو اس کیس کی وجہ سے اس کے نام پر کوئی حرف نہیں آئے گا (اگر ٹھنڈے دماغ سے سوچا جاتا تو اس معاملے میں سنجے کا ناطہ اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا کہ وہ گساجن کی طاقت اور غنڈہ گردی سے خوف کھا گیا تھا اور اس نے گساجن کو اجازت دیدی تھی کہ وہ نرملا کو بلیک میل کرنے کے لئے اس کے کمرے کو استعمال کرلے۔ دوسرے لفظوں میں وہ گساجن کے دبدبے میں آکر اس کا آلہ کار بن گیا تھا۔)

انت سنگھ نے تو اتنی رات گئے میرے ساتھ جانے سے صاف انکار کردیا۔ اسے تھانے میں کوئی بھولے بسرے کام یاد آگئے تھے۔ بلال شاہ بھی اوپر نیچے ہو رہا تھا مگر ہمیں اتنی ہمت نہیں تھی کہ انکار کردیتا ہم نے انت سنگھ کے دو ہیڈ کانسٹیبلان کو ساتھ لیا اور ہسپتال کی ایک ویگن نما گاڑی میں آکر بیٹھ گئے۔ ہسپتال کی طرح یہ گاڑی بھی لاجواب تھی تاہم اگر اس سے نئی نویلی دلہن کی طرح پیار محبت کا سلوک کیا جاتا تو وہ نیم جان ہونے کے باوجود ہمیں منزل تک پہنچا سکتی تھی۔ اجمیر کی طرف روانہ ہونے سے پہلے مجھے ان دو قیدیوں کا خیال آیا جو چند ہفتے پہلے نرملا کی حویلی سے گرفتار ہوئے تھے اور جن کے بارے ڈاکٹر نے اب بتایا تھا کہ وہ گساجن کے ساتھی تھے۔ یقینی بات تھی کہ یہ دونوں افراد انت سنگھ کے تھانے میں پہنچائے گئے ہوں گے اگر وہ اس وقت بھی انت سنگھ کے حوالات میں تھے تو ان سے بہت مدد لی جاسکتی تھی۔ میں نے انت سنگھ سے ان دونوں حوالاتیوں کے بارے پوچھا تو اس کا منہ لٹک گیا۔

کہنے لگا' بادشاہو مجھے کیا پتہ تھا وہ اتنے خاص الخاص بندے ہیں۔ نہیں تو میں ان کی حفاظت کا خاص انتظام کرتا۔ وہ پکی حوالات میں تھے ایک رات کھڑکی توڑ کر بھاگ گئے۔ میں نے بڑا تلاش کرایا پر نہیں ملے پھر میرے دماغ میں آیا کہ چلو چور ہی تھے نا آج نہیں تو کل دوبارہ پکڑے جائیں گے۔

انت سنگھ نے اپنی صفائی پیش کردی لیکن میں

جانتا تھا وہ اتنا اُلو نہیں جتنا ظاہر کر رہا ہے۔ یقینی بات تھی کہ اس نے کسی سے رشوت کھا کر حوالاتیوں کو چھوڑ دیا تھا۔

بہرحال انت سنگھ اور اس کی تھانیداری پر دو حرف بھیج کر میں ڈاکٹر سنجے کے ساتھ اجمیر جانے والی سڑک کی طرف روانہ ہوگیا۔ اب یہ بات میرے ذہن میں بالکل صاف تھی کہ پرسوں رات کی طرح کل رات بھی نرملا بیمار ملازمہ کے بھیس میں حویلی سے نکلی تھی اور ڈاکٹر سنجے کی طرف روانہ ہوئی تھی لیکن یا تو وہ دیر سے روانہ ہوئی تھی یا آندھی کی وجہ سے راستے میں کہیں رُک گئی تھی لہٰذا وقت پر گساجن تک نہیں پہنچ سکی تھی پھر گساجن ہسپتال سے نکل پڑا تھا۔ نرملا سے گساجن کی ملاقات راستے میں کہیں ہوئی تھی اور اس کے بعد سے نرملا اور اس کے دونوں ملازمین کا کچھ پتہ نہیں تھا۔

ستر میل کا سفر ہم نے قریباً چھ گھنٹے میں طے کیا اور رات دو بجے اجمیر کے اس مضافاتی گاؤں میں پہنچ گئے جہاں گساجن کا ٹھکانہ بتایا جاتا تھا۔ آسمان تاروں سے بھرا ہوا تھا ایک سرد ہوا شمالاً جنوباً چل رہی تھی۔ رات کے سناٹے میں ویگن کی گھر گھر دُور تک گونج رہی تھی۔ کچے راستے کی دونوں اطراف جوار اور مکئی کے کھیت تھے کہیں کہیں کسانوں کے جھونپڑوں میں روشنی دکھائی دیتی تھی۔ گاؤں ابھی کافی فاصلے پر تھا کہ ڈاکٹر سنجے نے ہمیں ویگن روکنے کو کہا۔ میرے اشارے پر ڈرائیور نے ویگن روک کر انجن بند کر دیا اور بتیاں بجھا دیں۔ تاروں کی مدہم روشنی میں ایک جانب قبروں کے سفید سفید کتبے نظر آرہے تھے غور کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ ایک وسیع قبرستان ہے اس قبرستان کے آخری سرے پر دو مکانوں کے ہیولے تھے مکانوں کا درمیانی فاصلہ چالیس پچاس گز کے قریب تھا۔ ڈاکٹر سنجے نے کانپتے ہوئے لہجے میں بتایا کہ ان ہی دو مکانوں میں سے ایک گساجن کا ٹھکانہ ہے۔ اپنے بیان کے مطابق ڈاکٹر سنجے اس سے پہلے یہاں نہیں آیا تھا لہٰذا اس نے یہ بات قیافے سے کہی تھی۔

دونوں کانسٹیبلوں کے پاس رائفلیں تھیں میرے پاس 38 بور کا ریوالور تھا۔ بلال شاہ بھی ایک دیسی پستول سے مسلح تھا۔ ہم نے ڈرائیور اور ڈاکٹر سنجے کو تو وہیں گاڑی میں چھوڑا اور خود محتاط طریقے سے ان مکانوں کی طرف بڑھے۔

قریب پہنچنے پر اندازہ ہوا کہ پہلا مکان دراصل ایک ٹوٹا پھوٹا مزار ہے۔ مزار کے گرد یک احاطہ اور چند کمرے تھے دروازے پر تالا لگا ہوا تھا یہ مزار ایک طرح سے قبرستان کا ہی حصہ تھا دوسرا مکان کچھ مشکوک نظر آیا۔ دیواریں خاصی اونچی تھیں مکان کی شکل و صورت دیکھ کر قیاس ہوتا تھا کہ یہ کسی زمیندار کا گودام ہے۔ اس گودام کا ایک حصہ بارشوں سے منہدم ہو چکا تھا۔ بیرونی دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھی ہوئی تھی میں نے خود اندر جانے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لئے دیوار پھاندنا ضروری تھا۔ بلال شاہ نے نیچے بیٹھ کر مجھے کندھوں پر اٹھایا اور میں دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف اُتر گیا۔ اندر مکمل تاریکی تھی برآمدے میں کوئی شخص چارپائی پر سو رہا تھا۔ اسکے خراٹے کافی بلند تھے میں بہت آہستگی اس کے سرہانے پہنچا جھک کر غور سے دیکھا اس نے لحاف اوڑھ رکھا تھا اور منہ سے شراب کی بو آرہی تھی۔ اس کی چارپائی کے پاس دیوار کے ساتھ ایک موٹی لاٹھی پڑی تھی۔ لاٹھی کے ایک سرے پر چھری چڑھی ہوئی تھی مجھے یقین ہونے لگا کہ ہم صحیح مقام پر آگئے ہیں سب سے پہلے تو میں نے وہ خطرناک لاٹھی ایک تاریک گوشے میں چھپائی پھر صحن میں جا کر دروازے کی کنڈی اندر سے گرا دی۔ بلال شاہ اور دونوں کانسٹیبل اندر آگئے۔ اب میری آنکھیں مکان کی تاریکی میں اچھی طرح دیکھ رہی تھیں۔ میں بہت آہستگی چلتا اندرونی حصے میں پہنچا یہاں ایک کمرے

میں لالٹین کی مدہم روشنی دکھائی دی غالباً لالٹین کو چارپائی کے نیچے گھسا دیا گیا تھا۔ اس کمرے کو بھی اندر سے کنڈی لگی تھی تاہم میں نے ایک کھڑکی پر دباؤ ڈالا تو وہ معمولی آواز سے کھل گئی۔ کمرے میں دو ہٹے کٹے افراد دو چارپائیوں پر لحاف اوڑھے سو رہے تھے ایک شخص کے تکیے کے نیچے سیاہ پستول کا دستہ صاف نظر آ رہا تھا۔ گولیوں والی پیٹی پائے سے لٹکی ہوئی تھی دیوار پر دو پتلونیں اور ایک جرسی لٹکی ہوئی تھی۔ کچے فرش پر مونگ پھلی کے چھلکے تھے سگریٹ کے ٹوٹے تھے اور شراب کی خالی بوتل لڑھکی ہوئی تھیں۔ میں نے یہ سارا منظر چند ساعتوں کے اندر دیکھا اور پھر کھڑکی سے کود کر اندر پہنچ گیا۔ سب سے پہلے میں نے کمرے کی کنڈی کھولی پھر دبے پاؤں اس ریوالور کی طرف بڑھا جو تکیے کے نیچے سے جھانک رہا تھا۔ لگتا تھا ان لوگوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں کہ کوئی یہاں پہنچ سکتا ہے وہ بالکل بے فکر ہو کر سو رہے تھے۔ میں نے اپنا ریوالور نکال کر ہاتھ میں لے لیا اور دوسرے ہاتھ سے تکیے والا ریوالور نکالنا چاہا لیکن اب بے خبری کی انتہا ہو چکی تھی تکیے کی جنبش سے اچانک سویا ہوا شخص جاگ گیا۔ اس نے بے انتہا پھرتی سے میرا بازو تھاما۔ ریوالور میرے اسی ہاتھ میں تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے حلق سے خوفناک چنگھاڑ نکلی ......بھورے' بھورا غالباً اس کے ساتھی کا نام تھا یکایک کمرے میں کہرام مچ گیا۔ جونہی ساتھ والی چارپائی سے بھورا ہڑ بڑا کر اُٹھا ہیڈ کانسٹیبل نے للکار کر اسے خبردار کیا اور تھری ناٹ تھری کی نال اس کی کھوپڑی سے لگا دی۔ وہ شخص جس نے میرے ریوالور پر ہاتھ ڈالا تھا کچھ زیادہ ہی پھرتیلا نکلا اس نے اپنا لحاف میرے اوپر پھینکا اور بھاگنے کی کوشش کی مگر کانسٹیبل کی صورت میں ایک فرشتہ اس کے سر پر بھی کھڑا تھا۔ اس فرشتے نے اپنی رائفل کا کندا گھما کر بھاگنے والے کی گردن پر مارا یہ ایک زوردار ضرب تھی وہ شخص اچھل کر دروازے کے پاس گرا

میں نے ایک ٹھوکر اس کی پسلیوں میں ماری اور دو ہوائی فائر کر کے اسے سمجھا دیا کہ ہم نے بڑے پکے ہاتھ ڈالے ہیں۔ وہ کوئی بدمعاشی دکھانے کی کوشش نہ کرے۔ اب صرف تیسرا شخص تھا جو باہر برآمدے میں سو رہا تھا مجھے اس کی طرف سے کوئی فکر نہیں تھی وہ غیر مسلح تھا اور میں بلال شاہ جیسے صحت مند رکھوالے کو اس کے سرہانے چھوڑ آیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ جونہی ہنگامہ شروع ہوا ہوگا بلال شاہ نے اپنے شکار کو جن جپھے میں جکڑ لیا ہوگا اور ایسے جکڑا ہوگا جیسے جکڑنے کا حق ہوتا ہے۔ میرا اندازہ ایک سو ایک فیصد درست نکلا جب میں کمرے سے باہر آیا تو بالکل وہی منظر میری آنکھوں کے سامنے تھا جو میں سوچ رہا تھا۔ ایک درمیانی جسامت کا شہری لڑکا بلال شاہ کی گرفت میں بری طرح پھنسا ہوا تھا۔ بلال شاہ نے ہانپتے ہوئے لہجے میں کہا' دیکھ لو خان صاحب میں کسکن وی نئیں دتا' یعنی دیکھ لو میں نے ملنے بھی نہیں دیا۔ دفعتاً مجھے اندرونی کمرے سے کسی لڑکی کے رونے کی آوازیں آئیں۔ یہ دبی دبی آوازیں اسی چارپائی سے آ رہی تھیں جہاں سے بھورا اُٹھا تھا۔ لحاف کے نیچے ابھی تک کوئی موجود تھا اور ہذیانی انداز میں آہ و بکا کر رہا تھا میں نے چارپائی کے نیچے سے لالٹین نکالی اور جلدی سے لحاف کے پاس آیا۔ لحاف اُٹھا کر دیکھا تو آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ یہ کوئی لڑکی نہیں تھی دس بارہ سالہ لڑکا تھا اس نے اپنا سر گھٹنوں میں دے رکھا تھا اور چیختا چلا جا رہا تھا' دیدی دیدی بچاؤ بچاؤ۔ میں نے لالٹین کی روشنی میں غور سے لڑکے کے خدوخال دیکھے شکل کچھ جانی پہچانی محسوس ہوئی اچانک میرے ذہن نے پکار کر کہ کہا' یہ لڑکا نرملا کا چھوٹا بھائی ہے' وہی بھائی جس کے بارے میں نرملا نے بتایا تھا کہ وہ آگرہ کے ایک انگریزی سکول میں پڑھتا ہے۔

ہم نے اس گودام نما مکان کا کونہ کونہ چھان مارا لیکن نرملا بشیراں یا بکھی بان کا کوئی سراغ نہیں ملا

پکڑے جانے والے تینوں افراد میں سے کوئی بھی یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ وہ گساجن ہے یا گساجن نام کے کسی شخص سے اس کا کوئی تعلق رہا ہے۔ ان نہ ماننے والوں کا علاج بھی ہمارے پاس موجود تھا۔ میں نے بلال شاہ کو بھیجا اور وہ گاڑی میں سے ڈاکٹر سنجے کو لے آیا' سنجے خاصا گھبرایا ہوا تھا۔ کچھ یہی کیفیت مکان کے تینوں مکینوں کی اسے دیکھ کر ہوئی۔ میں نے سرد لہجے میں اس سے دریافت کیا کہ یہ تینوں کون ہیں؟ اس نے فوراً ایک شخص کی طرف انگلی اٹھائی اور بولا۔

یہ گساجن ہے' یہ اس کا کلاس فیلو عقیل بھورا اور یہ کرشن ہے۔

مجھے پہلے ہی اُمید تھی کہ گساجن ان تینوں میں سے کوئی ہوگا۔ سنجے نے جس کی طرف اشارہ کیا تھا وہ گول سرخ چہرے والا ایک سخت گیر نوجوان تھا۔ اس نے پتلون اور بنیان پہن رکھی تھی۔ سینہ اور بازو بالوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ اسی شخص نے مجھ سے ریوالور چھیننے کی کوشش کی تھی۔ اس وقت وہ فرش پر اوندھا پڑا ہائے ہائے کررہا تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتہ چلا کانسٹیبل کی زوردار ضرب سے اس کی گردن کی ہڈی تڑخ گئی تھی۔

وہ رات ہم نے اسی تنہا مکان میں گزاری۔ ہم نے جن تین نوجوانوں کو پکڑا تھا ان میں سے ایک مقامی گاؤں کے چودھری کا لڑکا تھا۔ اسی نے گساجن اور عقیل کو مہمان ٹھہرایا ہوا تھا۔ وہ تینوں کئی روز سے یہاں دادِ عیش دے رہے تھے۔ سب سے پہلے تو ہم نے لڑکے کو چپ کرانے کی کوشش کی اور اسے تسلی تشفی دے کر بولنے پر آمادہ کیا۔ ایک علیحدہ کمرے میں گفتگو کرتے ہوئے لڑکے نے مجھے اپنا نام نریندر بتایا اور بتایا کہ وہ آگرہ کے فلاں سکول میں پڑھتا ہے۔ اس کی باتوں سے معلوم ہوا کہ چار روز پہلے اسے دس چھٹیاں ہوئی تھیں۔ حویلی کا پرانا ملازم راجپال جو اب منیجر بن چکا ہے اسے خود آگرے سے لینے آیا تھا۔ اتوار کی صبح وہ آگرے سے بذریعہ کار گڑھی کے لئے روانہ ہوئے لیکن راستے ہی میں گساجن اور اسکے ساتھیوں نے اسے اغوا کرلیا اور منیجر راجپال کو تھپڑ مارے پھر منیجر کو نرملا دیوی کے لئے کوئی پیام دے کر چھوڑ دیا۔ لڑکے نریندر نے بتایا کہ یہ تینوں آدمی اسے ڈراتے دھمکاتے رہتے تھے اور جب وہ روتا تھا تو مارتے بھی تھے۔

لڑکے کا تفصیلی بیان لے کر میں نے گساجن سے رجوع کیا۔ وہ حقیقتاً ایک خطرناک غنڈہ تھا زخمی گردن کی وجہ سے وہ سخت عذاب میں تھا اس کے باوجود اکڑ رہا تھا اور زبان کھولنے سے صاف انکاری تھا۔ میں نے اس کے ساتھی کرشن کی طرف توجہ دی پہلے تو اس نے بھی اکڑ دکھائی لیکن پھر مار کھانے کے بعد راہ راست پر آ گیا۔ اس نے اقرار کیا کہ لڑکے نریندر کے بیان میں کچھ باتیں درست ہیں یعنی وہ اسے اغوا کرکے یہاں لائے ہیں اور پچھلے چار روز سے وہ ان کی تحویل میں ہے۔ اس کے علاوہ اس نے یہ بھی تسلیم کیا کہ منیجر راجپال کو چھوٹی بیگم کے لئے پیام دیکر حویلی بھیجا گیا تھا مگر کرشن نے یہ جرم قبول کرنے سے انکار کردیا کہ کل رات انہوں نے چھوٹی بیگم کو اس کے دو ملازموں سمیت اغوا کیا ہے یا ایسی کوئی کوشش کی ہے۔ میں نے زنانے کے تھپڑ اس کے منہ پر مارے اس کا ہونٹ پھٹ گیا وہ سمجھ چکا تھا کہ وہ تینوں بری طرح پھنس چکے ہیں اور اب چھٹکارہ ممکن نہیں دوسرے کمرے میں ان کا لیڈر ہائے ہائے کی دردناک آوازیں نکال رہا تھا جس کی وجہ سے اس کا رہا سہا حوصلہ بھی ختم ہوچکا تھا وہ دبے لہجے میں بات کررہا تھا۔ کہنے لگا۔

انسپکٹر صاحب! یہ حقیقت ہے کہ ہم نے نریندر کو چھوٹی بیگم پر قابو پانے کے لئے ہی اغوا کیا تھا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ گساجن کے ارادے چھوٹی بیگم کے

بارے میں کچھ اچھے نہیں تھے۔ وہ اس کے حسن اور اس کی دولت دونوں پر نظر رکھتا تھا لیکن میں بھگوان کو گواہ بنا کر سچ کہہ رہا ہوں کہ کل رات ہم نے چھوٹی بیگم کی صورت تک نہیں دیکھی۔ عقیل بھورا لڑکے کے پاس تھا اور میں خود گساجن کے ساتھ گڑھی گیا تھا۔ تحصیل ہسپتال میں رات گیارہ بجے تک چھوٹی بیگم کا انتظار کرنے کے بعد ہم اسے ڈھونڈنے کے لئے نکلے۔ ہمارا خیال تھا کہ آندھی کی وجہ سے وہ کہیں راستے میں رک گئی ہے۔ ہم نے اسے بہت ڈھونڈا لیکن کہیں سراغ نہیں ملا۔ راستے میں ایک دو کسانوں سے پتہ چلا کہ حویلی کی بگھی کچھ دیر پہلے اس راستے سے گزری تھی ہم سمجھ گئے کہ کوئی گڑ بڑ ہوگئی ہے لہٰذا واپس ہسپتال بھی نہیں گئے اور جیپ کو پختہ سڑک پر ڈال کر اجمیر کی طرف چلے آئے صبح چھ بجے ہم یہاں پہنچ گئے اس کے بعد سے ہم اسی چار دیواری میں ہیں۔ ہمارے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ کوئی یہاں تک پہنچ سکتا ہے لہٰذا بڑی بےفکری سے سو رہے تھے۔

ہم نے صبح تک تینوں ملزموں سے پوچھ گچھ جاری رکھی لیکن مزید کچھ بھی معلوم نہیں ہوسکا۔ گردن کی چوٹ کے سبب گساجن کی حالت ابتر تھی میری ہدایت پر ڈاکٹر سنجے نے اس کی مالش وغیرہ کی اور روئی رکھ کر پٹی باندھ دی۔ میں گردوپیش کا جائزہ لینے کے لئے علی الصبح باہر نکلا۔ بلال شاہ بھی میرے ساتھ تھا ابھی اندھیرا چھٹا نہیں تھا۔ مکان کے چاروں طرف سرکنڈے تھے اور اس سے آگے کھیت دکھائی دے رہے تھے۔ صبح کی خنک ہوا میں سرکنڈوں کے سفید سر جھوم رہے تھے اور چڑیوں کی چہکار دُور دُور تک گونج رہی تھی۔ جلدی ہی مجھے وہ جیپ بھی نظر آ گئی جس پر گساجن وغیرہ نے گڑھی تک کا سفر طے کیا تھا۔ کیچڑ میں لتھڑی ہوئی جیپ سرکنڈوں کی اوٹ میں کھڑی تھی۔ دفعتاً میں چونک گیا مجھے اندازہ ہوا کہ کوئی سرکنڈوں میں چھپا ہوا ہمیں دیکھ رہا ہے۔ میں

نے بلال شاہ پر اپنا اندیشہ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ ہم یونہی ادھر ادھر گھومتے رہے اچانک بلال شاہ کی نظر کسی شخص پر پڑ گئی وہ سرکنڈوں میں گھورتا ہوا بلند آواز سے بولا کون ہے؟ جونہی اس نے آواز لگائی کوئی اپنی جگہ سے اُٹھ کر بھاگا اور سرکنڈوں کے اندر سے گزر کر دُور نکل گیا۔ بلال شاہ اور میں اس کے پیچھے لپکے لیکن وہ ہماری پہنچ سے دُور جا چکا تھا۔ چند ہی لمحے بعد گھوڑے کی ٹاپیں سنائی دیں اور میں نے دیکھا کہ ایک ہیولا سا قبرستان کا چکر کاٹ کر پختہ سڑک کی طرف جا رہا ہے۔ میں نے تیزی سے کہا بلال شاہ تم ایسا کرو کہ لڑکے کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ جہاں مرضی چلے جاؤ لیکن یہاں نہیں رہنا دونوں کانسٹیبلوں سے کہنا ملزموں پر کڑی نظر رکھیں۔ میں اس شخص کے پیچھے جا رہا ہوں...... یہ ہدایات دیتے دیتے میں مکان کے سامنے پہنچ چکا تھا۔ یہاں دو صحت مند گھوڑے میں نے رات ہی دیکھ لئے تھے۔ میں ایک گھوڑے پر سوار ہوا اور اس جانب بڑھا جہاں تھوڑی دیر پہلے گھڑ سوار دکھائی دیا تھا۔ اب اندھیرا کافی حد تک چھٹ چکا تھا میں مکان سے دوسو گز دُور ایک ٹیلے پر پہنچا تو گھڑ سوار نظر آ گیا۔ وہ قریباً ایک فرلانگ کی دُوری پر تھا اور کھیتوں کے درمیان کشادہ راستے پر گھوم رہا تھا۔ میں اس کے پیچھے جاتا تو اس نے فوراً ہوشیار ہو جانا تھا میں کچھ دیر سوچتا رہا پھر نتائج سے بے پرواہ ہو کر اپنا گھوڑا سرکنڈوں میں ڈال دیا۔ یہ سرکنڈے ایک خشک نالے کے ساتھ ساتھ دور تک چلے گئے تھے۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ یہ نالہ اس راستے کو قطع کرے گا جس پر گھڑ سوار روانہ ہوا ہے جو راستہ میں نے اختیار کیا وہ بڑا دشوار گزار تھا قریباً ایک میل کے سفر میں گھوڑے کے ساتھ ساتھ میں بھی ہلکان ہو گیا اتنی مشقت کے باوجود میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ گھڑ سوار کو دوبارہ پا سکوں گا۔ عین ممکن تھا کہ وہ راستے ہی میں کسی اور جانب مڑ گیا ہو۔ یہ بھی امکان تھا کہ وہ

میرے پہنچنے سے پہلے ہی مقررہ مقام سے آگے نکل جائے۔ اچانک ایک ایسا منظر نظر آیا جس کا میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ ابھی میں اپنا شارٹ کٹ مکمل کرکے بڑے راستے پر پہنچا بھی نہیں تھا کہ دائیں جانب کی گھنی جھاڑیوں سے ایک گھڑ سوار برآمد ہوا اور بڑے اطمینان سے میرا راستہ کاٹتا ہوا خشک نالے میں اُتر گیا۔ سرکنڈوں میں میں نے اس شخص کے لباس کی صرف ایک جھلک دیکھی تھی اور اب میں پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ میں اس شخص کے پیچھے یہاں پہنچا ہوں۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ دیکھا وہ بڑی تسلی سے نالہ پار کرکے دوسری طرف پہنچ چکا تھا میں نے بھی اپنے گھوڑے کی رفتار دھیمی کی اور راسیں کھینچ کر اسے نالے میں اُتار دیا۔

دونوں ہانپتے ہوئے گھوڑے بڑے مزے سے آگے پیچھے چلتے ایک گاؤں کی حدود میں داخل ہو گئے میں نے اپنے گھوڑے کو ہلکی سی ایڑ لگائی اور اس نے بھاگ کر اگلے گھوڑے سے اپنا درمیانی فاصلہ مزید کم کرلیا۔ اب ہمارے درمیان قریباً پچاس گز کی دُوری تھی۔ میں اسی دیہاتی لباس میں تھا جو جھوک پال کے نمبردار ہنس مکھ نے مجھے لاکر دیا تھا۔ مجھے اپنے پہچانے جانے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ گھڑ سوار گاؤں کی حدود میں داخل ہوگیا اور پھر میں نے اسے ایک خوبصورت دومنزلہ حویلی میں داخل ہوتے دیکھا۔

رات تاریک تھی، آج پھر راجستھانی جھکڑ چل رہے تھے۔ میں پچھلے بارہ گھنٹوں سے اس چھاپور نامی گاؤں میں گھوم رہا تھا۔ ایک مسافر کی حیثیت سے کسی نے مجھ پر شبہ نہیں کیا تھا۔ میں نے ایک دو دکانداروں سے مل کر کچھ معلومات بھی حاصل کیں تھیں۔ گھڑ سوار جس دومنزلہ حویلی میں داخل ہوا تھا وہ یہاں کے مکھیا کی تھی۔ مکھیا کا نام بھی مجھے معلوم ہو چکا تھا۔ میں پچھلے بارہ گھنٹوں میں چار پانچ بار حویلی کے سامنے سے گزرا تھا اور ہر بار مجھے احساس ہوا تھا کہ حویلی کے اندر کوئی بے چینی سی پائی جاتی ہے۔ پریشان چہروں والے افراد اندر باہر آ جا رہے تھے۔ شام کے بعد حویلی میں کچھ لوگ جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ان کے گھوڑے حویلی سے باہر ہی کھڑے تھے۔ میں نے دیکھا تھا کہ اندر جانے والوں میں سے کئی افراد مسلح ہیں۔ معلوم نہیں حویلی کے اندر کیا کھچڑی پک رہی تھی۔ جوں جوں رات گہری ہو رہی تھی میرا اضطراب بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ رہ رہ کر نرملا کا چہرہ نگاہوں میں گھومتا اور میرا دل پکار کر کہتا کہ وہ کسی سنگین مشکل میں پھنسی ہوئی ہے۔ نجانے کیوں مجھے بار بار یہ خیال آنے لگا تھا کہ اگر نرملا اور اس کے ملازمین گستاجن کے ہاتھ نہیں لگے تو پھر وہ اس حویلی میں موجود ہیں۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ حویلی اس کہانی میں کیسے گھس آئی ہے اور یہاں رہنے والے لوگ دراصل کون ہیں؟

اس وقت رات کے دس بجے تھے جب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ نرملا کو گم ہوئے آج تیسری رات تھی اجنبی لوگوں کے چنگل میں پھنسی ہوئی لڑکی کے لئے یہ بہت بہت لمبا عرصہ تھا۔ حویلی کے دروازے پر کوئی چوکیدار تو تھا نہیں میں نے قمیص تھپتھپا کر ریوالور کی موجودگی کا اندازہ کیا اور دندناتا ہوا اندر گھس گیا۔ اندر اور بھی لوگ گھوم رہے تھے فوری طور پر کسی نے میری طرف توجہ نہیں دی میں نے اپنی صفائی پیش کرنے کے لئے جو فقرے ڈھونڈ رکھے تھے وہ سب دھرے کے دھرے رہ گئے کیونکہ میں حویلی کے اندرونی حصے تک پہنچ گیا اور کسی نے نہیں پوچھا کہ میاں کون ہو تم؟ آنکھ بچا کر میں اوپر جانے والے زینوں پر آ گیا بالائی منزل پر تاریکی تھی صرف چند کمروں میں گیس لیمپ روشن تھے۔ چہل پہل بھی نظر نہیں آتی تھی ایک روشن کمرے کے سامنے سے گزرتے گزرتے میں ٹھٹھک گیا اندر سے کسی مرد کے دھاڑنے کی آواز آ رہی تھی۔

یہ تمہاری نہیں میری ذمہ داری ہے اور میں یہ ذمہ داری پوری کروں گا۔

ایک عورت نے گھگھیا کر کہا' بھگوان کے لئے آپ سمجھنے کی کوشش کریں اسے کچھ ہو گیا تو میں جیتے جی مر جاؤں گی۔

میں سناٹے میں رہ گیا اندر سے آنے والی آواز نرملا کی تھی۔ میں اس آواز کو ہزاروں میں شناخت کر سکتا تھا۔

مرد نے گرج کر کہا' کچھ بھی ہو جائے نرملا ہمیں یہ خطرہ مول لینا ہی پڑے گا۔ اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے اگر ہے تو مجھے بتاؤ۔

نرملا نے کہا' میں آپ کی بات تسلیم کرتی ہوں لیکن......

لیکن کے بعد بے غیرتی کی سوچ شروع ہوتی ہے۔ مرد نے کڑک کر کہا اور کوئی پتی یہ بے غیرتی برداشت نہیں کر سکتا۔ ہم جا رہے ہیں تم بھگوان سے ہماری کامیابی کی پرارتھنا کرو......اس کے بعد بھاری قدموں کی آواز آئی میں پہلے ہی ایک تاریک گوشے میں دبک چکا تھا کمرے کا دروازہ جھٹکے سے کھلا اور ایک شخص لمبے ڈگ بھرتا ہوا برآمدے کی طرف نکل گیا اس کا لباس گواہی دے رہا تھا کہ یہی وہ گھڑ سوار ہے جس کا تعاقب کر کے میں یہاں پہنچا ہوں۔ اندر سے اب دبی دبی سسکیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

میں کچھ دیر بے حرکت کھڑا سوچتا رہا پھر کمرے کی طرف بڑھا' جانے والا شخص کمرے کو باہر سے کنڈی لگا گیا تھا۔ میں نے کنڈی کھولی اور جلدی سے اندر چلا گیا اندر گیس لیمپ جل رہا تھا۔ آراستہ کمرے کے وسط میں نرملا دیوی کھڑی رو رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ بری طرح چونکی اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔

آپ......آپ یہاں؟

وہ حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات سے بولی۔

میں نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ وہ عروسی جوڑے میں ملبوس تھی۔ ہاتھوں میں سونے کے وزنی کڑے ماتھے پر جھومر اور ہونٹوں پر سرخی۔ رونے سے اس کی آنکھوں کا کاجل بہہ چکا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ چھوٹی بیگم صحیح معنوں میں بیگم بن چکی ہے اور ابھی جو شخص اس کمرے سے نکلا ہے وہ اس کا شوہر نامدار ہے۔ وہ شوہر جو ایک عرصے سے خاموش تھا اور اپنی محبوب بیوی کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا آخر بول پڑا تھا اور ایسی دیہاتی آن بان سے بولا تھا کہ بولنے کا حق ادا ہو گیا تھا۔ نرملا نے بے قرار ہو کر میرا بازو تھام لیا روتی اور ہچکیاں لیتے ہوئے بولی' انسپکٹر نواز بھگوان کے لئے انہیں روکیے وہ کسی سے جھگڑا کرنے جا رہے ہیں۔ میرے بھائی کا جیون خطرے میں ہے خدا کے لئے انہیں روک لیجئے۔

میں اطمینان سے کھڑا رہا' وہ اور بے قرار ہو گئی مجھے جھنجوڑنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں ممتا کی تڑپ' باپ کی محبت اور بڑی بہن کی پکار یکجا ہو گئی تھی۔ اس گھڑی وہ چوبیس سالہ دوشیزہ مجھے ذمہ داریوں کے بوجھ تلے پسی نظر آئی۔ اس کی نازک جان ہزار خانوں میں بٹی ہوئی تھی اور وہ اپنی ناتوانی کم کرنے کے لئے کسی خانے سے بھی اپنی جان نکال نہیں سکتی تھی۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا' گھبراؤ نہیں نرملا دیوی تمہارے بھائی نریندر کو کچھ نہیں ہوگا۔ جہاں تمہارے سسرال والے جا رہے ہیں وہاں اب نریندر نہیں ہے۔

وہ حیرت کا بت بنی میری طرف دیکھتی چلی گئی طوفانی جھکڑ حویلی کی بلند برجیوں سے ٹکرا رہے تھے اور حویلی سے نکلنے والے گھوڑے گاؤں کی کسی گلی میں سرپٹ بھاگے چلے جا رہے تھے۔

ان آخری سطروں کو پڑھ کر قارئین کہانی کی چند

گمشدہ کڑیاں ملالیں گے۔ یہ بتانے کی تو ضرورت ہی نہیں کہ نرملا نے مجھے گساجن کے خوف سے گڑھی بلایا تھا وہ جان چکی تھی کہ گساجن کی نظر اس کی عزت اور دولت پر ہے اور وہ کسی بھی وقت ان دونوں چیزوں پر ہاتھ ڈال سکتا ہے لیکن مجھے حویلی میں بلانے کے بعد اسے ہمت نہیں ہوئی کہ وہ مجھے فوری طور پر اس حقیقت سے آگاہ کرسکے۔ اسے اب بھی امید تھی کہ شاید حالات سدھر جائیں لیکن اس دوران گساجن نے اس کھیل میں ترپ کی چال چلی اور آگرے کے راستے میں نرملا کے اکلوتے بھائی نریندر کو اغوا کرلیا۔ اس واقعہ نے نرملا کا سارا دم خم ختم کردیا۔ وہ کسی طور اپنے بھائی کی جان کا رسک نہیں لے سکتی تھی لہٰذا اس نے اچانک مجھ سے بے رُخی اختیار کرلی اور فیصلہ کیا کہ وہ اس معاملے میں پولیس کو درمیان میں نہیں لائے گی۔ گساجن کے مطالبے پر جب وہ دوسری مرتبہ اسے ملنے تحصیل ہسپتال گئی تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کیا واقعہ پیش آنے والا ہے۔ اس کا پتی راج پانڈے جو ایک سمجھ دار نوجوان تھا خاموشی سے حالات کا جائزہ لے رہا تھا اور اپنی پتنی پر گہری نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ اس رات پانڈے فیصلہ کرچکا تھا کہ اسے آگے بڑھ کر نرملا کے قدم روکنے ہوں گے اور اسے تاریک گڑھوں میں گرنے سے بچانا ہوگا۔ وہ اب تک بہت برداشت کرچکا تھا اب اور نہیں کرسکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بھائی بہنوں کی محبت میں جکڑی ہوئی نرملا اس کی بات ہرگز نہیں مانے گی لہٰذا اس نے اپنے آدمیوں کے ساتھ راستے میں نرملا کو روکا اور زبردستی اپنے ساتھ اپنے گاؤں لے گیا۔ یہ ایک طرح سے نرملا کی اچانک رخصتی تھی۔ اس نے نرملا سے کہا کہ وہ اس کی پتنی ہے۔ صرف پتنی بن کر رہے پتی کی ذمہ داریاں اس پر چھوڑ دے۔ جب نرملا کی زبانی اسے نریندر والے واقعہ کا پتہ چلا تو وہ غضب ناک ہوگیا۔ اس نے نرملا سے وعدہ کیا کہ وہ اپنی جان پر کھیل کر بھی اس کے بھائی کو بچالے گا اس نے کمر سے اسلحہ لگایا اور حالات کا جائزہ لینے کے لئے گساجن کے ٹھکانے کی طرف چل دیا۔ بعد کے واقعات آپ جانتے ہی ہیں اتفاق سے میری نگاہ پانڈے پر پڑ گئی اور میں اس کا پیچھا کرتا ہوا چھاپور پہنچ گیا۔

اغوا برائے تاوان کے تینوں بڑے ملزم گرفتار ہوچکے تھے۔ ان کی نشاندہی پر آگرے سے کم از کم دس افراد مزید گرفتار کرلئے گئے۔ میں نے ڈاکٹر نجے کو حسب وعدہ اس کیس سے صاف نکال لیا۔ حویلی کی شاندار بگھی کے بارے لوگوں میں بہت چرچے تھے۔ یہ بگھی بھی کوچبان نذیر خان اور بشیراں سمیت نرملا کے سسرال سے برآمد ہوگئی۔ نرملا کے یہ دونوں ملازم وہاں مہمانوں کی حیثیت سے مقیم تھے۔ ویسے بھی جب میاں بیوی راضی تھے تو قاضی نے کیا کرنا تھا۔ دیکھا جائے تو اس رات راج پانڈے کی جرأت نے نرملا کو ان دیکھی مصیبتوں سے بچالیا تھا۔ وہ گساجن تک پہنچ جاتی تو نہ جانے اس کا کیا حال ہوتا۔ بلال شاہ راج پانڈے کی مردانگی پر بہت خوش تھا اور بتا رہا تھا کہ ایک دفعہ وہ بھی اپنی روٹھی ہوئی بیوی کو اسی طرح اُٹھا کر چک لالے سے خوشاب لے گیا تھا معلوم نہیں اس کے بعد کیا ہوا تھا۔

جس روز میں گڑھی سے رخصت ہوا نرملا اور پانڈے مجھے سی آف کرنے کے لئے موجود تھے۔ نرملا نے کہا' میں آپ کا شکریہ کس منہ سے ادا کروں؟۔

میں نے کہا' شکریہ تو آپ کئی روز پہلے ہی ادا کرچکی ہیں یہ تو میں ہی ڈھیٹ تھا کہ پھر بھی رخصت نہیں ہوا۔

نرملا نے اشک بار ہوکر کہا' آپ رخصت ہوجاتے تو پھر...... اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی اور اپنے خوبصورت ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔

......❁......❁......



فرحت قادر

کیا خون سفید ہو گئے؟

کچھ اولادیں تو ماں باپ کو بہت بڑا بوجھ خیال کرتی ہیں۔ گھر آئے مہمانوں دوست احباب یا رشتہ داروں کے ساتھ ان کا بیٹھنا ان کو پسند نہیں ہے۔ پہلے والدین اپنی ساری عمر اولاد کی پرورش، تعلیم و تربیت میں گزار دیتے ہیں جب ان سے فراغت ملتی ہے تو یہی اولاد ان کا جینا مشکل کر دیتی ہے۔

معاشرے کے سلگتے ہوئے مسئلے کے بارے میں چشم کشا تحریر

سال 2020ء کی آمد کے ساتھ ہی کرونا یعنی COVID-19 پوری دنیا کے لئے وبال بن کر نازل ہوا۔ کسی نے اس کو سائنسدانوں کا ناکام تجربہ قرار دیا، کسی نے چائنہ کو قصور وار ٹھہرایا کسی نے امریکہ کو، کسی نے چائنہ میں استعمال ہونے والی وہ خوراک جو کتے، بلیوں اور چمگادڑوں سے تیار کی جاتی ہے اس کو اس کا سبب قرار دیا۔ اگست 2020ء میں شائع ہونے والے ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ میں اس کے مدیر جناب کامران امجد نے اپنی ایک تحریر بعنوان

کرونا سے بچنے کیلئے یہودی اسرائیل جانے لگے! صفحہ نمبر 39 میں حیرت انگیز انکشاف کیا ہے کہ کرونا وائرس کے بارے میں جتنی سازشی تھیوریز سامنے آئی ہیں ان میں سے بعض کے مطابق یہودیوں کے تیرہ خاندان جو بہت بڑی حیثیت رکھتے ہیں وہ یہودی نظریات کی تکمیل کیلئے پوری دنیا میں سازشیں کررہے ہیں اور کرونا وائرس کی تباہی دراصل انہی کی سازش کا نتیجہ ہے۔ یہودیوں کے زیراثر W.H.O (ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن) کی کوشش ہے کہ کرونا وائرس کا خوف پھیلائے رکھا جائے مزید برآں کرونا وائرس کی عالمی وباء نے پچھلے چند مہینوں میں پوری دنیا میں جو تباہی مچائی ہے گزشتہ سو سالوں میں ایسا کوئی ریکارڈ نہیں ملتا۔

پاکستان میں بھی کرونا نے اپنا رنگ جمایا' وزیراعظم عمران خان' سرکاری عہدیدار' ڈاکٹرز' رضاکار' میڈیا اور عوامی نمائندگان میں اپنے ملک اور اس کے باشندوں کے لئے سخت تشویش پائی گئی۔ عوام کو گاہے بگاہے اس سے بچاؤ اور حفاظت کے لئے احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کے لئے باخبر رکھا جاتا رہا۔ علمائے کرام نے بھی اپنی ذمہ داری خوب نبھائی اور ناگہانی آفات سے بچاؤ کے لئے پڑھی جانے والی قرآنی دعائیں عوام تک پہنچاتے رہے۔ اس کے باوجود اس ظالم وباء کی وجہ سے ہزاروں افراد لقمہ اجل بنے۔ جس میں امیر' غریب' بچے' بوڑھے اور جوان سب ہی شامل تھے۔ اور تو اور ہمارے ڈاکٹرز' نرسز اور ہیلتھ ورکرز بھی اس آفت سے بچ نہ پائے۔ اللہ رب العزت مرحومین کی مغفرت فرمائے اور ان کے درجات بلند کرے۔ اور جیسا کہ علماء کرام کا بیان ہے کہ اس آفت کی وجہ سے موت کے منہ میں جانے والے شہید کہلوائیں گے خدا کرے ایسا ہی ہو۔ آمین ثم آمین۔

قارئین کرام! ہم میں سے کون اس بات سے واقف نہیں کہ کرونا وائرس سے ہم کن مصائب کا سامنا کررہے ہیں اور نجانے کب تک کرتے رہیں گے۔ پاکستانیوں کی اکثریت مسلمان ہے ہمارا مذہب اسلام ہے جو کہ دنیا کا دوسرا بڑا مذہب ہے۔ اس کی اجتماعیت کو جس طرح کرونا نے تباہ کیا اس کی تاریخ اسلام میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ سماجی فاصلوں کی وجہ سے حج اور عمرے پر جانے سے روک دیا گیا۔ مساجد میں نماز کی ادائیگی پہلے کی طرح ممکن نہ رہی۔ لاک ڈاؤن' سماجی فاصلہ' ماسک اور سینی ٹائزر اور لیبارٹری ٹیسٹ کی پابندی سے کچھ لوگوں کی آمدنی میں اضافہ ہوا اور کچھ اضافی اخراجات سے خوار ہوئے۔ کبھی کسی نے سوچا بھی نہ تھا کہ ایسے مصائب کا سامنا کرنا پڑے گا۔

دیہاڑی دار طبقہ تو بالکل ہی پس کر رہ گیا۔ پرائیویٹ نوکریاں بھی تقریباً ختم کردی گئیں۔ ادھر آخرت کو بھولے ہوئے لوگوں نے اپنے ہم وطنوں کو مصائب میں گھرے دیکھ کر ان کے زخموں پر مرہم رکھنے' دکھ درد میں کام آنے کے بجائے مہنگائی کا طوفان لے آئے۔ خوب لوٹ مار کی۔ کبھی کسی سرکاری عمارت کو اتنے طویل عرصہ کے لئے بند نہ کیا

گیا۔ تعلیمی اداروں میں طلباء و طالبات کے ایک دن غیر حاضر رہنے پر اساتذہ ناراض ہوتے‘ سرکاری ملازمین کے لئے ایک دن کی رخصت لینا بھی بہت مشکل تھا۔ کہاں اب مہینوں سے تعلیمی ادارے بند ہیں‘ اساتذہ اور بچے گھروں میں بیٹھے ہیں۔ وہ مائیں جو اپنے بچوں کے گھر رہنے پر تنگ آجائیں اب تو وہ بھی نہایت صبر سے بچوں کو برداشت کررہی ہیں۔ شوہر کی گھر میں بے جا مداخلت‘ چھوٹی موٹی نوک جھونک بھی بھا گئی ہے۔ کہیں کہیں شوہروں کے ہاتھوں بیویوں کے پٹنے کے واقعات سامنے آئے اور کہیں بیویوں نے شوہروں کی پٹائی کرڈالی مگر ایسے واقعات کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ گھروں میں مقید اکثر خاندان شب و روز اللہ عزوجل کے حضور دست بدعا ہیں کہ اے اللہ پاک ہم پر رحم فرما ہمیں اس آفت سے نجات دے اور پوری دنیا کو اپنے حفظ و امان میں رکھ۔ یقیناً اللہ نے ان خواتین وحضرات کی دعائیں قبول فرمالی ہیں اور پورے پاکستان پر کرم فرمایا ہے اور کرونا وائرس فی الحال کمزور پڑگیا ہے۔

خوف خدا رکھنے والوں نے جس قدر ہوسکا اللہ کے حضور مغفرت کی دعا مانگی‘ بھولے بسرے رشتہ داروں سے رابطے کئے۔ اردگرد پڑوسیوں‘ غریبوں ناداروں کا خیال رکھا۔ اپنے حج عمرہ کے لئے محفوظ رکھی گئی رقم سے غرباء کو راشن لے دیئے۔ امراء نے بھی بڑھ چڑھ کر ضرورت مندوں کی مدد کی مگر وہ لوگ جن کے اندر خدا خوفی نام کی کوئی شے نہیں ہے انہوں نے ایک کان سے سنی اور

شگوفے

○ کیا بھلا دور تھا جب ماں کہتی تھی کہ بیٹا! اُٹھ جاؤ فجر کی اذان ہورہی ہے۔ صد افسوس! زمانے نے کیسی کروٹ لی کہ آج ماں کہتی ہے بیٹا! اب تو سو جاؤ کہ فجر کی اذان ہورہی ہے۔

○ مدتوں بعد پوچھا اس نے اب کہاں رہتے ہو؟
میں نے کہا کہ جناب! اپنی اوقات میں......!

○ حضرت بازید بسطامیؒ کے زمانے میں لوگوں نے ایک آتش پرست سے‘ جو ان کا معتقد اور ان کی عظمت کا معترف بھی تھا مسلمان ہونے کو کہا‘ اس نے کہا اگر اسلام اس مذہب کا نام ہے جو حضرت بازیدؒ کا ہے تو اس کو قبول کرنے کی مجھ میں طاقت نہیں اور جس طرح کے تم مسلمان ہو یہ اسلام مجھے پسند نہیں۔

بقول شخصے

نکالا ہم کو جنت سے فریب زندگی دے کر
دیا پھر شوق جنت کیوں؟ یہ حیرانی نہیں جاتی

(مرسلہ: ضرار ندیم۔ شرقپور)

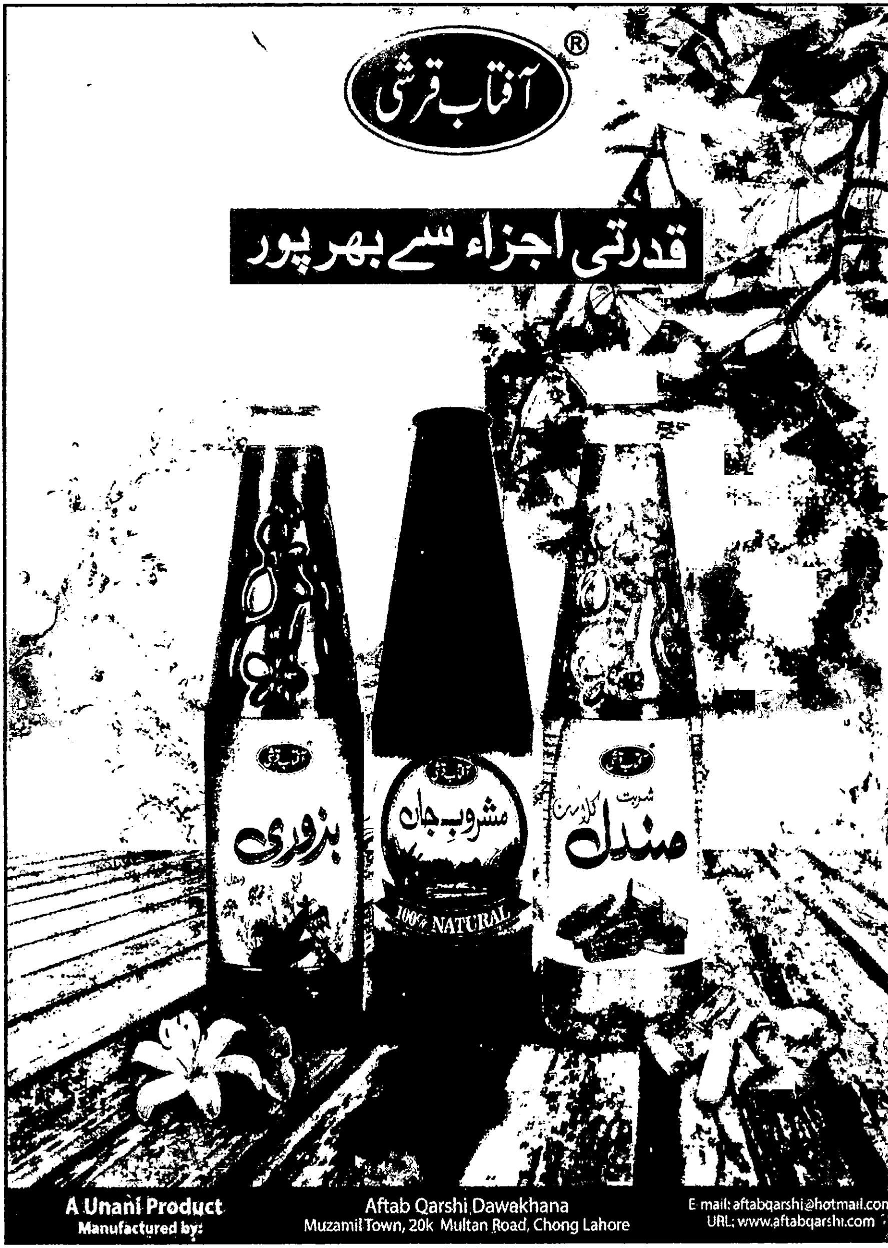
دوسرے سے نکال دی۔ لوٹ مار‘ چوری‘ ڈاکہ زنی‘ قتل و غارت‘ چور بازاری‘ دھوکہ دہی‘ مہنگائی‘ دوسرں کا مذاق اُڑانا‘ بلا جواز تنقید کرنا‘ عورتوں کی بے حرمتی‘ بزرگوں کی بے ادبی‘ ماں باپ کی نافرمانی‘ کمزوروں پر ظلم و ستم‘ قطع رحمی‘ حق وراثت کو غصب کرنا‘ سادہ زندگی گزارنے اور رزق حلال کھانے والوں کو ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھنا‘ اپنے سوا سب کو حقیر خیال کرنا‘ تکبر‘ غرور‘ حسد‘ بُغض‘ کینہ یہ سب بھی جوں کا توں جاری ہے۔

سب سے زیادہ دل و دماغ کو زخمی کرنے والی اور صدمہ پہنچانے والی جو خبریں سُننے میں آرہی ہیں وہ اولاد کی طرف سے والدین کا قتل ہے۔ وہ بھی ان کی زندگی میں ان کی جائیداد حاصل کرنے کے لئے۔ نامعلوم وجوہات کی بنا پر تین بچوں کو زہر دے کر ماں کا خودکشی کرنا ہے‘ اسی طرح بیوی کا کسی غیر مرد کے ساتھ ملی بھگت کر کے اپنے شوہر کو قتل کردینا یہ بھی سننے میں آیا کہ شوہر دوسری شادی کی خواہش پوری کرنے کے لئے اپنی موجودہ بیوی کو قتل کردیتا ہے یا جلا دیتا ہے۔ اکثر بیوی کے قتل کو غلط رنگ دیا جاتا ہے یعنی کہ اسے بدکردار ظاہر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور مجرم کو بچانے کے لئے ایسے قتل کو غیرت کے نام پر قتل کہا جاتا ہے۔

گو پاکستان میں اس وقت ایسے کئی ادارے موجود ہیں جو حقوق انسانی و حقوق نسواں کے لئے مظلوموں اور حقداروں کی داد رسی کے دعویدار ہیں مگر مقتول کی موت کے بعد چند جملوں میں افسوس کا اظہار کرنے کے علاوہ کچھ نہیں کرتے۔ اگر یہ ادارے دیانتداری سے اپنے مشن کو لے کر آگے چلیں قتل ہونے کے بعد ہی کیوں؟ جہاں کہیں ضعیف العمر لوگ رہتے ہیں ان کے اعداد و شمار کا ریکارڈ تیار کریں اور ان کی سرپرستی کریں تو ایسے واقعات میں کافی حد تک کمی آسکتی ہے۔

کئی لوگ ایسا سوچتے ہیں کہ والدین کو اذیت دینے والے ان کے سامنے بے ہودہ الفاظ استعمال کرنے والے‘ ان کی اکثر پٹائی کرنے والے‘ ان پر اپنے فیصلے مسلط کرنے والے‘ ان کے ذاتی مال و ملکیت کو بلا اجازت استعمال کرنے والے‘ ان کی شخصیت کو مسخ کرنے والے ماں باپ نے رزق حلال سے ان پر جو خرچ کیا ان کو اعلیٰ تعلیم دلوائی وہ انتہائی بے شرم اور بدتمیزی سے ماں باپ پر ہنستے ہیں ان کا مذاق اُڑاتے ہیں اور کہتے ہیں تم نے ہمارے لئے کیا کیا؟ خرچ تو ہم اپنے بچوں پر کررہے ہیں۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ واقعات صرف غریب آبادیوں میں پیش آتے ہیں کیونکہ ایسے جرائم میں ملوث پائے جانے والے افراد جاہل‘ اجڈ غربت کے مارے اور دین اسلام سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ نافرمان اولاد کے لئے حسب نسب‘ ذات پات یا چھوٹے بڑے یا امیر غریب کا ہونا قطعاً درست نہیں ہے نہ ہی اس کے لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ والدین کی تربیت غلط ہے۔ میڈیا میں تو کوئی اکا دکا واقعہ منظر عام پر آجاتا ہے نجانے کتنے ایسے


آفتاب قرشی
قدرتی اجزاء سے بھرپور
بزوری
مشروبِ جاں
100% NATURAL
شربت
صندل
A Unani Product
Manufactured by:
Aftab Qarshi Dawakhana
Muzamil Town, 20k Multan Road, Chong Lahore
E-mail: aftabqarshi@hotmail.com
URL: www.aftabqarshi.com

مظلوم ماں باپ ہیں جو ظالم اولاد کے ہاتھوں ذلیل ہورہے ہیں مگر ان کے خوف سے کسی کے سامنے اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات بیان نہیں کرسکتے۔ کچھ اولادیں تو ماں باپ کو بلاوجہ بہت بڑا بوجھ خیال کرتی ہیں۔ گھر آئے مہمانوں دوست احباب یا رشتہ داروں کے ساتھ ان کا بیٹھنا ان کو پسند نہیں ہے۔ پہلے والدین اپنی ساری عمر اولاد کی پرورش، تعلیم و تربیت میں گزار دیتے ہیں جب ان سے فراغت ملتی ہے تو یہی اولاد ان کا جینا مشکل کردیتی ہے۔ والدین کی دلجوئی کے لئے ان کے پاس وقت ہی نہیں ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ جب تمہارے والدین بوڑھے ہوجائیں تو ان کے سامنے اُف تک نہ کہو۔ مگر ایک واقعہ ایسا بھی دیکھنے میں آیا کہ ایک پڑھا لکھا بیٹا اپنے باپ کی طرف نازیبا الفاظ استعمال کرتے ہوئے بڑھتا ہے تو اس کا بوڑھا باپ خوف کے مارے وہیں ڈھیر ہوجاتا ہے یعنی موت واقع ہوجاتی ہے۔

اکثر نافرمان اولاد جوان ہوتے ہی والدین سے جائیداد کے بٹوارے کا مطالبہ شروع کردیتی ہے۔ ان کی خدمت کرنے کے بجائے ہمہ وقت طعنہ زنی اور تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ ان کی کسی بات کو اہمیت نہیں دیتے بلکہ اکثر ان کی باتوں کو نظرانداز کرتے ہوئے ہوا میں اُڑا دیتے ہیں۔ مہمانوں میں اپنے ضعیف العمر والدین کو متعارف کروانا اپنی ہتک خیال کرتے ہیں۔ سنی سنائی باتوں پر یقین کرتے ہیں یکطرفہ کارروائیاں کرکے ان کی تذلیل کرنا عام سی بات ہے۔ راقم الحروف اپنے اردگرد بہت سے ایسے خاندانوں کو جانتی ہے جن کی اولاد نے اپنے بوڑھے والدین میں سے دونوں یا کسی ایک کو پانے کی صورت میں انہیں بوجھ خیال کیا ان پر بے جا پابندیاں عائد کیں ان کے جیتے جی ان کے جلد مرجانے کا سوچا۔ ان کی موجودگی میں دوست احباب اور رشتہ داروں کو والدین کے مرجانے کی صورت میں جائیداد کے بٹوارے کے بعد مستقبل کے لئے تیار کئے گئے لائحہ عمل کے بارے میں بتایا۔ والدین تو اولاد کی طرف سے دی گئی آہیں، سسکیاں، چپکے چپکے آنسو بہانا، پوری دنیا سے لاتعلقی، بے چارگی، بے بسی اور تنہائی کے دکھوں سے نجات پاکر بالآخر ایک دن موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔ حریص اولاد وراثت کا مال پاکر بہت خوش دکھائی دیتی ہے مگر نہ تو سکون میسر آتا ہے نہ ہی مال اور زندگی میں برکت ہوتی ہے اور وقت سے پہلے یہ وفات پا جاتے ہیں کیونکہ اللہ رب العزت رشتوں کے تقدس کو پامال کرنے والوں کی زندگی، مال اور اولاد میں برکت نہیں دیتا۔

بیشک قارئین آپ نے بھی اسے کئی واقعات دیکھے اور سنے ہونگے۔ اس وقت ہمارے ملک میں حقوق انسانی پر سب سے زیادہ کام ہورہا ہے۔ نام نہاد اداروں کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ شب و روز فلاح انسانیت کے لئے کام کررہے ہیں مگر کوئی نہیں جانتا گھروں میں موجود کچھ خاندانوں کے بزرگوں کا کیا حال ہے؟

دھوپ کھائیے، جان بچائیے

خاور قیوم

سائنسدانوں نے پتا لگایا ہے کہ مناسب دھوپ کھانے سے نا صرف بلند فشار خون کو اعتدال پر رکھا جا سکتا ہے بلکہ دل کے دورے اور فالج کے خطرے سے بھی بچا جا سکتا ہے۔



سائنسدانوں نے پتا لگایا ہے کہ، مناسب دھوپ کھانے سے نا صرف بلند فشار خون کو اعتدال پر رکھا جا سکتا ہے بلکہ، دل کے دورے اور فالج کے خطرے سے بھی بچا جا سکتا ہے۔علم ہیئت ر فلکیات کے ماہرین کہتے ہیں کہ سورج کی روشنی تقریباً 93 ملین میل کا سفر طے کرتی ہوئی زمین تک پہنچتی ہے جو ہمارے لیے خوراک، ہوا اور پانی کی طرح ضروری ہے جبکہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ زمین کی فضا میں موجود اوزون کی تہہ سورج کی تابکار شعاعوں کا تقریباً 98 فیصد جذب کر لیتی ہیں جس کے بعد زمین تک سورج کی صرف 2 فیصد الٹرا بنفشی تابکار شعاعیں پہنچتی ہیں۔

طبی معالجین جلدی کینسر سے بچنے کے لیے زیادہ دیر تک دھوپ سینکنے کو مضر قرار دیتے ہیں لیکن دوسری

جانب دھوپ انسانی صحت کے لیے غذا بھی ہے اور شفا بھی ہے۔سائنسدانوں نے پتا لگایا ہے کہ مناسب دھوپ کھانے سے نا صرف بلند فشارخون کو اعتدال پر رکھا جاسکتا ہے بلکہ دل کے دورے اور فالج کے خطرے سے بھی بچا جاسکتا ہے۔

تپتے سورج کی دھوپ سینکنے سے فشار خون کو کیسے کنٹرول کیا جاسکتا ہے؟

''ساؤتھ ہمپٹن یونیورسٹی'' کے تحقیق کاروں نے دریافت کیا ہے کہ دھوپ کھانے سے جلد اور خون کی شریانوں میں موجود ایک خاص مرکب نائٹرک آکسائیڈ (گیس مالیکیول) کی سطح تبدیل ہو جاتی ہے۔تحقیق کار مارٹن فیلیش نے کہا کہ نائٹرک آکسائیڈ یا (این او) کا مرکب قدرتی طور پر ہماری جلد کے اندر وافر مقدار میں موجود ہے جو بلڈ پریشر کو اعتدال میں رکھنے کے کام آتا ہے۔ سائنس دانوں نے بتایا کہ دھوپ کی وجہ سے جلد سے نائٹرک آکسائیڈ کے علاوہ اس کے ٹوٹے پھوٹے سالموں کا اخراج ہوتا ہے جن کی تھوڑی مقدار خون کی گردش میں شامل ہو جاتی ہے۔ این او مالیکیول خلیات کے درمیان پیغام رسانی کا کام انجام دیتا ہے لیکن اس کا ایک اہم کام خون کی وریدیں کھولنا بھی ہے جس سے خون کی وریدوں پر دباؤ کم ہو جاتا ہے، خون کی گردش بہتر ہوتی ہے اور فشار خون میں کمی ہوتی ہے اور ساتھ ہی دل کے دورے اور فالج کے حملے کا خطرہ بھی کم ہو جاتا ہے۔

امراض قلب کے حوالے سے پروفیسر فیلیش نے کہا کہ بلند فشار خون اور دل کی بیماریاں موسم اور عرض بلد کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہیں خاص طور پر موسم سرما میں اس مرض میں اضافہ ہو جاتا ہے ایسے ممالک جو خط استوا سے دور واقع ہیں اور جہاں سورج کی بنفشی تابکاری شعاعیں کم پہنچتی ہیں وہاں موسم سرما کے دوران ایسے کیسز کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا ہے۔مطالعے میں شامل 24 رضا کاروں کو 20 منٹ دورانیے کے دو مختلف تجربات سے گزارا گیا۔ پہلے سیشن میں انھیں الٹرا بنفشی تابکار شعاعوں اور ہیٹنگ لیمپ کی حدت سے گزارا گیا، دوسرے تجربے میں شرکاء کو صرف لیمپ کی گرمی سے حدت پہنچائی گئی۔ ''جرنل انویسٹیگیشن ڈرماٹولوجی'' کے مطابق نتیجے سے پتا چلا کہ دھوپ کی وجہ سے خون کی وریدوں میں پھیلاؤ پیدا ہوتا ہے جس سے بلند فشار خون میں نمایاں کمی ہوتی ہے اور خون کی گردش میں این او کی سطح میں تبدیلی واقع ہوتی ہے لیکن وٹامن ڈی کی سطح میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی ہے۔

انھوں نے کہا کہ، جلد کی اوپری تہوں میں موجود پہلے سے ذخیرہ شدہ این او کی سطح خون کی وریدیں کھولنے میں ایک ثالثی کا کردار ادا کرتی ہے۔ پروفیسر فیلیش نے بتایا کہ ''کینسر کی روک تھام کے لیے سورج کی روشنی سے بچنے کے خوف میں ایک مخصوص طرز زندگی اختیار کرنا ،دل کی بیماریوں کے خطرات کو بڑھا سکتا ہے جبکہ جلد میں موجود مرکب این او بہت اہم ہے جسے قلبی صحت کے حوالے سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔'' تاہم انھوں نے کہا کہ نتیجہ انسانی صحت پر سورج کی روشنی کے ممکنہ فوائد اور نقصانات کے حوالے سے بہت اہم ہے اور عوامی صحت کے مفاد میں ایک تازہ جائزہ لینے کی ضرورت کا احساس پیدا کرتا ہے۔

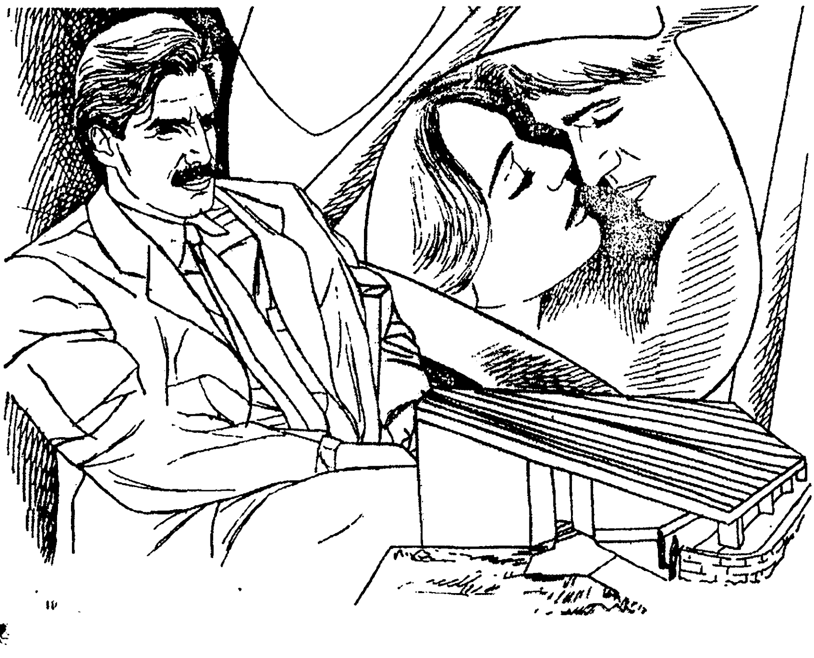
بتایا گیا ہے کہ دنیا میں ہر سال 30 فیصد اموات بلند فشار خون اور دل کی بیماریوں کی وجہ سے ہوتی ہیں صرف برطانیہ میں دل کی بیماریوں کے باعث ہر سال 88,000 اموات واقع ہو رہی ہیں۔

جھوٹی پجارن

محمد سلیم اختر

فریال فوراً میرے قدموں میں گر گئی اور کہنے لگی۔ ’’ناصر! مجھے معاف کر دو۔ میں صرف تمہیں آزمانا چاہتی تھی۔ تم آزمائش پر پورے اُترے ہو۔ واقعی تم خاندانی اور عظیم انسان ہو۔ تمہاری یہی خوبی مجھے مان اور فخر دیتی ہے کہ میرا محبوب ایک بلند کردار انسان ہے۔‘‘

ایک شخص کی کہانی جسے ایک فلم ایکٹرس سے دیوانوں جیسا پیار ہو گیا تھا



میں ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ جس کا اپنے علاقہ میں اور ملکی سیاست میں بھی ایک اہم مقام ہے۔ برسوں سے یہ سلسلہ نسل در نسل چلتا آرہا ہے۔ ہمارے خاندان کے ماتحت کئی گاؤں ہیں۔ ہزاروں مزارع ہیں...... جائیداد اور مال و دولت ہمارے پاس بے حساب ہے...... علاقہ میں عزت وقار ہے۔ جب ملک میں الیکشن ہوتا ہے تو اپنے علاقے کی سیٹ سو فی صد ہماری ہوتی ہے۔ ہم نے کبھی شکست کا سامنا نہیں کیا...... کبھی دھونس دھاندلی ، ہیرا پھیری اور اوچھے ہتھکنڈوں سے

ووٹ حاصل نہیں کیئے بلکہ لوگ کود ہی ووٹ ہمارے حق میں ڈال دیتے ہیں اس کی وجہ صرف اور صرف یہی ہے کہ ہم نے اپنے مزارعوں کا حق کبھی نہیں مارا......حالانکہ ان کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ ہمیں وہ اپنی اولاد کی طرح عزیز ہیں......جب بھی فصل وغیرہ پک کر تیار ہو جاتی ہے تو اسے گوداموں میں لانے سے قبل ہر مزارع کو یہ اجازت دی جاتی ہے کہ اسے اپنی ضرورت کے لئے جتنی بھی گندم اور دیگر اجناس درکار ہیں وہ اپنے گھر لے جا سکتا ہے۔ انہیں کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ ان کے کام کی اجرت ان کو الگ ملتی ہے۔ جب بھی کسی مزارع کے بیٹے یا بیٹی کی شادی ہوتی ہے تو دولہا اور دولہن تمام جہیز، بری اور شادی کا تمام خرچ ہم برداشت کرتے ہیں۔ ولیمہ بھی ہماری طرف سے دیا جاتا ہے جس میں میرے ابا جان بذات خود شرکت کرتے ہیں اور ان لوگوں میں یوں کھل مل جاتے ہیں جیسے وہ ان میں ہی سے ہوں......یہی وجہ ہے کہ وہ بھی احسان فراموش نہیں ہیں......ان سے ووٹ مانگیں تو جواب ملتا ہے۔

''سائیں!......ہم سے ووٹ نہ مانگو......ہم سے جان مانگو...... ہماری جان آپ کی امانت ہے۔''

اسی لئے ان لوگوں کے ووٹ ہمیں کامیابی سے ہم کنار کرتے ہیں......ہم نے اپنی کامیابی اور طاقت کبھی نا جائز فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ علاقے کے لوگوں کی ہمیشہ بے لوث خدمت کی ہے ان کے دکھ درد کو اپنا دکھ اور درد جانا ہے۔ معمولی اور چھوٹے موٹے جھگڑوں کے فیصلے میرے ابا جان ہی کرتے ہیں۔ وہ کسی کی بھی حق تلفی نہیں ہونے دیتے۔ اس لئے کہ وہ اصول پسند انسان ہیں۔ اصولوں کی خاطر وہ جان بھی لٹانے کو تیار ہیں مگر بے اصولی سے انہیں نفرت ہے۔ وہ جتنے رحم دل اور نرم انسان ہیں۔ اس سے کئی گنا زیادہ سخت بھی ہیں۔ کسی معاملہ میں ڈٹ جائیں تو پھر دنیا کی کوئی طاقت ان کا ارادہ نہیں بدل سکتی...... خاص کر اپنے گھریلو معاملات میں بدنظمی کسی صورت میں برداشت نہیں کرتے۔ ان کا رُعب اور دبدبہ ہی ایسا ہے کہ کسی کو ان کے سامنے زبان کھولنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی۔ خاندانی وقار اور روایات کے وہ سختی سے پابند ہیں۔ ضد میں آ جائیں تو وہ کسی نفع نقصان کی پرواہ نہیں کرتے۔ زیادہ تر وہ نقصان ہی اٹھاتے ہیں مگر پھر بھی انہوں نے کبھی ہار نہیں مانی۔ بلکہ ہارنا سیکھا نہیں۔ انہوں نے جیت کو ہمیشہ اپنا مقدر ہی جانا ہے...... رینا مجھ سے بڑی ہیں۔ میں اس سے چھ سال چھوٹا ہوں۔ ہم دونوں اپنے والدین کی آنکھوں کے تارے ہیں محل نما حویلی میں ہم دونوں کی کلکاریاں گونجا کرتی تھیں۔ میری پیدائش پر خصوصی طو پر اتنی خوشی منائی گئی تھی کہ علاقے کے لوگ اب بھی اس تقریب کو یاد کرتے ہیں۔ میرے ابا جان نے تجوریوں کے منہ کھول دیئے تھے۔ غریبوں اور ناداروں کو سیراب کر ڈالا تھا۔ اتنا بڑا کھانا دیا تھا کہ جس میں ہزاروں بکرے ذبح کئے گئے...... ہم دونوں بہن بھائی کو دنیا کی ہر آسائش میسر تھی۔ ابا جان خاصے پڑھے لکھے انسان ہیں اس لئے ان کو تعلیم کی اہمیت کا بخوبی احساس تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہم دونوں کو اعلیٰ تعلیم دلانا چاہتے تھے۔ وہ رینا باجی کو ڈاکٹر اور مجھے کمشنر دیکھنا چاہتے تھے یا پھر وہ مجھے اپنا جیسا سیاستدان بنانا چاہتے تھے۔

رینا باجی نے میٹرک کا امتحان قصبہ کے سکول

سے پاس کیا تو ابا جان نے اسے راولپنڈی میں خواتین کے ڈگری کالج میں داخلہ دلا دیا۔ رہائش ہاسٹل میں تھی۔ میں ان دنوں میٹرک میں تھا کہ رینا باجی نے گریجویشن کر لی۔ ابھی ان کا میڈیکل کالج میں داخلہ ہونا تھا کہ برادری میں ہی سے ایک رشتہ رینا باجی کے لئے آ گیا۔ جواد رشتہ میں ہمارا کزن ہے۔ پڑھا لکھا اور خوبصورت نوجوان تھا۔ سب لوگ اس رشتہ پر رضا مند تھے کہ رینا اور جواد کی جوڑی خوب رہے گی۔ مگر ابا جان رینا باجی کو ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے اس لئے وہ فی الحال شادی نہ کرنا چاہتے تھے اس لئے انہوں نے انکار کر دیا۔ جواد کے گھر والوں نے ابا جان کے انکار پر بہت ہی افسوس کا اظہار کیا اور ناراضگی بھی بنا لی مگر ابا جان نے کسی کی بھی پرواہ نہیں کی۔ ان کی کوششوں اور سفارش سے رینا باجی کو میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا۔ ابھی چند ماہ ہی گزرے تھے کہ یہ خبر ہماری حویلی پر بجلی بن کر گری کہ......''جواد اور رینا نے کورٹ میرج کر لی ہے''۔

یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ جواد اور رینا ایک دوسرے سے بے انتہا محبت کرتے تھے دونوں نے ساتھ جینے اور مرنے کی قسمیں کھا رکھی تھیں ..... یہ خبر ہمارے خاندان کے لئے طوفان بن کر آئی اور بہت کچھ برباد کر کے چلی گئی۔ ابا جان نے جواد کے خاندان کے ساتھ مرنا جینا ختم کر ڈالا...... رینا کو ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ دی اور اسے کہلوا دیا کہ وہ ہمارے لئے مر گئی ہے۔''

ابا جان نے جواد کے خاندان کو وہ علاقہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ وہ شہر چلے گئے اب بھی وہ لوگ شہر میں رہتے ہیں۔ رینا کے بچے ہیں وہ جواد کے ہمراہ ایک خوشحال اور پرسکون زندگی گزار رہی ہے۔ مگر ابا جان نے اس کا مکمل بائیکاٹ کر رکھا ہے۔ رینا کا تو وہ نام بھی سننا گوارہ نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ میرے ہاں صرف ایک بیٹے نے ہی جنم لیا تھا۔

ابا جان کا غصہ، رعب اور دبدبہ ان دنوں میں نے دیکھا تو سہم گیا۔ اور پھر جب مجھے ابا جان راولپنڈی کے گارڈن کالج میں داخل کرانے لے گئے تو داخلہ ہونے اور ہوسٹل میں رہائش رکھنے کے بعد انہوں نے مجھ کہا......

''ناصر بیٹے!......مجھے تم سے کئی امیدیں وابستہ ہیں۔ تم میرے اکلوتے اور لاڈلے بیٹے ہو۔ میں تمہیں اپنا جانشین سمجھتا ہوں۔ تم خود بھی ہر بات سمجھتے ہو۔ اس لئے مجھے امید ہے کہ تم میرا مان رکھو گے اپنے خاندان کا وقار قائم رکھو گے۔ تم میری امنگوں کا مرکز ہو مرا دل مت دکھانا ورنہ میں برداشت نہیں کر پاؤں گا'' ......ابا جان کے لہجے میں نرمی اور سختی دونوں موجود تھیں۔ میں پہلے ہی ان سے خوفزدہ تھا۔ اس لئے میں نے سر تسلیم خم کر دیا اور کہا۔

''ابا جان...... آپ بے فکر رہیں۔ میں آپ کے خوابوں کو تعبیر ضرور دوں گا''۔

شہری ماحول' کالج اور ہوسٹل کی زندگی سے میرا پہلی بار واسطہ پڑھا تھا۔ یوں لگ رہا تھا میں گاؤں میں کسی قیدی کی طرح رہ رہا تھا اور اب آزاد فضاؤں میں آ گیا ہوں۔ اس لئے میں اس آزادی سے پوری طرح لطف اندوز ہونے لگا ..

امتیاز خان..... میرا کلاس فیلو اور روم میٹ تھا۔ ہم دونوں ہوسٹل میں ایک ہی کمرے میں رہتے تھے۔ آہستہ آہستہ ہم دونوں دوستی کے بندھن میں

بھی بندھ گئے...... امتیاز خان کا تعلق صوبہ خیبر پختونخوا سے تھا۔ ان کے خاندان میں کوئی پرانی دشمنی چل رہی تھی۔ اس لئے اس کے باپ نے اسے خاندانی اور روایتی لڑائی جھگڑوں سے دور رکھنے کے لئے راولپنڈی بھیج دیا تھا۔ امتیاز کو پڑھائی کا کوئی زیادہ شوق نہ تھا۔ اسے اداکاری کرنے کا بہت شوق تھا۔ اس لئے وہ ہر وقت فلموں اور اداکاروں کی باتیں کرتا رہتا۔ اس کا کوئی عزیز فلم ساز بھی تھا۔ جو جو صرف پشتو فلمیں بناتا تھا۔ اس نے بھی امتیاز خان کو امید دلا رکھی تھی کہ وہ اسے روشنیوں کی دنیا میں ضرور لائے گا۔ مگر مجھے ان چیزوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی میں نے ابھی تک سینما کی شکل نہ دیکھی تھی اور نہ ہی مجھے فلموں اور اداکاروں کے نام آتے تھے۔ میری اب بھی پوری توجہ پڑھائی کی جانب تھی۔ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے بڑا انسان بن کر ابا جان کے خوابوں کو تعبیر دینا چاہتا تھا۔

امتیاز خان روزانہ ہی اس موضوع پر بات کرتا تھا۔ اس لئے آہستہ آہستہ میں بھی فلموں اور فلمی اداکاروں کے ناموں سے واقف ہو گیا تھا۔ یہ 1970ء کی بات ہے۔ ان دنوں محمد علی، وحید مراد (مرحوم) ندیم اور شاہد جیسے اداکاروں کا طوطی بول رہا تھا۔ ان ہی دنوں محمد علی اور زیبا کی ایک فلم ”انسان اور آدمی“ کی ہر طرف دھوم مچی ہوئی تھی۔ امتیاز خان کے اصرار پر میں بھی یہ فلم دیکھنے چلا گیا...... وہ فلم میری زندگی کی پہلی فلم تھی جو میں نے دیکھی...... واقعی وہ فلم بہت ہی اچھی تھی۔ مجھے بھی بے حد پسند آئی۔ اتنی کہ میں نے وہ فلم دس بار دیکھی۔ بس اس روز سے مجھے بھی فلمیں دیکھنے کا جنون ہو گیا۔ امتیاز خان اب بہت خوش تھا کہ میں بھی اس کے ساتھ اب فلموں اور اداکاروں کی باتیں کرنے لگا ہوں۔ اب ہم دونوں مل کر ہفتہ میں ایک بار فلم ضرور دیکھتے تھے۔ مگر ایک اہتمام کے ساتھ...... سینما ہمارے کالج اور ہوسٹل سے زیادہ دور نہ تھے مگر پھر بھی ہم ایڈوانس بکنگ کراتے اور نہایت ہی مزے سے فلم دیکھتے۔ فلم دیکھنا بھی ہمارا ایک معمول بن گیا تھا۔ مگر پھر بھی میں نے فلموں کو اپنی زندگی اور پڑھائی پر حاوی نہ ہونے دیا۔ میں پڑھائی کے معاملہ میں بھی آگے بڑھ رہا تھا۔ میرا تعلیمی ریکارڈ شاندار ہوتا جا رہا تھا۔ فلم دیکھنا محض ایک واحد تفریح تھی۔ اس کے علاوہ نہ تو مجھے کسی چیز کا شوق تھا اور نہ ہی میرے اندر کوئی ایسی خواہش تھی جو پوری نہ ہوئی ہو۔ فلم دیکھنے کے شوق کو میں نے اپنے ٹائم ٹیبل میں شامل کر لیا تھا...... فلم کا کوئی بھی منظر دیکھ کر میں اسے اپنے احساسات پر حاوی نہ ہونے دیتا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ یہ سب کچھ فرضی ہے...... بھلا وہ ہے...... حقیقت کا ان سے دور کا تعلق بھی نہیں ہے۔

ہمارے کالج میں بھی ڈرامے اور اسٹیج پلے ہوتے رہتے تھے۔ میں اور امتیاز دونوں اس کے ممبر تھے۔ امتیاز تو ان ڈراموں میں اداکاری بھی کرتا تھا مگر میرا نام محض خانہ پری کے لئے تھا۔ اداکاری کا شوق صرف امتیاز کو تھا۔ میں محض اس سے دوستی نبھانے کے لئے اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ امتیاز خان واقعی اداکاری میں ماہر ہوتا جا رہا تھا۔ یہ اس کے شوق کا نتیجہ تھا۔ اس کی پرفارمنس دیکھ کر نظر آتا تھا کہ وہ مستقبل کا کامیاب اداکار ضرور بنے گا۔ اس کی شکل وصورت اس کی کامیابیوں کی راہ میں حائل ہوتی تھی۔ وہ پٹھان ہونے کے باوجود بھی اتنا حسین نہ تھا۔ رنگ بھی اس کا سیب کی طرح سرخ نہ تھا۔ مگر

اسے اس کی پرواہ نہ تھی اسے بھی یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن اس کی محنت رنگ لائے گی اور اپنی منزل پالے گا میری تمام تر دعائیں اس کے ساتھ تھیں۔ میں اپنی تعریف نہیں کررہا بلکہ یہ حقیقت ہے کہ امتیاز کے برعکس میں ایک بھرپور اور وجیہہ جوان تھا۔ ان دنوں ہمارے کالج میں لڑکیاں بھی ساتھ ہی پڑھا کرتی تھیں شاید اس لئے کہ کالجوں کی کمی تھی...... میں اپنے دراز قد پھرتیلے جسم سرخ و سپید رنگت اور یونانی نقوش کے باعث صنف نازک میں بے حد مقبول تھا۔ مجھ میں کوئی عجیب سی کشش پائی جاتی تھی میرے حسن اور خوبصورتی کے قوس قزح سے لڑکیاں اپنے دل کا افق سجاتی تھیں...... مگر مجھے ان سے کوئی غرض نہ تھی۔ میں کسی کو آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھتا تھا، ان میں سے کوئی بھی میری پسند اور میرا تخیل نہ تھا۔ میں عورت کے قرب سے ہی دور بھاگتا تھا۔ اسی لئے کئی حسین لڑکیوں کو دیکھ کر بھی میرے من میں ہلچل نہ مچی تھی۔ میں نے اپنا سینہ پتھر کا بنا لیا تھا۔ جس پر کسی نرم گرم احساسات کا اثر ہی نہ ہوتا تھا۔ کئی لڑکیوں نے میری طرف قدم بڑھائے مگر انہیں مایوسی ہی ہوئی۔ اور مجھے مغرور کے لقب سے بھی نوازا گیا۔ مگر ایسا ہرگز نہ تھا۔ میں مغرور نہ تھا ایک تو اس لئے کہ کوئی میرے من کو بھاتی ہی نہ تھی اور دوسرا اس لئے کہ میں جانتا تھا کہ میری زندگی کا ہم سفر چننے کا اختیار صرف میرے باپ کو ہے۔ وہ جس کو بھی میرے پلے باندھیں گے۔ مجھے اسے قبول کرنا ہوگا۔ اسی لئے میں کالج کی کسی بھی ساتھی کو دھوکہ نہیں دینا چاہتا تھا...... امتیاز مجھے بدھو کہتا تھا وہ کہا کرتا تھا:۔

''ناصر!...... گھر آئی دولت کو ٹھکرانا نہیں چاہیے۔ میں تو ہوں ہی بدصورت...... شاید اسی لئے کوئی لڑکی مجھے لفٹ ہی نہیں کراتی۔ مگر تم پر کئی لڑکیاں مرتی ہیں...... تمہارے اشارے اور ہاں کی دیر ہے وہ پکے پھل کی طرح تمہاری جھولی میں آن گریں گی۔ مگر تم تو سنگدل ہو ہر ایک کا دل توڑ دیتے ہو۔ اور دل توڑنا گناہ ہے''۔

''نہیں امتیاز خان نہیں...... میں کسی کو دھوکہ نہیں دینا چاہتا اور پھر محبت زبردستی کا سودا نہیں یہ ہو جاتی ہے۔ خود بخود چپکے چپکے...... اور اچانک...... اور ابھی مجھے یہ بیماری نہیں لگی۔ نہ جانے کب یہ بیماری لگ جائے۔ اور میں بے اختیار ہو جاؤں'' میرا جواب سن کر امتیاز کہتا تھا:۔

''ہاں تمہارے لئے کوئی کوہ قاف سے پری آئے گی تب ہی تمہارا سینہ پگھلے گا۔'' کئی بار وہ صبح ہی اٹھ کر کہتا کہ ''آج رات میں نے دیکھا کہ ایک پری ہمارے ہوسٹل میں آئی ہے۔ کہیں وہ ہمارے کمرے میں تو نہیں آئی۔''

یہ مذاق اس کا روزمرہ کا معمول بن گیا تھا مگر میں اپنی ہی دنیا میں گم تھا۔ تمام توجہ تعلیم پر لگا رکھی تھی۔

☆☆☆☆☆

عذرا ہماری ہی کلاس میں پڑھتی تھی۔ وہ راولپنڈی کے ایک لکھ پتی سیٹھ کی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی تھی۔ بلا کی حسین بھی تھی اس کی سمندر جیسی گہری آنکھیں، صنوبر جیسا دراز قد، چوڑے شانوں، سیاہ چمکیلے بالوں اور پھول برساتی مسکراہٹ کو میں ابھی تک نہیں بھول پایا ہوں۔ بلاشبہ وہ ملکہ حسن تھی۔ کئی لڑکے اس کے طلب گار تھے مگر وہ کسی کو کم ہی لفٹ کراتی تھی۔ نہایت ہی قیمتی گاڑی میں وہ کالج آتی اور جاتی تھی۔ میں نے کبھی بھی اس کے بارے میں

سنجیدگی سے نہ سوچا تھا۔ اس کا بلاخیز حسن اور امارت مجھے مرعوب نہ کر سکتے تھے۔ مگر وہ مجھے چاہتی تھی مجھے اس کی خبر نہ تھی۔ کیونکہ میں اس کو کبھی اپنے نزدیک ہی نہ آنے دیتا تھا اور نہ ہی خود اس کے قریب جانے کی کوشش کرتا تھا۔ ان دنوں میں تھرڈ ایئر میں پڑھ رہا تھا۔ کہ اس نے اپنی ایک سہیلی کے ذریعے مجھے ہوسٹل میں ایک خط بھیجا...... اس نے لکھا تھا:۔

''ناصر! ...... میں ایک خوش نصیب لڑکی ہوں جسے زندگی کی ہر نعمت میسر ہے۔ کسی بھی چیز کی کمی نہیں ہے میں لاکھوں کروڑوں کی جائیداد اور بزنس اور کوٹھیوں کی مالک ہوں۔ اسی لئے کئی میری محبت کے طلب گار ہیں۔ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ مگر میں جانتی ہوں انہیں مجھ سے نہیں میری دولت اور جائیداد سے محبت ہے۔ اسی لئے میں ان کو پسند نہیں کرتی ہوں۔ میں نے تمہیں سارے زمانے سے مختلف پایا ہے۔ تم ایک باکردار مہذب شخص ہونے کے ساتھ مردانہ وجاہت اور خوبصورتی کا نمونہ بھی ہو۔ میں تمہیں چاہنے لگی ہوں...... میں تمہیں اپنا ہم سفر بنانا چاہتی ہوں۔ آج تک میں نے جس چیز کی بھی تمنا کی ہے مجھے ضرور ملی ہے۔ میں ہارنا نہیں جانتی۔ میں صرف جیتنا، حاصل کرنا اور چھیننا جانتی ہوں۔ میں نے ضد کر کے بھی کئی چیزیں حاصل کی ہیں...... مگر محبت زبردستی نہیں کی جا سکتی۔ اس پر کسی کا زور نہیں چلتا۔ مگر پھر بھی میں تمہاری محبت جیتنا چاہتی ہوں۔ تم میرے بن جاؤ۔ تو ہماری زندگی سدا بہار ہو جائے گی۔ اگر تم نے میری خواہش پوری نہ کی تو میں ضد نہیں کروں گی بلکہ اسے مقدر کا لکھا جان کر قبول کر لوں گی۔''

عذرا کا محبت نامہ پڑھ مجھے غصہ بھی آیا اور ہنسی بھی۔ اس نے اگلے روز خط کا جواب مانگا تھا...... میں نے اسے خط نہ لکھا اور اگلے روز اس کی سہیلی کو جا لیا...... میں نے اسے کہا کہ عذرا کو کہہ دینا کہ ناصر کہتا ہے...... کہ ''یہ کالج ہے ...... عشق و محبت کا سپاٹ نہیں...... ہم یہاں پڑھنے آئے ہیں عشق کرنے نہیں...... خبردار آئندہ میری زندگی اور راہ میں آنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ میں تمہارا محبت نامہ کالج کے نوٹس بورڈ پر چسپاں کر دوں گا۔ مجھے تم سے نفرت تو ہو سکتی ہے مگر محبت نہیں''۔

اس کے بعد ایک روز عذرا کالج آئی تھی پھر وہ کالج نہیں آئی۔ اس نے پڑھائی چھوڑ دی تھی صرف اس وجہ سے کہ میں نے اس کی چاہت کو ٹھکرا کر یہ احساس دلایا تھا کہ انسان کی ہر خواہش پوری نہیں ہوتی اور نہ ہی دولت سے ہر چیز خریدی جا سکتی ہے'' وقتی طور پر مجھے عذرا کے کالج چھوڑنے کا دکھ ہوا مگر آہستہ آہستہ میں اسے بھول گیا......

☆☆☆☆☆

بی۔ ایس۔ سی کے فائنل میں میں نے فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن حاصل کی۔ جب کہ امتیاز خان فیل ہو گیا۔ جس وجہ سے اس کا پڑھائی سے بھی جی اچاٹ ہو گیا۔ اس نے پڑھائی چھوڑ دی اور واپس اپنے گاؤں چلا گیا۔ میں نے ایم۔ ایس۔ سی کرنے کے لئے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ کچھ عرصہ تو امتیاز خان سے میری خط و کتابت رہی۔ ایک دو بار ہماری ملاقات بھی ہوئی۔ ہم نے مل کر اکٹھے فلم بھی دیکھی، اور گزری یادوں کو بھی دہرایا۔ پھر آہستہ آہستہ میرا اور امتیاز خان کا رابطہ بھی ختم ہو گیا۔ میں نے ایم۔ ایس۔ سی کر لی۔

ابا جان کی یہی خواہش تھی کہ میں

سی۔ایس۔ایس کا امتحان پاس کرلوں مگر میں ابھی مزید آگے پڑھنا چاہتا تھا۔ جتنا عرصہ میں کالج میں رہا۔ میں گاؤں کم ہی جاتا تھا۔ جاتا بھی تو اس وقت جب مجھے رقم کی ضرورت ہوتی تھی۔ گاؤں کا ماحول اور خاص کر اپنی اونچی فصیلوں والی حویلی کا گھٹا گھٹا ماحول مجھے پسند نہ تھا۔ میں اب اس ماحول سے فرار چاہتا تھا۔ شہری زندگی مجھے راس آگئی تھی۔ میری خواہش تھی کہ میں اپنی زندگی گاؤں کی بجائے شہر میں گزاروں۔ نہ جانے کیوں میں گاؤں کا رخ ہی نہ کرنا چاہتا تھا۔ اسی لئے میں نے مزید تعلیم حاصل کرنے کی خاطر دیار غیر جانے کا پروگرام بنالیا۔

جب میں نے اپنی خواہش کا اظہار ابا جان سے کیا تو انہوں نے تھوڑی سی پس وپیش کے بعد مجھے اجازت دے دی۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد مجھے آکسفورڈ میں داخلہ مل گیا اور میں انگلینڈ چلا آیا...... انگلینڈ کا ماحول اپنے وطن سے یکسر مختلف تھا۔ ایسی آزادی میں نے پہلی بار دیکھی تھی...... یہاں میری دوستی فیصل بن عبداللہ سے ہوگئی۔ فیصل متحدہ امارات کی ایک امارت شارجہ کے ایک نہایت ہی امیر ترین شیخ عبداللہ بن جاسم کا بیٹا تھا۔ فیصل کے پاس بے حساب دولت تھی۔ جسے وہ نہایت ہی بے دردی سے استعمال کرتا تھا...... بھولی لڑکیاں اس کی کمزوری تھیں...... وہ سچ ہی کہا کرتا تھا کہ وہ یورپ میں تعلیم حاصل کرنے نہیں بلکہ عیاشی کرنے آیا ہے۔ مجھے اس کی یہ عادات پسند نہ تھیں۔ مگر میں مجبور تھا۔ اسے کچھ بھی نہ کہہ سکتا تھا اور نہ ہی منع کرسکتا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ میری بات ہی نہ مانتا تھا۔ دوسری اس کی اور میری دوستی بھی ختم ہو جاتی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو چھوڑ بھی نہ سکتے تھے۔ کیونکہ ہماری دوستی نہایت ہی گہری ہوگئی تھی۔ لڑکیوں اور شراب کے معاملے میں میں نے فیصل کو اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ مگر میں ان دونوں چیزوں سے کوسوں دور تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں لڑکیوں اور شراب وشباب کے معاملے میں اس کا ہمنوا وہم پیالہ بن جاؤں۔ مگر میں نے اسے کہہ دیا تھا کہ اگر اس نے مجھے زیادہ مجبور کیا۔ تو ہماری دوستی ختم ہو جائے گی۔ اور فیصل کبھی بھی مجھ سے ہاتھ نہیں دھونا چاہتا تھا۔ نہ جانے کیوں وہ مجھ سے اتنی محبت کرتا تھا۔ مجھے بھی اس کی دوستی پر ناز تھا۔ شاید اس لئے کہ ہم دونوں مختلف ممالک سے تعلق رکھتے تھے مگر مسلمان تھے...... ہم ایک دوسرے کے دکھ درد کے ساتھی تھے...... فیصل دوستی نبھانا جانتا تھا...... یہی وجہ تھی کہ جب میں نے اپنی مرضی کی تعلیم مکمل کر لی۔ تو فیصل نے واپس پاکستان نہ آنے دیا۔ وہ مجھے زبردستی اپنے ساتھ شارجہ لے گیا...... وہاں ان کی تیل کی ایک بہت بڑی کمپنی تھی۔ جو سمندر سے تیل نکالنے کے لئے کام کر رہی تھی۔ فیصل نے اپنے گھر والوں سے پہلے ہی بذریعہ خطوط میرا تعارف کرا رکھا تھا۔ اس کے تمام اہل خانہ مجھ سے نہایت ہی محبت سے پیش آئے...... انہوں نے مجھے اپنے گھر کا ہی فرد سمجھا تھا۔ فیصل بھی والدین کا اکلوتا تھا۔ اس کی ایک بہن تھی سلمٰی...... بہت ہی خوبصورت اور ذہین۔ مجھے وہ بہت ہی اچھی لگی۔ وہ واقعی عرب کے روایتی حسن کی تصویر تھی۔ اس کے چہرے پر معصومیت تھی وہ عموماً سفید لباس پہنتی تھی جس میں وہ آسمان سے اُتری ہوئی حور لگتی تھی۔ اس کی سادگی نے مجھے بے حد متاثر کیا تھا۔ میں فیصل کے تمام اہل خانہ کا بے حد احترام کرتا تھا......

فیصل نے اپنے باپ سے بات کر کے مجھے اپنی کمپنی میں بہت بڑا عہدہ دے دیا۔ میری تنخواہ پاکستانی چالیس ہزار روپے مقرر کر دی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے رہنے کے لئے خوبصورت اور آراستہ بنگلہ بھی دے دیا۔ میں نے ابا سے فیصل اور اس کے خاندان اور ساتھ ہی شارجہ میں ملازمت کرنے کا ذکر کیا تو وہ بہت ہی ناراض ہوئے۔ انہوں نے مجھے لکھا کہ ہمارے خاندان کے کسی فرد نے دیارِ غیر جا کر غیروں کی نوکری نہیں کی۔ اگر تم نے ملازمت ہی کرنی تھی تو پاکستان آجاتے میں تمہیں کمشنر وغیرہ لگوا دیتا۔

میں نے ابا جان کو خط لکھ کر تسلی دی کہ میں نے یہ ملازمت وقتی طور پر اور فیصل کی دوستی کی خاطر کی ہے میں تھوڑا ہی عرصہ یہ ملازمت کروں گا اور پھر پاکستان آجاؤں گا۔ پھر جو کچھ آپ کہیں گے وہی کروں گا۔

ابا جان مطمئن ہو گئے یوں میں بھی پر سکون ہو گیا۔ ابا جان نے خط وکتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ انہیں میں نے ہر لحاظ سے تسلی دے رکھی تھی کہ میں ان کی مرضی کے خلاف کوئی بھی قدم نہ اُٹھاؤں گا۔

فیصل کے گھر میں مجھے اس کے گھر کے فرد کی سی حیثیت حاصل تھی۔ دولت کی پہلے بھی میرے پاس کمی نہ تھی مگر اب تو میری پانچوں انگلیاں گھی میں تھیں۔ میرا ذاتی خرچ تو نہایت ہی کم تھا۔ ادھر ابا جان کو بھی میری تنخواہ کی ضرورت نہ تھی لہٰذا بچت ہی بچت تھی۔ بہت ہی پُر سکون اور پُر لطف زندگی گزر رہی تھی۔ فیصل کے اہل خانہ کی نوازشیں مجھ پر جاری تھیں۔ مجھے کسی قسم کی پریشانی اور اُلجھن نہ تھی۔ ڈیوٹی ٹائم کے علاوہ جو وقت بچتا تھا۔ وہ میں اور فیصل لمبی ڈرائیونگ کر کے گزار دیتے تھے۔ یا پھر میں فلموں سے دل بہلا لیتا تھا، فلمیں دیکھنے کی عادت مجھے اب کچھ زیادہ ہی ہو گئی تھی۔ انگلینڈ میں بھی عموماً انگلش فلمیں دیکھ کر دل بہلایا کرتا تھا کیونکہ وہاں اردو فلمیں ان دنوں کم ہی ملتی تھیں۔ جب میں شارجہ آیا تو ویڈیو کی وبا عام ہو گئی تھی۔ اس لئے اب میں نے سینما جانا چھوڑ دیا تھا۔ گھر پر ہی وی۔ سی۔ آر پر فلمیں دیکھ لیا کرتا تھا...... شارجہ میں اردو فلمیں ملتی تھیں اس لئے میں یہاں بہت خوش تھا۔ وہاں ان دنوں زیادہ تر انڈین فلمیں آتی تھیں۔ پاکستانی فلمیں کم کم آتی تھیں۔ ان دنوں انڈین فلموں میں دلیپ کمار، ہیما مالنی وغیرہ کا طوطی بولتا تھا۔ اور یہی میرے پسندیدہ اداکار تھے۔ دن بہت ہی اچھے گزر رہے تھے۔ مزے ہی مزے تھے کوئی فکر اور پریشانی نہ تھی۔

ان ہی دنوں فیصل کی شادی دبئی کے شیخ قاسم کی بیٹی سے ہو گئی۔ شیخ قاسم کا شمار دبئی کی امیر ترین شخصیات میں ہوتا تھا۔ دبئی میں اس کے دو سینما ہال بھی تھے۔ میں نے فیصل کی شادی پر خوب خوشی منائی اور جی بھر کر دولت لٹائی جس نے ہماری دوستی کا رنگ اور بھی پختہ کر دیا۔ اس موقع پر بڑے بڑے شیوخ سے میرا تعارف بھی ہو گیا۔ ایک سال کے عرصہ میں...... میں نے عربی زبان پر کسی حد تک عبور حاصل کر لیا۔ اتنا کہ میں دوسروں کی بات سمجھنے لگا۔ اور اپنے مطلب کی بات کہنے کے بھی قابل ہو گیا۔

میں نے یہ اندازہ لگا لیا کہ فیصل کے والدین کی یہ خواہش ہے کہ میں ان کی بیٹی سلمٰی سے شادی کر لوں۔ انہوں نے کھل کر بات تو نہ کی تھی۔ مگر اشاروں کنایوں میں...... میں جان گیا تھا۔ مگر میں

اس معاملہ میں سنجیدہ نہیں تھا۔ اس لئے میں نے کبھی بھی ان کو اس مسئلہ پر بات کرنے کا موقع ہی نہ دیا اسی لئے میں ان کے سامنے سلمٰی کو بہن کہہ کر مخاطب کرتا تھا تاکہ وہ جان جائیں کہ میں سلمٰی سے شادی نہیں کروں گا۔ میں نے فیصل پر بھی واضح کر دیا تھا کہ میں شادی اپنے باپ کی مرضی اور پسند سے کروں گا۔ میں نے اسے اپنے خاندان کی روایات اور اصولوں کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا مگر پھر بھی وہ مجھ سے آس لگائے بیٹھا تھا۔ ایک جوان بہن کا بھائی ہونے کی حیثیت سے وہ مجھ سے کھل کر بات نہ کر سکتا تھا۔ میں اس کی اس مجبوری سے فائدہ اُٹھا رہا تھا۔ ان لوگوں کی نوازشیں اور عنایتیں بڑھتی ہی جا رہی تھیں۔ ایک سال بعد میری تنخواہ میں بھی اضافہ کر دیا گیا۔ میں ان نوازشوں کے لئے ان سب کا ممنون تھا۔

☆☆☆☆☆

محبت آناً فاناً ہی دل میں گھر کر لیا کرتی ہے...... یہ کی نہیں جاتی بلکہ ہو جاتی ہے۔ محبت رنگ، مذہب اور ذات پات نہیں دیکھتی۔ کوئی چپکے سے آ کر من میں بسیرا کر لیتا ہے۔ ایسی محبت کے قمقمے دل میں صرف ایک بار ہی جلتے ہیں دل کی اندھیری گلیوں میں صرف ایک ہی بار اُجالا ہوتا ہے۔ دل لمحوں میں اسیر ہو جاتا ہے۔ دل میں جلتے چراغ لو دینے لگتے ہیں۔ اندر گھنٹیاں سی بجنے لگتی ہیں دل میں یہاں سے وہاں تک چراغ جل اُٹھتے ہیں اور ایسا صرف ایک بار ساری زندگی میں ایک ہی بار ہوتا ہے......

ان دنوں پاکستانی فلمیں سینماؤں پر لگنے لگی تھیں۔ اور ویڈیو کیسٹ بھی مارکیٹ میں آ گئے تھے۔ میں ایک دن انڈین فلم اور ایک دن پاکستانی فلم دیکھتا تھا۔ اس روز بھی میں پاکستانی فلم ہی لایا تھا۔ رات کو میں نے وہ فلم دیکھی۔ وعدوں اور پیار بھری وہ فلم ایک سال قبل ہی ریلیز ہوئی تھی۔ اس میں ایک نئی ہیروئن متعارف کرائی گئی تھی...... فریال کی وہ پہلی فلم تھی...... وہ فلم تو نہ جانے کیسی تھی۔ مجھے کچھ اور یاد ہی نہ رہا...... یاد رہی تو صرف فریال...... یوں لگا کہ جیسے ہی برسوں سے اس کی تلاش میں تھا۔ وہ میرے لئے اور میں اس کے لئے بنایا گیا ہوں۔ پہلی ہی نظر میں میری آنکھوں کے راستے دل میں اُتر گئی...... اس فلم کے ایک منظر میں اسے دلہن کے روپ میں دیکھ کر میں سانس لینا ہی بھول گیا...... باقی مناظر میں بھی وہ میرے دل پر بجلیاں گراتی رہی مگر دلہن کا روپ اور وہ بھی مشرق کی دلہن کا قیامت ڈھا رہا تھا۔ اس کے جسم پر سونے چاندی کا زیوار لدا ہوا تھا۔ ناک میں نتھلی اور ماتھے پر ٹیکہ اور جھومر۔ کانوں میں بالیاں اور اس کے اوپر بجلیاں۔ گلے میں گلو بند چمپا کلی اور نولڑی کا موتیوں سے آویزاں ہار۔ بانہوں میں چاندی کے پری بند۔ کڑے چوڑیاں اور سونے کی انگوٹھیاں۔ پاؤں میں تودے اور پاؤں کی انگلیوں میں بچھوے۔ پاجامے میں چاندی کے موتی اور جھالر کمر میں پٹکا جس میں سنہرے موتیوں سے پھول پتی بنے ہوئے تھے۔ جسم کے اوپر والے حصے پر پیشواز اور جو چندری سے چن کر بنایا گیا تھا۔ وہ مجسم بقائے نور لگ رہی تھی۔ اس کی کالی اور گھنی پلکوں کے عین نیچے افشاں سے مینا کاری کی گئی تھی۔ گلابی ہاتھوں میں مہندی سے آگ دہکائی گئی تھی اور ہونٹ ایسے لگ رہے تھے جیسے وہ میری چاہت کا خون پیتی رہی ہو...... فریال کا وہ روپ میرے دل و دماغ میں نقش ہو گیا...... فلم کا وہ

منظر میں نے کئی بار دیکھا۔ مگر پھر بھی من کی پیاس نہ بجھی۔ تمام رات میں نے فریال کے سپنے دیکھتے ہوئے گزار دی۔ وہ میرے دل و دماغ میں چھا گئی۔ اگلے روز میں نے شارجہ اور دبئی میں تمام ویڈیو دکانیں چھان ماریں اور وہاں سے فریال کی جتنی بھی فلمیں ملیں خرید کر لے آیا۔ ابھی تک اس کی صرف تین فلمیں ہی ریلیز ہوئی تھیں۔ میں نے فریال کی فلموں کے علاوہ دیگر فلمیں دیکھنی ہی چھوڑ دیں۔ میں روز ہی اس کی وہ تینوں فلمیں بار بار دیکھتا۔ مگر پھر بھی من کی پیاس نہ بجھتی۔ ہر فلم میں اس کا کردار مختلف تھا۔ اس کا سراپا ایک نازل خیال شاعر کے تصور کی مانند تھا...... گوری رنگت شربتی مسکراتی ہوئی چمکدار آنکھیں سرو جیسا قد۔ دلکش اور دل آویز نقوش اور اس کے ہونٹوں کی تراش خراش ایسی تھی کہ میں اسے دیکھتا ہی رہ جاتا تھا۔ بلاشبہ رعنائی حسن اس پر ختم تھی...... پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ فریال نے میرا دل کا چین اور راتوں کی نیندیں لوٹ لیں۔ اسے دل و دماغ سے نکالنا میرے بس میں نہ رہا۔ میں سچ مچ اس کا دیوانہ ہو گیا۔ وہ ہر پل ہر ساعت میرے ساتھ میرے قریب اور میری سانسوں کے زیرو بم میں رہنے لگی...... میں اسی کی محبت میں اتنا دور نکل گیا کہ میں خوابوں اور خیالوں میں اسے چھوتا اس سے باتیں کرتا...... فریال آندھی کی طرح میری زندگی میں داخل ہو گئی اور میرے دل و دماغ اور ہوش و حواس پر چھا گئی۔ دن بدن اس کی چاہت کے روشن ستارے کی روشنی میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ میں اس کی محبت اور خوبصورتی کے نشہ میں مدہوش رہنے لگا۔ اور ہر پل اس خمار میں اضافہ ہی ہونے لگا۔ میں اپنی حیثیت، خاندانی وقار اور منصب سب کچھ بھول گیا۔ یاد رہی تو صرف فریال......

اب میں اس کی فلموں کا منتظر رہنے لگا۔ میں پاکستان کے کئی فلمی رسالوں کا سالانہ خریدار بن گیا۔ ان میگزین کے ذریعے مجھے فریال کی آنیوالی فلموں کا پتہ چل جاتا تھا۔ ساتھ ہی اس کی تصویریں بھی دیکھنے کو مل جاتی تھیں...... میری دیوانگی کا یہ عالم ہو گیا۔ کہ مجھے جہاں کہیں بھی فریال کی تصویر نظر آتی۔ میں وہ تصویر حاصل کر کے ہی دم لیتا۔ میرے البم میں فریال کی سینکڑوں تصویریں جمع ہو گئیں...... میں نے فلمی رسالوں کے ایڈیٹر حضرات کو کئی خط لکھے کہ مجھے فریال کا ایڈریس یا فون نمبر دے دیں۔ مگر کسی نے بھی میرے خط کا جواب نہ دیا۔ میں نے لاہور کے فلمی سٹوڈیوز کی معرفت بھی کئی خط فریال کے نام لکھے کسی کا بھی جواب نہ ملا۔ میں جلد از جلد فریال سے رابطہ قائم کر کے اسے اپنا حال دل سنانا چاہتا تھا۔ مگر کوئی صورت ہی نہ بن رہی تھی۔ میں نے کئی بار لاہور کے ٹیلی فون ایکسچینج میں بھی فون کیا اور آپریٹر سے درخواست کی کہ مجھے فریال کا فون نمبر دے دے۔ مگر اس نے مجھے کوئی دیوانہ سمجھ کر ٹال دیا...... جوں جوں دن گزرنے لگے میری بے تابی اور بے چینی بڑھنے لگی تھی۔ میں نے اپنی کئی مصروفیات ترک کر دی تھیں۔ فیصل بھی میری اس تبدیلی پر حیران تھا۔ اس نے کئی بار میرے بے چینی کی وجہ پوچھی مگر میں نے اسے ٹال دیا...... میں فی الحال اسے اپنا رازدان نہ بنانا چاہتا تھا۔ فریال نے جو آگ میرے اندر لگائی تھی میں اس آگ میں اکیلا ہی جلنا چاہتا تھا۔ ادھر فریال کی ہر فلم کامیابی سے ہم کنار ہونے لگی۔ اس نے اردو فلموں کو خیر باد کہہ دیا اور وہ پنجابی فلموں کے لئے مخصوص ہو کر رہ گئی۔

سلطان راہی ، مصطفیٰ قریشی اور یوسف خان کے ساتھ اس کی جوڑی خوب بجتی تھی۔ جلد ہی فریال نے کامیابیاں حاصل کر لیں۔ پنجابی فلموں میں اس کا نام ہی فلم کی کامیابی کی ضمانت بن گیا۔ اس نے ہر سو دھوم مچا دی۔ اسکے چاہنے والے لاکھوں تک جا پہنچے جو اسے بطور اداکارہ پسند کرتے تھے مگر میری اور شائقین کی پسند میں زمین آسمان کا فرق تھا میں اس سے محبت کرتا تھا وہ محبت جو اندھی ہوتی ہے جس کا کوئی مذہب اور کوئی ملک نہیں ہوتا یہ دنیا کے ہر خطے ور ہر کونے میں جنم لیتی ہے۔

☆☆☆☆☆

امتیاز خان کا نام بطور ہدایت کار دیکھ کر میں چونک گیا تھا۔ مجھے سو فی صد یقین ہو گیا کہ یہ میرا اضی کا دوست کلاس فیلو ہی ہوگا۔ مگر پھر بھی جب تک میں اس سے مل نہ لیتا میرا تجسس دُور نہ ہو سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے پاکستان جانے کا پروگرام بنا لیا۔ یہ سوچ کر کہ اگر امتیاز علی خان میرا دوست نکلا تو مجھے فریال تک پہنچنے میں آسانی ہو جائے گی۔

میں نے ایک بیش قیمت ہیروں کا سیٹ فریال کو تحفہ دینے کے لئے خریدا اور پاکستان روانہ ہو گیا۔ ابا جان میری آمد پر بہت ہی خوش ہوئے۔ ان کا اصرار تھا کہ میں اب واپس نہ جاؤں۔ وہ میری شادی کی بات بھی چھیڑنا چاہتے تھے مگر میں نے امی کی سفارش کرا کے پانچ سال کی مہلت حاصل کر لی۔ کہ میں پانچ سال بعد ہمیشہ کے لئے پاکستان آ جاؤں گا اور پھر ان کی مرضی کے مطابق شادی کر لوں گا۔ ابا جان بڑی مشکل سے رضا مند ہوئے۔ تو میں نے سکھ کا سانس لیا۔ مگر فریال کی وجہ سے کسی پل چین نہ تھا۔ میں جلد از جلد اس کے درشن کرنا چاہتا تھا۔ اسے اپنا دل چیر کر دکھانا چاہتا تھا۔ اسی لئے میں گھر میں بھی کھویا کھویا رہنے لگا۔ میری اس حالت کو گھر والوں نے بھی محسوس کیا۔ اور مجھ سے پوچھا بھی۔ مگر میں نے اسے ان کا وہم قرار دیا۔

ایک ہفتہ بمشکل گاؤں میں گزارنے کے بعد میں اپنی گاڑی میں لاہور روانہ ہو گیا...... رائل پارک میں چند فلمی دفتروں سے معلوم کرنے کے بعد یہ یقین ہو گیا کہ امتیاز علی خان فلم انڈسٹری کا منجھا ہوا ہدایت کار بن چکا ہے اور یہ وہی امتیاز ہے جو میرا دوست ہے اور روم میٹ تھا۔ مزید معلومات ملیں کہ وہ ان دنوں کسی فلم کی شوٹنگ کے سلسلہ میں سوات گیا ہوا ہے...... میں نے دیر نہ کی اور سوات جا پہنچا...... برسوں بعد ہم جب ایک دوسرے کے سامنے آئے تو بھی ہم نے ایک دوسرے کو پہچاننے میں دیر نہ کی...... ڈھیروں گلے شکوے ایک دوسرے سے ہوئے پرانی یادیں تازہ کیں...... امتیاز نے بتایا کہ وہ اداکار تو نہ بن سکا۔ مگر ایک کامیاب ہدایت کار ضرور بن گیا ہے اور اس کے کریڈٹ پر چند اچھی اور کامیاب فلمیں ہیں لوگ اس کی عزت کرتے ہیں۔ مالی لحاظ سے بھی کافی مضبوط ہو چکا ہے۔ پھر میں نے کالج کے زمانے سے لے کر اب تک تمام حالات اسے بتاتے ہوئے...... جب پاکستان آنے اور اس سے ملنے کی وجہ بتائی تو وہ چونک اٹھا اور کہنے لگا......

”ناصر!...... تم تو لڑکیوں سے دُور بھاگا کرتے تھے، تم تو کہا کرتے تھے میرا کوئی آئیڈیل اور کوئی پسند نہیں ہے۔ اسی لئے تم نے عذرا جیسی امیر اور حسین لڑکی کو ٹھکرا دیا تھا۔ یورپ میں رہ کر بھی تم اس محبت کے بکھیڑے میں نہیں پڑے اور اب کفر توڑا

بھی تو کس کی خاطر...... ایک ایسی اداکارہ کی خاطر......جس کا تعلق اس بازار سے تھا۔ انسان کی حقیقت تو نہیں بدل سکتی۔وہ واقعی ایک کامیاب اور مہنگی اداکارہ ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک ایسی عورت بھی ہے جو اپنی ادائیں بیچتی رہی ہے۔نجانے اب بھی اس کے کتنے چاہنے والے ہوں گے اور وہ کتنوں کے جی بہلاتی ہو گی...... ناصر! اب بھی وقت ہے سنبھل جاؤ اور واپس لوٹ جاؤ۔ کیونکہ اس بازار سے تعلق رکھنے والی کوئی بھی اداکارہ کوئی بھی لڑکی باوفا نہیں ہو سکتی۔ ان کو صرف دولت سے غرض ہوتی ہے ۔ جس کی خاطر یہ اپنا جسم بیچ ڈالتی ہیں...... مجھے افسوس ہو رہا ہے۔تم جیسے خاندانی شخص پر...... کہ تم نے ایک ایسی عورت کو من میں بسایا ہے جس کا دین اور ایمان صرف پیسہ ہے ۔ اس لئے بہتری اسی میں ہے کہ فریال کو بھول جاؤ۔ ورنہ نہ گھر کے رہو گے اور نہ گھاٹ کے۔''

امتیاز بہت ہی جذباتی انداز میں مجھے سمجھانے لگا تھا۔ مگر میں نے اس کی ہر دلیل رد کر ڈالی اور کہا''امتیاز علی خان! تم جو مرضی چاہے کہہ لو۔مگر میرا ایک ہی فیصلہ ہے کہ میں فریال کا ہوں اور فریال میری ہے ...... وہ جو کچھ بھی ہے جیسی بھی ہے مجھے اچھی لگتی ہے۔ دولت ہر چیز کا حل نہیں ہوتی۔ خلوص اور پیار دولت سے بھی افضل ہوتے ہیں۔تم اسے میری نظروں سے دیکھو تو سہی تو وہ تمہیں دیوی لگے گی۔ وہ میرے لئے ایک مکمل شاہکار اور آئیڈیل چیز ہے وہ میری راہوں میں ایک روشن دیا ہے...... میری لازوال چاہت اسے پارس بنا دے گی میں اسے اس نگری سے نکال کر لے جاؤں گا۔ اور اسے وہ مقام دُوں گا کہ وہ خود بھی ماضی کو بھول جائے گی......فریال میری زندگی ہے...... اس لئے تمہیں مجھے اس تک لے جانے میں میری مدد کرنی ہو گی ورنہ میں یہ سمجھوں گا کہ تم دوستی کے قابل ہی نہیں ہو۔ میں دوستوں پر اعتبار کرنا چھوڑ دُوں گا۔''

امتیاز میری بے لگام محبت کے آگے بے بس ہو گیا۔اس نے دو دن قبل ہی شوٹنگ ختم کر ڈالی۔ میں بھی اس کے ہمراہ لاہور روانہ ہو گیا۔فریال نے ابھی تک امتیاز خان کی کسی فلم میں کام نہیں کیا تھا۔ پھر بھی وہ مجھے اس سے ملاقات کرانے کی غرض سے لے گیا۔ اس رات فریال ایک پنجابی فلم کا گانا فلم بند کرا رہی تھی۔ جب ہم شاہ نور سٹوڈیو میں اس فلم کے سیٹ پر پہنچے تو فریال کا بل کھاتا جسم فلور پر پارے کی مانند تھرک رہا تھا۔ میں اسے دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ وہ ایک چھلکتا ہوا جام لگ رہی تھی جس میں نشہ ہی نشہ تھا اس کی ہر ادا کمال تھی کہ اس نے مجھے بے چین کر ڈالا۔ وہ مجسم خواہش اور سراپا آرزو تھی ...... گانا فلم بند کرانے کے بعد وہ جب سیٹ سے باہر نکلی......تو امتیاز خان کو دیکھ کر اس کی طرف بڑھ آئی۔ ہیلو ہائے ہوئی تو امتیاز نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا......

''یہ میرے دوست ہیں ناصر بہت بڑے جاگیردار کے بیٹے...... یہ آپ کے بہت بڑے مداح بھی ہیں''

فریال نے نظریں اُٹھا کر میری طرف دیکھا......اور لبوں پر مسکراہٹ سجا کر میرا شکریہ ادا کیا تو میں نے فوراً ہی ڈائمنڈ کا قیمتی سیٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ میری طرف سے ایک پرستار کا خلوص سمجھ کر قبول کر لیں۔''

فریال نے سیٹ پکڑ لیا اور اسی وقت اسے کھول کر دیکھا تو اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ اس نے میری طرف محبت بھری نظروں سے دیکھا اور کہنے لگی۔ ''ناصر صاحب......اس کی کیا ضرورت تھی......میرے لئے یہ ہی کافی ہے کہ آپ میرے پرستار ہیں۔ اور پھر یہ تو بہت ہی قیمتی ہے۔''

''مگر آپ سے بڑھ کر قیمتی ہرگز نہیں ہے'' میں نے کہا......تو اس نے ایک بار پھر میرا شکریہ ادا کیا اور گاڑی کی طرف بڑھ گئی......

میں امتیاز کے ہمراہ اس کے گھر لوٹ آیا......میں فریال کے دیدار کے نشہ میں سرشار تھا۔ اسے قریب سے دیکھ کر میرے من میں ایک آگ سی لگ گئی۔ جیسی وہ فلموں میں نظر آتی تھی۔ وہ اس سے بھی بڑھ کر تھی۔ وہ پارہ بن کر میری نس نس میں سما گئی تھی...... مجھے اپنے آپ پر فخر ہو رہا تھا کہ جسے میں نے من کے سنگھاسن پر بٹھایا ہے۔ وہ لاکھوں میں ایک ہے۔ اس کا کوئی بدل کوئی مثال نہیں...... میں فریال کے خوابوں اور خیالوں میں گم تھا......کہ امتیاز خان نے تسلسل توڑ دیا وہ ایک بار مجھے سمجھانے لگا۔ کہ ایسی عورتیں بھروسے کے قابل نہیں ہوتیں اور ویسے بھی حسین اور خوبصورت لوگ بے وفا ہوتے ہیں۔ دھوکہ دینا ان کا شیوہ رہا ہے...... یہ محبت کی بازی صرف اپنی جیت کی خاطر کھیلتی ہیں یہ جنس مخالف کو شکست ہی دیتی ہیں کہ وہ ان کی بے وفائی کی آندھی کے جھکڑ میں اپنے حواس گم کر بیٹھتا ہے اور پھر پچھتاوے اس کا مقدر بن جاتے ہیں۔ مگر میں نے امتیاز کی ہر دلیل رد کر دی۔ اور اسے کہا کہ'' اگر وہ میری مدد نہیں کرنا چاہتا تو صاف بتا دے۔ میں واپس شارجہ چلا جاؤں گا۔ مگر میں فریال کو حاصل کر کے ہی رہوں گا کیونکہ ارادے مضبوط اور جذبے سچے ہوں تو منزل ضرور ملا کرتی ہے۔''

میری دھمکی کام کر گئی۔ امتیاز کہنے لگا۔

''ناصر! فی الحال تم واپس لوٹ جاؤ۔ میں تمہاری منزل آسان بنانے کی کوشش کروں گا۔ فریال نے ابھی تک میری کسی فلم میں کام نہیں کیا ہے۔ میں اسے اگلی فلم میں ہیروئن کاسٹ کروں گا تب ہی میں اس کے قریب رہ کر تمہاری مدد کر سکوں گا۔''

امتیاز خان کی تجویز بہتر تھی۔ فوراً ہی ایک خیال میرے من میں آ گیا۔ میں نے امتیاز کو مشورہ دیا کہ وہ ایک ایسی فلم بنائے۔ جس میں فریال ہیروئن ہو۔ اور اس کی شوٹنگ عرب امارات میں کی جائے۔ امتیاز میری رائے سے اتفاق کرنے لگا مگر ساتھ ہی کہنے لگا۔ کہ باہر کے ملک میں شوٹنگ کی جائے تو خرچ بڑھ جاتا ہے۔

امتیاز ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میں نے اسے تسلی دی کہ تم خرچ کی فکر نہ کرو۔ عرب امارات میں ہونے والا تمام خرچ میں برداشت کروں گا۔ تم فلمساز سے بات کرو۔ اور ایسی کہانی لکھواؤ جس کی فلم بندی عرب امارات میں لازمی کی جائے۔

امتیاز خان کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگا۔

''ناصر! تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یہ سب کچھ ہو جائے گا۔ لیکن اس سے بہتر ایک اور حل بھی ہو سکتا ہے تمہیں اور فریال کو نزدیک لانے میں مددگار ثابت ہوگا اور وہ یہ کہ تمہیں اس فلم میں ہیرو لے لوں۔ کیونکہ تم میں ہیرو بننے کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں۔ تم میں ایک خاص کشش پائی جاتی ہے۔ تم نہ صرف ایک کامیاب ہیرو بن جاؤ گے بلکہ فریال کو

بھی پرکھ لو گے۔"

میں نے امتیاز کی اس رائے سے اتفاق نہ کیا اور کہا "میں ایسا کوئی قدم نہ اُٹھاؤں گا۔ میرے ابا جان مجھے زندہ زمین میں گاڑ دیں گے۔"

"اپنے باپ سے اتنا ہی ڈرتے ہو تو ایسی راہ پر کیوں چل رہے ہو، یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ فریال کو کیسے قبول کریں گے؟" امتیاز نے طنزیہ انداز سے کہا۔

"وہ بعد کی بات ہے میں حالات کو سنبھال کر ہی ان کے سامنے جاؤں گا" میں نے امتیاز کو لاجواب کر ڈالا۔ اس نے میری مرضی کے مطابق فلم بنانے کا وعدہ کر لیا۔ ساتھ ہی اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ فریال عموماً دبئی جاتی رہتی ہے۔ یوں بھی تمہارا مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔

☆☆☆☆☆

کچھ دنوں بعد میں شارجہ لوٹ آیا۔ مگر لگتا تھا میں اپنی روح اور دل پاکستان میں فریال کے پاس ہی چھوڑ آیا ہوں۔ فون پر امتیاز سے میرا مسلسل رابطہ رہتا تھا...... چند ہی ماہ بعد امتیاز نے فریال کو اپنی اگلی فلم میں ہیروئن کاسٹ کر لیا۔ اور پھر اس کی فلم بندی کرنے کے لئے دبئی چلا آیا۔ فریال ابھی نہیں آئی تھی البتہ فلم کا ہیرو آ گیا تھا۔ امتیاز نے مجھے بتایا کہ میری فلم کا ہیرو بھی فریال کا طلب گار ہے اور دونوں میں کچھ بات بھی چل رہی ہے۔ اس لئے تم کوشش کرو کہ فریال کو اس ہیرو کے جال سے نکال لاؤ کیونکہ ہیرو صرف فلرٹ ہی کرنا جانتا تھا، اس سے قبل بھی وہ فلاں فلاں ہیروئن کو محبت کا جھانسہ دے کر لوٹ چکا ہے۔ پرسوں فریال آجائے گی۔ ہیرو کے ہمراہ اس کے چند ایک سین ہیں۔ ایک دو گانا فلمبند کرنا ہے اس کے بعد میں ہیرو کو واپس بھیج دوں گا اور فریال کو چند مزید شانس لینے کی خاطر روک لوں گا۔ اور پھر میں اسے تم سے ملانے کی کوشش کروں گا۔ تم گھر ہی رہو اور میرا انتظار کرو۔ تم لوکیشن پر مت آنا۔ میں خود ہی تم سے رابطہ کر لوں گا......" میں نے امتیاز خان کی ہر بات تسلیم کی۔

دو دن بعد فریال آ گئی۔ دو دن شوٹنگ کرنے کے بعد امتیاز خان نے فلم یونٹ کے زیادہ تر افراد کو واپس بھیج دیا۔ صرف فریال اور کیمرہ مین رہ گئے...... امتیاز کہنے لگا۔ اگر تم چاہو تو میں فریال کو تمہارے بنگلہ پر لے آؤں۔ تم اس کی دعوت کر ڈالو۔ اور اسے قیمتی تحفے بھی دو۔ یوں تم ایک دوسرے کے قریب آ جاؤ گے۔

میں نے امتیاز کی بات سے اتفاق کیا اور کہا کہ میں ایسا ضرور کروں گا مگر بعد میں...... فی الحال میں ایک ایسا قدم اٹھانا چاہتا ہوں کہ مجھے اظہار محبت کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑے بلکہ فریال خود ہی جان جائے کہ میں اس سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ میں نے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ایک پلان بنا لیا ہے۔

میں نے امتیاز خان کو بتایا کہ انڈین فلم "دھن دان" کے ایک منظر میں راجیش کھنہ...... رینا رائے سے محبت کرتا ہے۔ رینا رائے نے اس فلم میں بھی ایک فنکارہ کا کردار ادا کیا ہے۔ راجیش کھنہ اپنی محبت کے اظہار کے لئے اس کا ایک پروگرام کراتا ہے۔ اور ہال کی تمام ٹکٹیں خود خرید لیتا ہے جب رینا رائے ہال میں داخل ہوتی ہے تو ہال میں صرف راجیش کھنہ ہی بیٹھا ہوتا ہے۔ میں بھی ایسا ہی پروگرام کرنا چاہتا تھا۔ دبئی کے سب سے بڑے اور

مہنگے ہال 'حیات'' کا مالک شیخ قاسم بن صالح میرے دوست فیصل کا سسر ہے میں وہ ہال خرید لوں گا۔تم فریال کو منا کر لے آؤ اور اسے اس پروگرام کی اتنی رقم دو کہ وہ انکار نہ کر سکے......

امتیاز خان...... میرا ارادہ جان کر حیران رہ گیا۔ اور کہنے لگا ''لگتا ہے تمہارے پاس دولت بہت ہے''

''ہاں واقعی میرے پاس بے حساب دولت ہے فریال مجھے مل جائے تو میں یہ ساری دولت لٹا دوں گا۔''

امتیاز خان نے فریال کو منا لیا۔ کہ وہ ''حیات'' میں رقص کرے گی اور گانا بھی گائے گی...... میں نے اس شو کی پبلسٹی ہونے ہی نہ دی۔ یہ بات میرے امتیاز، فریال اور شیخ قاسم تک محدود تھی۔ میں نے شیخ قاسم کو ہال کا تمام کرایہ اور دیگر اخراجات ایڈوانس ادا کر دیئے تھے۔

پروگرام کے مطابق ...... جب فریال ہال میں داخل ہوئی تو اس ہال میں صرف مجھے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ کہنے لگی۔ ''ناصر صاحب! آپ اور یہاں اور اکیلے؟ اور تماشائی کہاں ہیں؟ میں اس کے قریب چلا گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور اسے بتایا کہ ...... '' اس ہال میں صرف میں ہی تماشائی ہوں۔ اس شو کے تمام ٹکٹ میں نے خرید لئے ہیں۔''

''مگر کیوں؟'' فریال نے سوال کر ڈالا......

''اس کیوں کا جواب میری زبان نہیں دے سکتی...... تم خود ہی جان لو۔''

''تو پھر پروگرام شروع کروں''

اس نے میرا جواب نظر انداز کرتے ہوئے اپنی جادو بھری آنکھوں میں مجھے قید کرتے ہوئے کہا......

''نہیں اب اس کی ضرورت نہیں ہے'' میں جا رہا ہوں...... آپ بھی جا سکتی ہیں۔ امید ہے کہ آپ کو اس شو کا معاوضہ ایڈوانس مل چکا ہوگا......'' یہ کہہ کر میں آگے بڑھا تو وہ بولی۔

''ناصر صاحب! میں سب کچھ جان گئی ہوں۔ کہ آپ صرف میرے پرستار ہی نہیں بلکہ اور بھی کچھ ہیں کسی کو چاہنے کا یہ انوکھا روپ میں نے پہلی بار دیکھا ہے...... آپ نے لمحوں میں مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے ایسا تو میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا کہ کوئی مجھ جیسی کو یوں چاہے گا۔ آپ کی چاہت کا انداز تو مجھے اسی روز ہو گیا تھا جب آپ نے مجھے ایک لاکھ کی مالیت کا ڈائمنڈ سیٹ دیا تھا۔ اور پھر بعد میں امتیاز خان نے بھی مجھے بتا دیا تھا کہ آپ میری محبت میں بہت دُور نکل گئے ہیں۔ آج آپ نے جو کچھ کیا یہ بھی مجھے پہلے ہی معلوم تھا۔ محبت اور چاہت کی اتنی شدت میں نے پہلی بار محسوس کی ہے۔ میں تمہاری چاہت سے بے خبر نہ تھی کیونکہ اس عالم میں آنکھیں بولتی ہیں زبان گفتگو کرتی ہے...... مگر ایک بات کہوں گی...... کہ ایک بار پھر سوچ لو ناصر...... کہ محبت تو طوفانی ہوتی ہے منہ زور اڑیل گھوڑے کی مانند ...... یہ دنیاوی رسم و رواج اور مصلحتوں کو نہیں سمجھتی یہ حواس گم کر دیتی ہے ہوش بھلا دیتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ بعد ہی تمہیں یا مجھے پچھتانا پڑے۔ کیونکہ تم بہت بڑے عزت دار باوقار خاندان سے تعلق رکھتے ہو۔ جہاں ہم جیسی ناچنے گانے اور دل بہلانے تو جا سکتی ہیں مگر وہاں کی عزت نہیں بن سکتیں...... ہم ایسی اینٹیں ہیں جو کسی جوہڑ میں تو لگ سکتی ہیں مگر کسی چوبارے یا حویلی میں نہیں''۔

''فریال! ......تم ایک بار صرف ایک بار میری

محبت کا اقرار کر کے دیکھو۔ پھر دیکھنا ناصر تمہارے لئے کیا کرتا ہے میری محبت سچی اور بے غرض ہے میری محبت اپنے اندر اتنی طاقت رکھتی ہے کہ بلا خیز آندھیوں اور تند طوفانوں کا رُخ موڑ دے گی...... میں نے صرف تمہیں چاہا ہے اس لئے کہ تم میرے من کو بھاتی ہو میری زندگی میں سینکڑوں لڑکیاں آنے کی کوشش کرتی رہی ہیں مگر میں نے کسی کی طرف آنکھ بھر کر بھی نہیں دیکھا مگر تم نے میری روح اور دل کو مسخر کر ڈالا ہے۔ تم بن میرا جیون ادھورا ہے اور ادھورا رہے گا۔ میں تمہیں ایسے روپ میں اپنی حویلی میں لے جاؤں گا کہ اس حویلی کا ہر فرد تمہیں احترام دے گا......تم جو کچھ بھی ہو جیسی بھی ہو مجھے پسند ہو۔ مجھے انکار یا اقرار میں جواب دو۔''

''میرا اقرار سُن کر کہیں خوشی سے پاگل نہ ہو جانا''......فریال یہ کہہ کر ہال سے باہر نکل گئی۔ کچھ ہی دیر بعد میں بھی اپنی گاڑی میں بیٹھ کر شارجہ روانہ ہو گیا۔

دو دن بعد میرے بنگلے پر فریال کی دعوت تھی امتیاز خان بھی اس کے ہمراہ آیا تھا۔ کھانے کے بعد امتیاز واپس لوٹ گیا۔ اور فریال میرے ہاں ہی ٹھہر گئی...... وہ دن اور رات میری زندگی کے یادگار اور قیمتی لمحے تھے۔ جی چاہتا تھا کہ فریال میرے سامنے بیٹھی رہے۔ اور میں اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہوں کہ یوں ہی عمر تمام ہو جائے ...... اس روز بھی وہ قیامت ڈھا رہی تھی میں کبھی آنکھیں بند کرتا اور کبھی کھول کر دل کی سکرین پر اس کی من موہنی صورت کو دیکھنے لگتا۔ وہ واقعی قدرت کا ایک نایاب شاہکار تھی۔ اس کا بدن گویا چاندنی کے طبق میں گوندھا ہو۔ اور سرخ شیشوں سے آفتابی شعاؤں نے اسے تراشا ہو یا پھر مہ و خورشید نے اپنا جوبن گھول کر نور کے سانچے میں ڈھالا ہو۔ ایسا حُسن میری نگاہوں سے ابھی تک نہیں گزرا تھا شاید اس لئے میرا من پنچھی بانورا بن گیا تھا اور چکور بن کر اس کے گرد رقصاں تھا۔ میں زیادہ دیر تک آنکھیں بند نہ رکھ سکتا تھا اس لئے اس کے سحر آفرین چہرے کی زیارت کے لئے نظریں اٹھا دیں...... وہ میرے سامنے میرے قریب بیٹھی تھی۔ اس کے سانسوں کی گرمی مجھے جھلسا رہی تھی۔ میں ایک ٹک نوخیز شعاؤں کا نکھار لئے ہوئے چہرے کو تک رہا تھا اور دل آویز گلابی ہالہ آنکھوں کے راستے دل میں اُترتا جا رہا تھا۔

اس کے پوچھنے پر میں نے اسے اپنی زندگی کا ایک ایک ورق دکھا دیا کہ میں کیسے اس پر مرمٹا ہوں۔ میری بے تابی اور دیوانہ پن فریال نے بھی محسوس کر لیا......تو میں اسے اپنے بیڈ روم میں لے آیا تاکہ اسے اپنا دل مزید چیر کر دکھا سکوں۔ اپنی محبت کی شدت سے آگاہ کر سکوں۔

میرے بیڈ روم میں چاروں طرف فریال کی خوبصورت اور رنگین تصاویر خوبصورت اور قیمتی سنہری فریموں میں آویزاں تھی۔ فریال نے جب چاروں طرف اپنی ہی تصویریں دیکھیں تو مبہوت رہ گئی۔ اس نے میری طرف ساغر بھری نظروں سے دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں کہنے لگی......''ناصر! تم مجھے اتنا چاہتے ہو میں اس کا تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں مستی بھر آئی۔ وہ آہستہ آہستہ میری طرف بڑھنے لگی اور میرے اتنے قریب آگئی کہ اس کی اور میری سانسیں مدغم ہو گئیں۔ وہ چاہتی تھی کہ میں اسے بانہوں میں بھر لوں مگر میں فوراً پیچھے ہٹ گیا۔

''نہیں فریال...... یوں نہیں......تم میری امانت ہو

...... میں تمہیں اس وقت تک ہاتھ نہیں لگاؤں گا جب تک تم حقیقت بن کر میری زندگی میں نہیں آجاتی"

میں نے فریال کو دوسرے اور علیحدہ کمرے میں سونے کے لئے بھیج دیا۔ اگلے دو دن بھی فریال نے وہاں ہی گزارے۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ اب وہ مزید فلمیں سائن نہیں کرے گی۔ مگر وہ اپنی تیس کے لگ بھگ زیر تکمیل فلمیں ضرور مکمل کرائے گی۔ اس کے بعد وہ ہمیشہ کے لئے میری ہو جائے گی۔ فریال نے بھی اپنے ماضی سے مجھے آگاہ کر دیا اور یہ تسلیم کیا کہ اس کا تعلق اس بازار سے ہے۔ جہاں جسموں کے سودے ہوتے ہیں۔

مجھے پھر بھی وہ قبول تھی۔ میں نے اس کا مطالبہ تسلیم کر لیا کہ وہ اپنی معاہدہ شدہ فلمیں مکمل کرلے مگر اس کے بعد وہ کسی فلم میں کام نہیں کرے گی۔ کچھ عرصہ وہ فلمی دنیا سے مکمل طور پر علیحدہ ہو کر گمنام ہو جائے گی تو پھر میں اسے اپنی حویلی میں نہایت عزت کے ساتھ لے کر جاؤں گا۔ اور اسے وہی حق دلاؤں گا جو میرے خاندان کی دیگر عورتوں کو حاصل ہے۔ میں اس کا ماضی بھول جاؤں گا اور کبھی بھول کر بھی گزرے وقت کو یاد نہ کروں گا......

پاکستان روانگی سے قبل میں نے فریال کو کہا کہ وہ دبئی کے صرافہ بازار میں جائے اور اپنے لئے جو کچھ بھی خریدنا چاہتی ہے۔ پسند کر کے واپس آجائے۔ کیونکہ اگر تمہیں اور مجھے کسی نے بازار میں یا کسی اور جگہ اکٹھے دیکھ لیا تو اسکینڈل بن جائے گا۔ یہ خبر میرے باپ تک بھی پہنچ جائے گی اس صورت میں ہمارا ملنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہو جائے گا۔

فریال نے میری اس تجویز سے اتفاق کیا...... وہ اکیلی ہی صرافہ بازار گئی اور اپنے لئے بہت کچھ پسند کیا۔ میں نے اس کی پسند کردہ تمام اشیاء خرید لیں اور اس کے حوالے کر دیں۔ ان اشیاء کی قیمت لاکھوں روپے بنتی تھی مگر میں نے رقم کی پرواہ نہ کی کیونکہ میرے پاس بے حساب رقم تھی جو میں فریال پر ہی خرچ کرنا چاہتا تھا۔ فریال نے مجھے ایئر پورٹ پر بھی نہ آنے دیا۔ خود میں بھی اسے الوداع کہنے کے لئے ایئر پورٹ پر نہ جانا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ میری اور فریال کی محبت کی کہانی ہم دونوں اور امتیاز خان تک ہی محدود رہے۔ اور کسی چوتھے فرد کے کانوں میں اس کی بھنک ہی نہ پڑے۔ میں نے فریال اور امتیاز خان دونوں کو بھی اس سلسلہ میں محتاط رہنے کی تاکید کی کہ یہ راز...... راز ہی رہنا چاہئے۔

لاہور پہنچ کر فریال نے خود ہی مجھے فون کیا کہ وہ خیریت سے لاہور پہنچ گئی ہے۔ پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ بعض اوقات فلم بندی کی وجہ سے فریال سے بات نہ ہو پاتی تو بے چین سا ہو جاتا۔ ایسا لگتا کہ جیسے میری کوئی قیمتی چیز کھو گئی ہے۔ یوں ہی کئی ماہ بیت گئے میں پاکستان جا کر فریال سے ملنا نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ اس طرح اسکینڈل بن جاتا۔ میری اور فریال کی محبت کا راز بھی فاش ہو جاتا۔ میں اب یہ بازی کسی صورت میں بھی ہارنا نہیں چاہتا تھا۔ الیکشن کی طرح میں بھی فتح اور جیت حاصل کرنے کا تہیہ کر چکا تھا۔

چونکہ میں تو پاکستان جاتا نہیں تھا۔ اس لئے فریال خود ہی وقت اور موقع نکال کر مجھے ملنے آجاتی۔ کبھی کسی ثقافتی طائفہ کے ہمراہ کبھی کسی فلم کی شوٹنگ اور کبھی خصوصی طور پر مجھ ملنے آجاتی۔ جب بھی آتی میں اس پر قیمتی تحفوں کی بارش کر دیتا۔ وہ جو بھی چیز پسند کرتی وہ جس چیز پر بھی ہاتھ رکھتی۔ خواہ

وہ پیرس سے ملتی ہو۔ خواہ لندن سے اور خواہ سوئٹزرلینڈ سے۔ میں قیمت کی پرواہ نہ کرتا اور اسے وہ چیز ضرور خرید کر دیتا۔ اس لئے کہ دولت کی میرے پاس کمی نہ تھی۔ میری تنخواہ ان دنوں اسی ہزار روپے ہو گئی تھی...... فریال بعض اوقات مجھ سے نقد رقم لے لیتی اور بعض دفعہ وہ چیز پسند کر کے آجاتی اور مجھے مکان کا ایڈریس بتا دیتی۔ تو میں فوراً ہی وہیں سے وہ چیز خرید لاتا۔ اگر فریال انکار بھی کرتی تو میں زبردستی اپنی مرضی کا گولڈ یا ڈائمنڈ سیٹ لے آتا۔

فریال عموماً یہ کہتی تھی کہ ''ناصر!...... میرے لئے اس زندگی کا سب سے بڑا تحفہ تم ہو۔ تم مجھے مل گئے ہو تو اب مجھے کسی چیز کی خواہش ہی نہیں رہی۔ کوئی تمنا اب من میں نہیں مچلتی۔ میری سانسوں میں۔ میری خون کی شریانوں۔ میرے دل و دماغ کے نہاں خانوں میں صرف تم ہی تم آباد ہو۔ تمہارا یونانی دیوتاؤں جیسا رنگ و روپ میرے دل میں بس گیا ہے جی چاہتا ہے کہ بس تمہیں ہی دیکھتی رہوں، بس مجھ تمہارا پیار مل گیا ہے مجھے اور کچھ نہیں چاہئے مگر میں پھر بھی اسے مالا مال کر کے ہی روانہ کرتا تھا۔ کیونکہ مجھے صرف اور صرف اس کی خوشنودی عزیز تھی۔ میں اس پر واضح کر دینا چاہتا تھا۔ کہ پوری دنیا میں مجھے صرف وہ ہی عزیز ہے میں اس پر مال و دولت ہی نہیں بلکہ جان تک قربان کر سکتا ہوں۔

☆☆☆☆☆

اس رات بھی فریال میرے پاس ہی ٹھہری ہوئی تھی ہم رات گیارہ بجے تک پیار و محبت کی باتیں کرتے رہے۔ مستقبل کے سپنے سجاتے رہے۔ ساتھ جینے اور مرنے کی قسمیں کھاتے رہے۔ میرے سر میں ہلکا سا درد تھا۔ اس لئے میں اپنے کمرہ میں چلا آیا۔ سر درد کی ایک گولی کھائی اور سو گیا...... ابھی کچھ ہی دیر گزری ہو گی کہ مجھے اپنے چہرے پر کسی کے لمس کا احساس ہوا...... میں نے آنکھیں کھولیں تو میرے سامنے فریال کھڑی تھی۔ ہلکے نیلے رنگ کی نائٹی میں اس اس کے جسم کا انگ انگ دعوت نظارہ دے رہا تھا۔ کمرہ میں اتنی روشنی تھی کہ فریال مجھے واضح طور پر نظر آرہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خمار تھا۔ زلفیں کھلی ہوئی تھیں......

''فریال ...... تم ہوش میں تو ہو...... میں تو تمہیں تمہارے کمرے میں سلا کر آیا تھا'' میں نے غصہ سے کہا۔

''ہاں ناصر میں ہوش میں نہیں ہوں۔''

اس نے یہ الفاظ کہہ کہ میری طرف بڑھنا چاہا تو میں مزید پیچھے ہٹ گیا اور کہا......

''فریال یہ کیا بدتمیزی ہے؟ میں مزید برداشت نہیں کر سکتا۔'' میں نے کہا...... مگر اس پر میری کسی بات کا اثر نہ ہوا...... اس نے مجھے بانہوں میں لینا چاہا۔ تو میرے صبر کی حد ختم ہو گئی۔ میرا ہاتھ اُٹھ گیا...... میں نے دو بھرپور اور زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر جڑ دیئے اور کہا......

''فریال واپس چلی جاؤ۔ ورنہ میں کچھ اور کر بیٹھوں گا۔ شادی سے قبل تمہارے جسم کو ہاتھ لگانا بھی میں جرم سمجھتا ہوں۔''

فریال فوراً میرے قدموں میں گر گئی اور کہنے لگی۔ ''ناصر جانی! مجھے معاف کر دو۔ میں صرف تمہیں آزمانا چاہتی تھی۔ تم میری آزمائش پر پورے اُترے ہو۔ واقعی تم خاندانی اور عظیم انسان ہو۔ ایسا انسان تو فرشتوں سے بھی بڑھ کر ہے...... تمہاری یہی خوبی مجھے مان اور فخر دیتی ہے کہ میرا محبوب ایک بلند کردار انسان ہے۔''

فریال نے میرا سارا غصہ کافور کر ڈالا۔ وہ اپنے کمرہ میں واپس چلی گئی تو میں نے سکون کا سانس لیا...... اگلے روز بھی وہ نادم نادم سی لگی مگر میں نے اس کے ساتھ رات والی بات کا تذکرہ نہ کیا۔ میں نے سب کچھ بھلا دیا اور یہی سمجھا کہ وہ مجھے جس آزمائش میں ڈالنا چاہتی تھی میں اس آزمائش میں سرخرو ہو گیا ہوں۔

☆☆☆☆☆

میری اور فریال کی محبت راز نہ رہی ۔ میرے دوست فیصل کو سب کچھ معلوم ہو گیا کہ آج کل میں کن چکروں میں الجھا ہوا ہوں۔ اس کے اصرار پر میں نے فریال سے محبت کی تمام داستان اسے سُنادی...... وہ فلموں کے حوالے سے فریال سے بخوبی واقف تھا۔

اس نے میری زبانی فریال کی محبت کی کہانی سُنی اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ تو اس کے چہرے پر اُداسی سی چھا گئی ۔ یوں لگا جیسے اس کے اندر چھن سے کوئی چیز ٹوٹ گئی ہو اس کی آنکھوں میں بھی نمی سی تیر گئی۔

میں فیصل کی پریشانی کا مطلب جان گیا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد فیصل کہنے لگا۔

''ناصر! میرے دوست میرے بھائی...... یہ فلمی اور شوبزنس کے لوگ باوفا نہیں ہوتے اس لئے بہتر یہی ہے کہ تم اب بھی لوٹ آؤ۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اپنی دولت اندھا دھند فریال پر لٹا رہے ہو۔ اگر دولت سے کسی کا دل جیتا جا سکتا ہے تو پھر اگر تمہیں مزید دولت درکار ہو تو مجھ سے لے لینا میرا بھی سب کچھ تمہارا ہی ہے دوست...... مگر میں تمہیں یوں برباد ہوتا نہیں دیکھ سکتا۔ فریال کو صرف تمہاری دولت سے غرض ہے۔ میں تمہارا اور اس کا ہم وطن اور ہم زبان نہ ہونے کے باوجود بھی اس کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں۔ اسی لئے میں تمہیں سمجھا رہا ہوں۔ ورنہ میرا اس میں ذاتی مفاد نہیں ہے۔''

''فیصل !......تم میری نظر سے فریال کو دیکھو تو تمہیں وہ حسن اور وفا کی دیوی لگے گی۔ وہ میری زندگی ہے۔ میں اس کے بن ادھورا ہوں۔ میں اس کے بغیر زندہ ہی نہیں رہ سکتا۔ وہ جو کچھ بھی ہے جیسی بھی ہے۔ میری چاہت ہے۔ اگر تمہیں زیادہ ہی اعتراض ہے تو میں تمہاری بخشی ہوئی ملازمت اور ملک ہی چھوڑ دوں گا۔''

میری دھمکی سن کر فیصل گھبرا گیا اور کہنے لگا۔

''ناصر! دوستوں کو یوں آزمایا نہیں کرتے۔ فریال اور اس کی محبت تمہیں مبارک ہو۔ اگر تمہیں فریال کو حاصل کرنے میں میری مدد درکار ہو۔ تو میں حاضر ہوں مگر تمہیں ناراض ہو کر یہاں سے نہ جانے دُوں گا۔ کیونکہ تم میرے دوست ہو۔ اور مجھے تمہاری دوستی عزیز ہے''۔

فیصل نے میری الجھن اور پریشانی دُور کر دی۔ تو ادھر ابا جان کا غصہ بھرا خط آ گیا۔ کہ تم ہم کو بھول گئے ہو...... جب تمہیں میں نے کالج میں داخل کرایا تھا۔ تو تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم میرا مان رکھو گے اور مجھے پریشان نہ کرو گے۔ مگر شارجہ میں رہ کر نہ جانے تم کس دنیا میں کھو گئے ہو کہ گھر والوں کو بھول گئے ہو تم نے گھر آنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ میں اور تمہاری ماں صرف تمہارے سر پر سہرا دیکھنے کے ہی منتظر ہیں ۔ ادھر الیکشن بھی نزدیک آ رہے ہیں اس موقع پر تمہاری موجودگی ضروری ہے۔

میں نے ابا جان کو تسلی بھرا خط لکھا اور یقین دلایا

کہ میں جلد ہی ہمیشہ کے لئے لوٹ آؤں گا۔ مگر میں پھر بھی پریشان ہی رہا کہ اب کیا کروں...... ادھر فریال کی فلمیں ختم ہونے کا نام نہ لے رہی تھیں۔ لگتا تھا کہ اس نے فلمیں سائن کرنی بند نہیں کیں...... میں اسے سلطان راہی جیسے اداکاروں کے ساتھ محبت کے مناظر کرتے دیکھتا تو میرا خون کھول اٹھتا۔ میں جب بھی اسے فون کرتا۔ تو اسے یہ ہی کہتا کہ جلد از جلد فلمی دنیا چھوڑ دے...... وہ ہر بار یہی کہتی بس چند فلمیں رہ گئی ہیں اس کے بعد میں سب کچھ چھوڑ کر تمہارے دامن میں سما جاؤں گی اور بقیہ تمام عمر تمہاری داسی بن کر گزار دوں گی...... اس کی محبت بھری اور میٹھی آواز اور باتیں سُن کر میں سب کچھ بھول جاتا۔

فریال اب کم ہی فون کرتی تھی۔ میں خود ہی اسے فون کیا کرتا تھا تا کہ اس کی رقم خرچ نہ ہو...... ایک بات فون کے سلسلہ میں کافی عرصہ سے محسوس کر رہا تھا...... کہ جب بھی فریال مجھ سے ملاقات کرنے اور میرے پاس ٹھہرنے کے بعد پاکستان کے لئے روانہ ہوتی تو مجھے ایئر پورٹ نہ جانے دیتی۔ میں نے کئی بار اصرار کیا کہ میں اسے ایئر پورٹ پر الوداع کہنے جاؤں گا...... تو وہ نہ مانتی کہتی...... کہ اس طرح کوئی ہمیں دیکھ لے گا اور ہماری چاہت کا راز فاش ہو جائے گا...... میں اس کی دلیل مان لیتا اور ایئر پورٹ نہ جاتا...... جہاز کی روانگی کے بارہ گھنٹوں کے بعد جب میں اس کی خیریت معلوم کرنے کے لئے لاہور اس کے گھر پر فون کرتا۔ تو فون ہی خراب ملتا۔ بعض اوقات دو تین دن یہی سلسلہ جاری رہتا۔ جب دو تین دن بعد فریال سے بات ہوتی تو وہ یہی بتاتی کہ فون خراب تھا...... میرے کہنے پر فریال نے ایک اور فون بھی لگا لیا۔ مگر اب تو کئی بار دونوں ہی خراب ملتے۔ کبھی گھنٹی بجتی رہتی اور کوئی فون نہ اٹھاتا...... اس کا جواب فریال یہ ہی دیتی کہ آتے ہی وہ آؤٹ ڈور شوٹنگ پر چلی گئی تھی...... وغیرہ وغیرہ...... اس کی میٹھی اور لچھے دار باتیں میرا سارا غصہ اور وہم دُور کر دیتیں۔ اس نے بتایا تھا کہ اب اس کی صرف پانچ فلمیں زیر تکمیل ہیں اور اب وہ مزید کوئی فلم سائن نہیں کر رہی۔ چھ ماہ میں اس کا کام مکمل ہو جائے گا اور پھر وہ ہمیشہ کے لئے میرے پاس آجائے گی۔ میرے لئے چھ ماہ چھ صدیاں بن گئے تھے۔ میرا انتظار طویل سے طویل تر ہوتا جا رہا تھا۔ دل کی بے تابی بڑھتی ہی جا رہی تھی...... میری حالت دیوانوں جیسی ہونے لگتی تھی...... ہر لمحہ ہر پل مجھے فریال ہی یاد آتی تھی۔

☆☆☆☆☆

اس روز بھی فریال میرے پاس دو دن ٹھہرنے کے بعد پاکستان جا رہی تھی۔ دو دن قبل میں نے اسے لاکھوں کی خریداری کروائی تھی۔ حسب معمول میں نے اسے اپنی کوٹھی ہی سے الوداع کہہ دیا...... رات کو میں نے لاہور فون کیا تو حسب معمول فون نہ ملا۔ اور فریال سے بات نہ ہو سکی۔

اگلے روز ایک کام کے سلسلہ میں مجھے دبئی جانا پڑ گیا۔ کام سے فارغ ہو کر میرا گزر دبئی کے صرافہ بازار والی سڑک سے ہوا...... تو میری نظروں نے ایک ایسا منظر دیکھا۔ جسے الفاظ میں میں بیان نہ کر سکوں گا...... میں نے دیکھا۔ کہ میری چاہت۔ میری محبت میری جان میری زندگی فریال...... دبئی کے امیر ترین شیخ کے ساتھ صرافہ بازار کے اندر داخل ہو رہی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کے گردیوں بانہیں حمائل کر رکھی تھیں جیسے وہ جنم جنم کے

ساتھی ہوں...... میں نے گاڑی روک لی اور دونوں ہتھیلیوں سے اپنی آنکھوں کو رگڑا کہ میں کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا مگر وہ حقیقت تھی وہ فریال ہی تھی جو اپنے کسی اور چاہنے والے کے ہمراہ شاپنگ کے لئے صرافہ بازار میں داخل ہوگئی۔

فریال کا یہ روپ دیکھ کر میری آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا۔ میری چاہت اور محبت کی اتنی تذلیل اتنا دھوکہ میرے ساتھ۔ اتنا بڑا فریب...... جی چاہا کہ ابھی جا کر اس کا گلا گھونٹ دوں اس کا خون کر ڈالوں۔ مگر میں ایسا نہ کر سکا۔ خزاؤں اور بربادیوں نے مجھے چارسو گھیر لیا۔ محبت کی وہ روشنی جو منزل عشق تک پہنچتے پہنچتے تلوؤں کے چھالوں اور شب کے نالوں کی سوزش سے پھوٹتی ہے وہ روشنی جیسے قبر کے اندھیروں میں اُتر گئی...... اعتبار جو محبوب کے لبوں سے پھوٹنے والے حرف و حکایات سے ذات کو چمکا دیتا ہے۔ وصل یار کی میٹھی میٹھی آرزو چٹکیاں لیتی ہے سب تہہ خاک ہوگئیں۔ وہ کھلونے ٹوٹ گئے جن کے اوپر اعتبار وفا اور محبت کے لیبل لگے تھے...... میرے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتیں جواب دے گئیں میری ذات عشق کی آگ اور محبوب کی بے وفائی سے بھسم ہوگئی۔ تب احساس ہوا کہ میں تو سرابوں کے پیچھے بھاگتا رہا ہوں۔ امتیاز خان اور فیصل ٹھیک ہی کہتے تھے کہ فریال جیسی لڑکیاں حسین تو ضرور ہوتی ہیں مگر بے وفا اور ہرجائی ہوتی ہیں...... میرا عشق بھی لمحہ کا ابال ہی بن گیا تھا...... اعتماد کی کرچیاں میرے چارسو بکھر گئیں میں اب انہیں کیسے سمیٹتا کیونکہ میں نے تو اپنے ہاتھوں کے لئے کوئی دستانہ بھی نہ رکھا ہوا تھا جو میں یہ کرچیاں سمیٹ لیتا اور لہو لہو بھی نہ ہوتا...... میں نے بڑی مشکل سے گاڑی کو آگے بڑھایا۔ گاڑی دو چار منٹ ہی چلی ہوگی اس کے بعد مجھ کچھ ہوش نہ رہا۔ میری گاڑی کی دوسری گاڑی سے ٹکر ہوگئی تھی...... ہوش آیا تو میں ہسپتال میں تھا۔ فیصل میرے پاس موجود تھا...... چند دن ہسپتال میں رہنے کے بعد میں صحت یاب ہوگیا۔ مگر میرے دل کے زخم پھر بھی ٹھیک نہ ہوئے۔

فیصل نے اس حادثہ کی وجہ پوچھی تو میں نے اسے فریال کی بے وفائی کا قصہ سنا دیا اور کہا کہ فیصل تم ٹھیک کہتے تھے کہ فریال کو صرف میری دولت سے غرض تھی اسے میری روح سے محبت نہ تھی۔

فیصل کے چہرے پر مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ جب میں ہسپتال سے گھر پہنچا تو گھر کا ہر فرد خوش ہوا اور انہوں نے میری خدمت کی خاطر دن رات ایک کر ڈالا۔ سلمٰی نے بھی ہمدردی کا اظہار کیا...... ایک بار پھر میں ان لوگوں کی محبتوں اور خلوص کو معترف ہوگیا۔ مگر فریال کی بے وفائی ناگ بن کر ڈس رہی تھی۔

مجھے اپنے وفاؤں اور قربانیوں پر رونا آرہا تھا کہ میری چاہتوں کا یہ صلہ تو نہیں ہونا چاہئے۔ اس روز میں فون کی خرابی اور کال نہ ملنے والا معمہ بھی حل کرنے میں کامیاب ہوگیا کہ فریال مجھ سے الوداعی ملاقات کر کے پاکستان نہ جاتی تھی۔ مجھے ایئرپورٹ تک نہ لے جانے کی وجہ بھی یہی تھی۔ کہ اس نے پاکستان تو جانا ہی نہیں ہوتا تھا وہ تین دن کسی اور چاہنے والے کو لوٹتی ہوگی اور پھر پاکستان جاتی ہوگی اور میرا فون سن کر دیوانی ہو جاتی ہوگی...... فریال واقعی ایک طوائف تھی اور طوائف ہی رہی۔ اب احساس ہوا کہ میں تو سرابوں کے پیچھے بھاگتا رہا ہوں۔ محبت انسان کو بے وقوف بنا ڈالتی ہے...... سچ ہی کہا ہے کسی مفکر نے کہ محبت وہ چیز جو اگر عقل مند اور ایک بے وقوف کو ہو جائے تو

ںوں میں کچھ فرق نہیں رہ جاتا۔ مگر اب پچھتانے سے کچھ حاصل نہ تھا...... فیصل نے بتایا تھا کہ میری سپتال میں موجودگی کے دوران دوبار فریال کا فون چکا ہے مگر میں نے اسے حقیقت نہیں بتائی بلکہ یہ بتایا کہ تم ملک سے باہر ہو۔

میں نے اس رات آخری بار فریال کو فون کیا۔ فاق سے وہ گھر پر ہی مل گئی۔ اس وقت رات کافی ھل چکی تھی۔ میری آواز سن کر وہ بہت خوش ہوئی ر پھر گلے شکوے کرنے لگی کہ میں شارجہ سے باہر لیا تو اسے بتا کر نہیں گیا...... وہ اپنی شکایتیں اور گلے کر چکی تو میں نے کہا:

”فریال بائی!......فون بند کرنے کی کوشش نہ کرنا اور میری تمام باتیں غور سے سننا...... تم کیا ہیں...... یہ میں جانتا تھا۔ مگر مجھے میری محبت پر اتنا تنا داور مان تھا کہ مجھے یقین تھا میری محبت پا کر تم منی کو بھول جاؤ گی تم نے بھی ایسے ہی وعدہ کئے تھے مگر اب میں تمہاری حقیقت جان گیا ہوں۔ کہ تم رف لوٹنا جانتی ہو۔ صرف دل ہی نہیں بلکہ مال وزر ی...... میں نے تمہیں مالا مال کیا۔ تمہاری ہر واہش اور ہر پسند لمحوں میں پوری کی۔ میں نے اپنا پ تم پر نچھاور کر ڈالا۔ مگر اب احساس ہوا کہ تم اندی کا بت تھیں۔ جو سدا اُجلے نہیں رہتے۔ بہت لد سیاہ پڑ جاتے ہیں۔ بتاؤ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ا۔ جو تم نے مجھے اتنا بڑا دھوکہ دیا۔ میں تمہیں اپنی نکھوں سے شیخ راشد سلطان کے ہمراہ دیکھ چکا وں۔ اب میری اور تمہاری راہیں جدا ہیں...... تم ھوٹی پجارن ہو۔ گھٹیا عورت ہو۔ میں تمہیں پارس انا چاہتا تھا۔ مگر یہ میری بھول تھی...... طوائف ہمیشہ وائف ہی رہتی ہے۔ تم جیسی عورتیں اپنے احساس اور ادراک کے پھندے سے کبھی رہائی حاصل نہیں کر سکتیں اس لئے تم بھی اس زہر کو اپنے وجود سے کھرچ کر باہر نہیں پھینک سکی ہو...... آئندہ بھی میری زندگی میں مداخلت نہ کرنا۔ بس یہی سمجھنا کہ ہم بطور ہم سفر ایک دوسرے سے ملے تھے اور بچھڑ گئے۔ جی تو چاہتا ہے کہ تمہیں اس بے وفائی اور دھوکہ دہی کی ایسی عبرتناک سزا دوں کہ لوگ تمہاری شکل دیکھ کر نفرت سے نگاہیں پھیر لیں۔ مگر میں تمہارے جیسا کم ظرف نہیں ہوں...... جاؤ...... تمہیں امیر شیخ اور اس جیسے دوسرے مبارک ہوں۔ تم نے میرا دل دکھایا ہے مجھے اس قدر لوٹا ہے کہ جی چاہتا ہے کہ خودکشی کر لوں۔ مگر نہیں میں ایسا نہیں کروں گا۔ کیونکہ یہ بزدلی ہے اور میں بزدل نہیں ہوں۔ تمہاری بے وفائی کا زخم نہ جانے کب بھرے گا۔ کاش میں بھی تمہاری طرح ہی ہوتا۔ تو میں بھی فائدہ میں رہتا۔ یوں کوئی پچھتاوا تو نہ ہوتا۔ مگر نہیں...... ایسا نہیں ہوا کیونکہ میں نہایت ہی شفاف جذبات والا انسان ہوں...... میں محبتوں کا امین ہوں۔ خلوص کا پجاری ہوں۔ مگر تم...... فریال تم جھوٹی پجارن ہو۔ محبتوں کی قاتل ہو۔ خلوص کی دشمن ہو...... تم نے جو کچھ میرے ساتھ کیا۔ میری وفاؤں اور جذبوں کا مذاق اڑایا...... اس کا صلہ اس کی سزا اوپر والا تمہیں ضرور دے گا۔ ایک روز تمہارا یہ حسن مٹ جائے گا۔ جوانی ڈھل جائے گی دولت بھی ختم ہو جائے گی۔ اس وقت تم پچھتاؤ گی مجھے یاد کرو گی۔ میری پاکیزہ محبت کو یاد کر کے روؤ گی اس وقت کچھ ہاتھ نہ آئے گا...... خدا حافظ...... خدا حافظ۔

☆☆☆☆☆

میں نے فریال کو بات ہی نہ کرنے دی اور فون

بند کر دیا۔ میں نے اپنا فون کاٹ دیا تاکہ وہ مجھے فون نہ کر سکے۔ دو دن بعد میں نے فیصل کو کہہ کر اپنی رہائش بھی بدل لی۔ تاکہ فریال یہاں نہ آ جائے مگر یہ ناممکن تھا۔ اس نے کبھی نہ کبھی میرے سامنے آنا تھا...... یوں ہی دن گزرنے لگے۔ فریال کی بے وفائی کے غم نے مجھے دیمک کی طرح چاٹنا شروع کر دیا۔ میں بیمار رہنے لگا۔ کام کاج سے جی اچاٹ ہو گیا۔ فیصل اور اس کے گھر والوں کو معلوم تھا کہ مجھے کیا غم ہے۔ اسی لئے وہ میری دلجوئی کرتے رہے تھے مگر پھر بھی میں دن بدن زیادہ ہی بیمار ہوتا جا رہا تھا۔

فیصل نے میری بہت ہی ڈھارس بندھائی۔ میری صحت کا خیال رکھا اور پھر ایک دن خود ہی اس نے مجھ سے درخواست کر ڈالی...... کہ میں اس کی بہن سلمٰی سے شادی کر لوں۔ تو میں اپنے ماضی کے دکھ درد بھول جاؤں گا۔

نہ جانے کیوں فیصل کی بات میرے دل کو لگی۔ میں نے ہاں کر دی...... مگر حتمی فیصلہ اپنے ابا جان پر چھوڑ دیا کہ اگر انہوں نے اجازت دے دی تو میں سلمٰی سے ضرور شادی کر لوں گا۔

میں پاکستان چلا آیا۔ جب ابا جان کو میں نے فیصل اور سلمٰی کے خاندان کے بارے میں بتایا اور ساتھ ہی سلمٰی سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا۔ تو انہوں نے فوراً ہی رضا مندی ظاہر کر دی۔ شاید اسے لئے کہ سلمٰی سے میری شادی ہو جانے سے ان کے وقار میں کچھ اور اضافہ ہونا تھا کہ ان کی بہو کا تعلق شارجہ کے ایک امیر ترین خاندان سے تھا......

ابا جان میرے ہمراہ شارجہ آئے تو فیصل کے خاندان سے مل کر بہت ہی خوش ہوئے۔ میری اور سلمٰی کی شادی طے پا گئی۔ ابا جان نے یہ شرط رکھی کہ شادی پاکستان اور ہمارے گاؤں میں ہوگی۔

فیصل اور اس کے والدین مان گئے۔ وہ سب لوگ پروگرام بنا کر پاکستان آ گئے۔ یوں میری اور سلمٰی کی شادی ہو گئی۔ میرے ابا جان نے یہ شادی اتنے دھوم دھام سے کی کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔ لوگ میری اور سلمٰی کی شادی کی تقریب کو اب بھی یاد کرتے ہیں......

میری اور سلمٰی کی شادی کو برسوں گزر گئے ہیں ہمارے تین بچے ہیں۔ ہم دونوں میں بے حد محبت ہے ہماری زندگی نہایت ہی خوش گوار گزر رہی ہے۔ میں نے شارجہ چھوڑ دیا ہے اب ہم اپنے گاؤں میں ہی رہتے ہیں۔ کبھی کبھی شارجہ جاتے رہتے ہیں۔ ہماری جوڑی ایک مثالی جوڑی ہے۔ سلمٰی نے مجھے وہ محبت اور چاہت دی ہے کہ میں ماضی کو بھول گیا ہوں۔ سلمٰی جانتی ہے کہ میں فریال سے محبت کرتا تھا۔ وہ سب کچھ جانتی ہے اسی وجہ سے اس نے میرے زخموں پر ایسا مرہم رکھا ہے کہ وہ زندگی بھر رسنے کا نام نہیں لیں گے۔ میں نے بھی فریال کو مکمل طور پر بھلا دیا ہے میں نے اس کا نام اور یادیں دل و دماغ کی ڈکشنری سے نکال پھینکی ہیں۔ فریال اب فلمی دنیا چھوڑ چکی ہے اور پاکستان سے باہر دھکے کھا رہی ہے...... کبھی کبھی شہر جانا ہو اور کسی سینما پر اس کی پرانی فلم لگی ہو تو سینما کے سامنے گزرتے ہوئے اس کی قد آور تصویر پر نظر پڑ جاتی ہے۔ تب مجھے ماضی یاد آ جاتا ہے۔ من میں ایک ہوک سی اٹھتی ہے مگر اسی لمحہ عرب کے روایتی حُسن کی تعبیر سلمٰی کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے اور فریال کا ہیولہ سامنے سے غائب ہو جاتا ہے۔



مکالمہ

میمونہ ارم مونشاہ

''......تم نے خودکو ڈپریشن کے ایک خود ساختہ خول میں بند کرلیا ہے جس سے باہر تم نکلنا ہی نہیں چاہتی......تم کچھ پل خوش رہ بھی لوتو کچھ ہی وقت بعد پھر اسی خول میں سمٹ جاتی ہو جس کے بارے میں تمہیں لگتا ہے کہ شاید تمہاری قسمت میں یہی لکھا ہے۔''

ایک لڑکی کی کہانی جس نے اپنے آپ کو خود ساختہ خول میں بند کرلیا تھا

''نیکسٹ......'' وہ کوریڈور میں رکھی کرسیوں پر بیٹھی اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی کہ اندر سے آواز آئی۔ وہ چونک کر کھڑی ہوگئی' اس سے آگے والی لڑکی کب اندر گئی اور باہر نکلی اسے خبر بھی نہ ہوئی۔

''بیٹا! صرف مریض کو اندر بھیجیں آپ باہر ہی بیٹھیں'' جیسے ہی وہ اجازت لے کر کمرے میں داخل ہونے لگی سامنے بڑے سے میز کے دوسری طرف کرسی پر بیٹھے ادھیڑ عمر کے شخص نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''جی میں ہی مریضہ ہوں'' اس نے ہچکچاتے

ہوئے کہا۔

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟'' اس شخص نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور سامنے رکھی فائل اُٹھالی۔

''تو چلیں سیشن شروع کرتے ہیں'' اس شخص نے عینک اُتار کر میز پر رکھی اور پانی کا گلاس اُٹھالیا۔ فائل میں رکھی تفصیلات پڑھنے کے بعد اسے یہ کیس کافی دلچسپ لگا مگر اب اسے اپنے طور پر سوالات کرنا تھے کیونکہ وہ ایک ماہر نفسیات تھا اور سامنے بیٹھی دھان پان سی لڑکی اس کی مریضہ۔

ماہر نفسیات: ''تمہارا نام؟''

لڑکی: ''نورارم مگر سب ارم کہتے ہیں''

ماہر نفسیات: ''ہمم...... تو ارم تمہاری عمر کیا ہے؟''

ارم: ''25 سال''

ماہر نفسیات: ''نام ارم ہے جو کہ شخصیت پر بالکل کسی جنت کے سانچے کے جیسے ڈھلا ہے اور عمر ہے پچیس سال...... دیکھو ارم بیٹا! اس عمر میں تو تمہیں اپنی زندگی کو بھی ارم (جنت) کے جیسے جینا چاہیے پھر پچھلے پانچ سال سے تم بائیس ڈاکٹرز کے پاس سینکڑوں عاملوں کے پاس جا چکی اور اب تمہارا ایک سائیکیٹریسٹ کے پاس آنے کے لیے کیا کام آن پڑا۔''

ارم: ''یہ سب میں اپنی مرضی سے نہیں کرتی میں تو حالات پر منحصر ہوں جو مجھے جہاں لے جائیں۔''

ماہر نفسیات: ''تو تم نے خود کو اتنا کمزور بنایا ہی کیوں کہ حالات تم پر غلبہ پالیں؟''

ارم: ''یہ کم ہے کہ زندگی کے بیس سالوں کو میں نے اپنی مرضی سے جیا؟''

ماہر نفسیات: ''تو ان پانچ سالوں میں ایسی کون سی دشواری پیش آن پڑی کہ باقی زندگی کے لیے حوصلے پست ہوگئے؟''

ارم: ''اب تھک چکی تھی خود سے یا حالات سے لڑنے کی ہمت نہیں باقی بچی۔''

ماہر نفسیات: ''اگر تھک چکی تھیں تو زندگی کے اکیسویں سال ہی تمہیں ختم ہو جانا چاہیے تھے پھر تم تو ابھی بھی صحیح سلامت یہاں کھڑی ہو۔۔۔ تھک چکی تھیں تو اتنے معالج کیوں بدلے اور ابھی تک مطمئن نہیں ہوئی تو بار بار پھر کسی نئے ڈاکٹر، عامل یا ماہر نفسیات کے پاس جانا کیسا؟''

ارم: ''اُمید...... کچھ اچھا ہونے کی اُمید...... نئی زندگی کی اُمید......''

ماہر نفسیات: ''تم اُمید کے انتظار میں کیوں

فریاد

ایک فقیر محتاج، بادیہ نشین عورت جنگل میں خیمہ لگائے ہوئے تھی، اپنی ضروریات کے لئے اس نے اردگرد کھیتی کر رکھی تھی، گزر اوقات اسی سے کرتی تھی، ایک دن طوفان آیا، بجلی چمکی اور کڑکی اور آسمان سے ژالہ باری ہوئی اور کھیتی تباہ و برباد ہوگئی۔ جب طوفان تھم گیا، اس عورت نے خیمہ سے سر نکالا، اپنی کھیتی کو دیکھا، ہر چیز تباہ و برباد ہو چکی تھی، اس نے حسرت بھری نگاہوں سے اسے دیکھا اور پھر اپنا منہ آسمان کی طرف کیا اور کہنے لگی

''اے میرے پروردگار! جو جی چاہے کر (تجھ کو کون پوچھنے والا ہے) (ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ) میرا رزق تو تیرے ہی ذمہ ہے''۔

بیٹھی ہو۔ خود ہی اپنے لیے شمع کیوں نہیں بنتیں؟؟ تمہاری فائل میں لکھا ہے تم کسی ذہنی الجھن کا شکار ہو جبکہ ساتھ ہی میں نے یہ بھی پڑھا ہے کہ تم تو کافی لوگوں کے کام آتی ہو اتنی دعائیں لیتی ہو ان کاموں سے تمہیں دلی سکون ملتا ہے پھر تمہیں کس چیز کی اُلجھن ہے؟''

ارم: ''اس الجھن کا جواب تو میرے پاس بھی نہیں ہے اسی لیے تو آپ کے پاس آئی ہوں......

ہاں! صرف یہ جانتی ہوں کہ میں اپنی طرف سے سب کی مدد کرتی ہوں اور جب کوئی میری وجہ سے خوش ہو تو مجھے سکون حاصل ہوتا ہے......مگر اس کے باوجود میں کبھی کبھار اپنی ذات سے تنگ آجاتی ہوں اور اس چیز پر میرا کوئی اختیار نہیں ہے۔''

ماہر نفسیات: ''اختیار ہے مگر تم عمل کرنے سے ڈرتی ہو ایک بار اپنے دل سے پوچھو تم جو سب کی ہر ممکن مدد کرسکتی ہو تو خود کی کیوں نہیں؟''

ارم: ''خود کی مدد؟؟ میں سمجھی نہیں...... وہ کیسے؟''

ماہر نفسیات: ''وہ ایسے کہ تم نے خود کو ڈپریشن کے ایک خود ساختہ خول میں بند کرلیا ہے جس سے باہر تم نکلنا ہی نہیں چاہتی......تم کچھ پل خوش رہ بھی لو تو کچھ ہی وقت بعد پھر اسی خول میں سمٹ جاتی ہو جس کے بارے میں تمہیں لگتا ہے کہ شاید تمہاری قسمت میں یہی لکھا ہے۔''

ارم: ''ہمم...... میں بالکل ایسا ہی سوچتی ہوں۔ مگر میں اس سب سے باہر کیسے نکلوں؟ مجھے ہر چھوٹی سے چھوٹی بات تکلیف دیتی ہے۔ تلخ لہجے مجھے اندر تک توڑ دیتے ہیں۔ جن لوگوں کو میری یہ کمزوری معلوم ہو جائے وہ پھر یہی کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح مجھے اذیت میں مبتلا رکھیں۔''

''ہاہاہاہاہاہاہا......'' ماہر نفسیات ہنسا۔

ماہر نفسیات: ''ایسا کچھ نہیں ہوتا کوئی ہمیں اس وقت تک نہیں توڑ سکتا جب تک ہم خود کمزور نہ پڑ چکے ہوں۔''

ارم: ''مگر میں تو کمزور نہیں ہوں میں آخری لمحے تک مضبوط بنے رہنے کی کوشش کرتی ہوں پھر ایک حد کے بعد میری برداشت ختم ہو جاتی ہے۔''

ماہر نفسیات: ''میں نے پہلے بھی بتایا ہے کہ تمہارا خود ساختہ خول ہے جس دن تم یہ خول توڑ دو گی پھر تم خود ہنسو گی کہ میں ہر چھوٹی چھوٹی بات کی کتنی پرواہ کرتی تھی۔''

ارم: ''اور یہ سب کیسے ہوگا؟''

ماہر نفسیات: ''بہت آسان ہے جیسے تم ہر اس دوست کو جو ذہنی ٹینشن میں مبتلا ہوتا اس کی مدد کرتی ہو اسے ہر ممکن طریقے سے اس فکر سے باہر نکالنے کی کوشش کرتی ہو اب خود کے لیے بھی ایسے ہی کرو۔ اپنی ذات کو دو حصوں میں تقسیم کردو...... ایک تم اور دوسری تمہاری ذات۔ اب اپنی ذات کو اپنا دوست سمجھ کر اسے ذہنی اذیت سے نکالنے کی بھرپور کوشش کرو۔ اول تو اس سے ہماری دوسری ملاقات کی نوبت نہیں آئیگی پھر بھی امید ہے دوسری بار تم خود کہو گی کہ برسوں بیت گئے میں نے کسی ڈاکٹر، عامل یا ماہر نفسیات کے پاس جانا چھوڑ دیا ہے کیونکہ اب میں اپنی ذات کے ساتھ دوستی کر کے بہت خوش ہوں۔ تم ٹھیک ہو بس تمہیں ان باتوں پر عمل کرنا ہے جن کا سامنا کرنے سے تم کترا رہی ہو۔ اب تم جاسکتی ہو۔''

''نیکسٹ......'' ماہر نفسیات نے نئی فائل اُٹھالی۔

......❁......❁......



لاک ڈاؤن

خذینہ نور

اس سے پہلے وہ اندر جاتی بہت دیر ہو چکی تھی۔ رب نواز زہر کی گولیاں کھا چکا تھا۔ زمین پر اوندھے منہ پڑا ہاتھوں کو ملا کر اپنے بچوں کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ شاید وہ کہنا چاہ رہا تھا مجھے معاف کردو میرے بچو، میں تمہیں دو وقت کی روٹی بھی نہیں دے سکا مجھے اب جینے کا کوئی حق نہیں ہے کوئی حق نہیں۔

پیٹ کی بھوک کتنی سفاک اور بڑی سچائی ہے یہ کہانی پڑھ کر دیکھ لیں

عاصم معمول کے مطابق صبح سکول جانے کیلئے اُٹھا لیکن خلاف معمول آج اس کی ماں صغراں بی بی نے اسے واپس سو جانے کو کہا۔ ”سو جا عاصم آج سکول نہیں جانا آج سے تیرے سکول بند ہوگئے ہیں۔“ عاصم جس کو سکول بند ہونے کی وجہ سے کوئی سروکار نہیں تھا اماں کی یہ بات سن کر خوشی سے کھلکھلا اُٹھا۔ وہ جھٹ سے اپنے بستر سے اُٹھا اور اپنے سرہانے پڑی پلاسٹک کی بندوق اٹھا کر کھیلنے لگا۔

دوسری جانب عاصم کا باپ رب نواز

پریشان حالت میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اب فیکٹری بھی بند ہے دوسرا کوئی کام دھندا بھی نہیں' کمائے گا کہاں سے؟ اور پتہ نہیں یہ سلسلہ کب تک چلے گا؟

صغراں بی بی اس کے چہرے پر نمودار ہونے والی اس کی یہ پریشانی بھانپ چکی تھی۔ اس نے اپنے شوہر کو تسلی دی '' پریشان نہ ہو عاصم کے ابا' رب ہے نا وہ سب ٹھیک کردے گا۔''

سال 2019ء اور 2020ء بدقسمتی سے تاریخ کے وہ سال تھے جس میں کرونا وائرس سے ہونے والی تباہی نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ پاکستان میں اس تباہی نے اپنا رُخ اس وقت کیا جب 26 فروری 2020ء میں ایران سے آنے والے دو پاکستانیوں میں اس جان لیوا خطرناک وائرس کی تصدیق ہوگئی اور 9 مئی 2020ء سے پورے پاکستان میں مکمل لاک ڈاؤن کا آغاز ہوا۔

شروع کے کچھ دن تو جیسے تیسے کرکے گزر گئے لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا لوگوں کی پریشانیاں اور مسائل بڑھتے گئے۔ کاروبار' روزگار ختم ہونے لگے۔ ایسے حالات کا شکار رب نواز کا کنبہ بھی تھا۔ حالات خراب ہونے کے ساتھ رب نواز اور اس کے خاندان کی پریشانی اور بڑھتی گئی۔ رب نواز ایک فیکٹری

یقین

ایک بزرگ تھے۔ ملک میں قحط پڑا ہوا تھا۔ خلقت بھوک سے مر رہی تھی...... ایک روز یہ بزرگ اس خیال سے کچھ خریدنے بازار جا رہے تھے کہ نہ معلوم بعد میں یہ بھی نہ ملے...... بازار میں انھوں نے ایک غلام کو دیکھا جو ہنستا کھیلتا لوگوں سے مذاق کر رہا تھا...... بزرگ ان حالات میں غلام کی حرکات دیکھ کر جلال میں آ گئے...... غلام کو سخت سُست کہا کہ لوگ مر رہے ہیں اور تجھے مسخریاں سوجھ رہی ہیں۔

غلام نے بزرگ سے کہا...... '' آپ اللہ والے لگتے ہیں...... کیا آپ کو نہیں پتا میں کون ہوں......؟'' بزرگ بولے '' تُو کون ہے......؟''

غلام نے جواب دیا...... '' میں فلاں رئیس کا غلام ہوں جس کے لنگر سے درجنوں لوگ روزانہ کھانا کھاتے ہیں...... کیا آپ سمجھتے ہیں کہ جو غیروں کا اس قحط سالی میں پیٹ بھر رہا ہے وہ اپنے غلام کو بھوکا مرنے دے گا؟؟ جائیں...... آپ اپنا کام کریں...... آپ کو ایسی باتیں زیب نہیں دیتیں''

بزرگ نے غلام کی بات سنی اور سجدے میں گر گئے...... بولے......

'' یا اللہ! مجھ سے تو یہ ان پڑھ غلام بازی لے گیا...... اسے اپنے آقا پر اتنا بھروسہ ہے کہ کوئی غم اسے غم نہیں لگتا اور میں جو تیری غلامی کا دم بھرتا ہوں یہ مانتے ہوئے کہ تُو مالک الملک اور ذوالجلال والاکرام ہے اور تمام کائنات کا خالق اور رازق ہے میں کتنا کم ظرف ہوں کہ حالات کا اثر لے کر نا امید ہو گیا ہوں...... بے شک میں گناہ گار ہوں اور تجھ سے تیری رحمت مانگتا ہوں اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتا ہوں۔

میں مزدوری کرتا تھا اور اس کی بیوی لوگوں کے گھروں میں کام کرکے اپنا اور اپنے تینوں بچوں عاصم' عفرہ اور محمد احمد کا پیٹ پالتی تھی۔ لاک ڈاؤن کی وجہ سے دونوں بے روزگار ہوگئے تھے اور اپنے جمع کیے ہوئے پیسوں سے ہی گھر کا خرچ چلا رہے تھے۔

دن گزرتے گئے اور حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ رب نواز نے بڑی مشکل سے بھٹے کی ریڑھی لگانا شروع کی تھی لیکن اس سے بھی ان کی حالت میں کوئی فرق نہ آیا اور نوبت فاقوں پر آ گئی۔ کبھی روٹی مل جاتی اور کبھی نہیں۔ عاصم کی ماں پانی میں کبھی نمک گھول کر بچوں کو پلاتی تو کبھی چینی گھول کر۔ رمضان کا پہلا عشرہ تھا کوئی پانچواں یا چھٹا روزہ ہوگا' رب نواز سارے دن کی مزدوری کرکے دنیا جہان کے دھکے کھانے کے بعد گھر آیا تھا۔ اس نے اپنی بیوی سے پوچھا ''کھانے کو کچھ بنا ہے؟'' صغراں بی بی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا ''آج بچوں نے صرف پانی پی کر روزہ کھولا ہے۔''

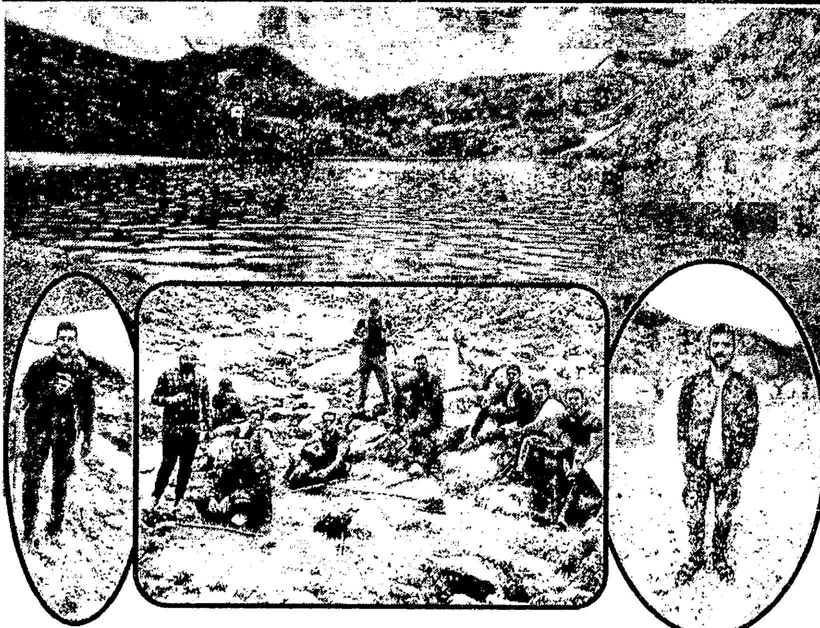
وہ یہ الفاظ برداشت نہ کرسکا اچانک اس کا دل بیٹھنے لگا ساری زمین اس کی آنکھوں کے سامنے چکرانے لگی۔ اسے ایسے لگ رہا تھا جیسے پورا آسمان اس کے سر پر آ گرا ہے۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا باورچی خانے کی طرف گیا اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کچھ ڈھونڈنے لگا۔ عاصم اور عذرا بھی اس کے پیچھے بھاگے۔ ''ابا یہ تُو کیا ڈھونڈ رہا ہے؟ ابا کیا ہوا ہے؟''

صغراں بی بی صحن میں جمی یہ سب منظر دیکھ رہی تھی۔ اس کے قدم اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ بڑی مشکل سے وہ باورچی خانے کی طرف لپکی' اس سے پہلے وہ اندر جاتی بہت دیر ہوچکی تھی۔ رب نواز زہر کی گولیاں کھا چکا تھا۔ زمین پر اوندھے منہ پڑا ہاتھوں کو ملا کر اپنے بچوں کی طرف اشارہ کررہا تھا۔ شاید وہ کہنا چاہ رہا تھا مجھے معاف کردو میرے بچو' میں تمہیں دو وقت کی روٹی بھی نہیں دے سکا مجھے اب جینے کا کوئی حق نہیں ہے کوئی حق نہیں۔

بچے بہت چھوٹے تھے اتنے چھوٹے کے ان کو اس بات کی خبر نہیں تھی کہ وہ یتیم ہوچکے ہیں اور ان کے اوپر ایک اور قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ عاصم کے دماغ میں بس کھانا چل رہا تھا۔ اس نے عفرہ سے پوچھا تھا...... ''عفرہ ابا مرگیا ہے نا اب ہمارے گھر تین دن تک دوسرے لوگ کھانا دیں گے' ہم روٹی کھائیں گے ساتھ سالن کھائیں گے۔'' اور عفرہ نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے اس کے بازو پر کہنی ماری اور بولی ''ارے پاگل ہے تُو' تجھے نہیں پتا لاک ڈاؤن ہے۔ اب کے مرنے پر کوئی نہیں آئے گا ہم بھوکے ہی رہیں گے۔''

عاصم' عفرہ کو معصومانہ انداز میں دیکھتے ہوئے بولا ''اچھا عذرا پھر ہم ایسا کرتے ہیں ہم بھی ابا کی طرح زہر والی گولیاں کھا لیتے ہیں۔''

......❁......❁......



دودی پت سر جھیل

بالکل صاف شفاف پانی، آسانی سے آپ اپنا عکس اس میں دیکھ سکتے ہیں۔ تینوں طرف سے یہ جھیل پہاڑوں میں گھری ہوئی ہے۔ جھیل کے اطراف میں چراگاہیں اور ندی نالے دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایسا نظارہ دیکھنے کے لیے انسان جتنی بھی مشقت برداشت کرلے کم ہے۔



ارسلان عارف اپل

وادیِ ناران کے خوبصورت مقام کی سیر جسے جھیلوں کی ملکہ بھی کہا جاتا ہے

ویسے تو بہت سے سیاحتی مقامات کی سیر کی ہے اور کافی لوگوں کو ٹورز کروائے بھی ہیں۔ لیکن کسی سیاحتی مقام کے دورہ سے متعلق کبھی لکھا نہیں۔ آج سوچا کیوں نا اس تازہ سفر کے حوالے سے ایک سفر نامہ لکھا جائے۔ اگر دیکھا جایا تو اس دورہ کی اہمیت کچھ زیادہ تھی۔ کیوں کہ بہت دیر کے بعد دوستوں کے ساتھ جانے کا موقع مل رہا تھا۔ ٹور کمپنی چلانے کی وجہ سے مین پلان اور باقی چیزوں کی ذمہ داری بھی میرے سر ہی تھی۔ اب تھوڑا سا آپ کو دودی پت سر لیک lakeDudipatsar کے بارے میں بتاتا چلوں۔ اسے جھیلوں کی ملکہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ کاغان ویلی میں واقع ہے۔ کپک اور آزاد کشمیر کے border

پر ہے۔ سطح سمندر سے 3,800 میٹر (12 ہزار 500 فٹ) کی بلندی پر واقع ہے۔ نارمل ٹریکنگ کرتے ہوئے آپ کوئی 7 سے 8 گھنٹے میں بیسل ناران سے ملاں کی بستی پہنچ جائیں گے۔ اور ملاں کی بستی سے کوئی 1 گھنٹہ 30 منٹ میں آپ جھیل تک پہنچ سکتے ہیں۔

یہاں جانا ایک خواب سا تھا جسے ہم نے وہاں جا کر پورا کر دیا۔ وہاں جانے کا پلان قریب ایک سال پہلے بنا تھا۔ اس سال کرونا وائرس کی وجہ سے لاک ڈاؤن تھا تو سوچا لاک ڈاؤن کھلتے ہی ہم چلے جائیں گے۔

سونے پر سہاگہ ہو گیا جب عید الاضحیٰ کے فوراً بعد 14 اگست سے پہلے وزیراعظم عمران خان نے لاک ڈاؤن کھولنے کا اعلان کر دیا۔ بس پھر کیا یہ خبر آنے کی دیر تھی کہ ہم نے 14 اگست کو جھیل پر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ 13 لوگوں کا یہ کارواں تھا جس میں سے کچھ لوگ پہلی دفعہ ہمارے ساتھ جا رہے تھے۔ اللہ اللہ کر کے 12 اگست کو یہ کارواں نارووال سے روانہ ہو گیا۔ نارووال سے پسرور، ڈسکہ، وزیرآباد سے ہوتے ہوئے ہم جی ٹی روڈ پہنچ گئے اور وہاں سے آگے اسلام آباد کی طرف بڑھے۔

یہاں تک کے سفر کی جو مزہ کی بات تھی وہ یہ تھی کہ اکیلا ڈرائیور مسلم لیگ ن کا سپورٹر تھا اور باقی 13 لوگ PTI کے حامی تھے۔ پوری رات بس کا پارلیمنٹ ہاؤس جیسا منظر تھا۔

صبح سویرے اسلام آباد نے ہمیں بہت اچھا ویلکم کیا۔ کہیں بارش کہیں بادل۔ واقعی اسلام آباد دنیا کے خوبصورت شہر میں سے ایک ہے۔ جیسے لاہور لاہور ہے ویسے ہی اسلام آباد کا بھی اپنا الگ حُسن ہے۔

ہزارہ موٹروے سے ہوتے ہوئے ہم مانسہرا اور وہاں سے ہم بالاکوٹ پہنچ گئے۔ ہزارہ موٹروے بھی ایک بہت اچھی ڈویلپمنٹ ہے جس سے نہ صرف سفر کرنے میں آسانی پیدا ہوئی ہے بلکہ فاصلے بھی کم ہو گئے ہیں۔ سڑکیں کسی بھی ملک کی ترقی میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ تقریباً 8 گھنٹے میں ہم نارووال سے بالاکوٹ پہنچ چکے تھے۔ پراٹھوں کے ناشتہ کے بعد ہم نے ناران کی طرف سفر جاری رکھا۔ ناران سے ہوتے ہوئے ہم بیسل پہنچ گئے۔ آج رات کا قیام اور ڈنر بھی یہیں تھا۔ ماشاء اللہ گورنمنٹ کی طرف سے شمالی علاقہ کی ڈویلپمنٹ پر کافی کام ہو رہا ہے لیکن ہم لوگ جب تک خود صفائی ستھرائی کا خیال نہیں رکھیں گے تب تک گورنمنٹ بھی کچھ نہیں کر سکتی۔ کیمپ لگنے کے بعد ہم نے ڈنر کیا۔ رات کی تاریکی ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ مون ریسٹورنٹ بیسل کی علاوہ کہیں روشنی نہیں تھی۔ زندگی جیسے وہاں ٹھہر سی گئی تھی۔ نہ کوئی موبائل سگنل نہ کوئی ٹریفک کا شور۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ پاس بہتے ہوئے دریائے کنہار کی آواز اور آسمان پر کھلا چاند...... یہ منظر بہت دلکش تھا۔ صبح ٹریکنگ کرنی تھی چنانچہ سب لوگ ہی جلدی سو گئے تھے۔

اگلی صبح 14 اگست تھی اور ہمارے ٹور کا دوسرا دن تھا۔ صبح 5 بجے سب کو اُٹھا دیا گیا۔ وضو کے بعد فجر کی نماز ادا کی گئی۔ پانی تو کچھ زیادہ ہی ٹھنڈا تھا۔ ساری رات اونچی آواز میں خراٹے لینے کے بعد ابھی بھی کچھ دوست بول رہے تھے کہ ہمیں تو ساری رات نیند نہیں آئی۔ موسم اتنا اچھا تھا کہ موڈ خود بخود خوشگوار ہو گیا تھا۔ پہاڑ بادلوں کے پیچھے چھپے ہوئے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر ہم سب اللہ کی قدرت کے نظاروں میں کھو گئے اور زبان پر بے اختیار سبحان اللہ کے الفاظ جاری ہو گئے۔ کچھ دوستوں کی کھانا بنانے کی ذمہ داری تھی۔ ہر ضرورت کی چیز ہم ساتھ لے کر گئے تھے۔ روٹی، انڈے، دودھ، جام، بریڈ، بسکٹ اور بھی بہت کچھ تھا۔ سب نے اپنی بھوک کے مطابق ناشتہ کیا اور سامان سمیت کر ہم لوگ ٹریکنگ کے سٹارٹنگ پوائنٹ پہنچ گئے۔ یہاں سے ہی ہمارا ایڈونچر شروع ہو گیا تھا۔

دریائے کنہار کے اوپر مقامی لوگوں کی طرف سے ڈولی والی لفٹ لگی ہوئی تھی جس کو رسی کی مدد سے چلایا جاتا ہے۔ایک ایک کر کے ہم 13 لوگ دریا کی دوسری سائیڈ پر پہنچ گئے۔ آج 14 اگست تھی اور ہمارا جوش اور جذبہ بھی کافی زیادہ تھا جیسے کسی محاذ پر جا رہے ہوں۔اللہ اکبر کے نعروں سے ٹریکنگ کا آغاز کیا گیا۔ سامان والے گھوڑے بھی ہمارے ساتھ تھے۔ یہاں گھوڑے آرام سے مل جاتے ہیں۔بستی تک ایک دن کا کرایہ 3000 ہے' بیشک آپ خود بیٹھیں یا سامان رکھ دیں۔ سامان جتنا کم ساتھ لے کر جائیں گے اتنا ہی آپ کے لیے بہتر ہے۔ شروع میں ٹریکنگ کافی آسان تھی۔ آدھا گھنٹہ چلنے کے بعد ہمیں کافی اونچا پہاڑ نظر آیا جس کی چوٹی پر ہمیں جانا تھا۔ بہرحال ہمت پکڑی اور آرام آرام سے چلتے ہم لوگ منزل کی طرف بڑھنے لگے۔ کچھ لوگ آگے نکل گئے۔ کچھ نصف راستے میں تھے اور کچھ پیچھے تھے۔ خیر چلتے چلتے ہم آدھا سفر کر چکے تھے۔ راستے میں 3 گلیشئرز کو کراس کیا جو بس ختم ہی ہونے والے تھے۔ جب یہ ختم ہو جاتے ہیں تو پھر آپ کو دریا پیدل کراس کرنا پڑھتا ہے۔

2013ء کا واقعہ ہے کہ ایسے ہی ایک سیاحتی دورہ کے دوران آنسو لیک جاتے ہوئے میں گلیشیر میں گر گیا تھا' لیکن اللہ نے بچا لیا تھا۔اس لیے ہمیشہ گلیشیر کراس کرتے ہوئے مجھے ڈر رہتا ہے۔نصف سفر طے کرنے کے بعد تو ایسا لگا کہ ہم کسی اور دنیا میں آگئے ہیں۔ چاروں طرف اونچے اونچے پہاڑ تھے۔ہمارے بائیں جانب ندی بہہ رہی تھی۔ جبکہ ہمارے سامنے سبز گھاس اور مختلف رنگوں کے پھول جگہ جگہ نظر آرہے تھے۔یہ والی ٹریکنگ پہلی والی سے تھوڑی آسان تھی لیکن ابھی بھی کافی ٹریکنگ پڑی ہوئی تھی۔ اتنی خوبصورت جگہ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ میں یہی سوچتا رہا کہ جھیل کتنی خوبصورت ہو گی۔ 8 بج کر 45 منٹ پر ٹریکنگ شروع کی تھی اور ہم 4 بج کر 15 منٹ پر ملاں کی بستی پر تھے۔

تقریباً کوئی 11 کلومیٹر کا سفر ہم نے 8 گھنٹوں میں پورا کیا تھا۔ کچھ لوگ پہلے پہنچ گئے تھے تو انہوں نے کیمپ لگا دیے تھے۔تھکن سے بُرا حال تھا۔وہاں پہنچ کر تھوڑا آرام کیا گیا۔ ٹھنڈی ہوا اور سورج کی روشنی بہت تیز تھی۔ ملاں کی بستی پر ایک چھوٹا سا سیٹ اپ لوکل لوگوں کی طرف سے لگایا گیا ہے۔ رہنے کے لیے کیمپ اور کھانے پینے کو کچھ چیزیں مل جاتی ہیں۔ہم چونکہ سب سامان ساتھ لے کر گئے تھے اس لیے ہم نے ڈنر میں آلو انڈے بنانے کا فیصلہ کیا۔ کچھ دوستوں کی کافی محنت کے بعد آلو انڈے بن گئے۔روٹی بستی سے ہی مل گئی تھی۔ ماشاء اللہ بہت اچھا اور ذائقہ دار کھانا بنا تھا۔ہم لوگوں کے علاوہ بھی کافی سیاح وہاں موجود تھے۔ یہ جگہ بہت محفوظ اور ٹورسٹ فرینڈلی ہے۔ رات کافی ہو چکی تھی آسمان پر کہکشاؤں کا منظر بہت دلکش لگ رہا تھا البتہ سردی بہت زیادہ تھی۔بستی پر گزاری ہوئی یہ رات بھی بہت یادگار تھی۔

اگلی صبح 15 اگست تھی اور ٹور کا تیسرا دن تھا۔یہ صبح کچھ زیادہ ہی ٹھنڈی تھی۔ سب کو انتظار تھا کہ سورج نکلے اور تھوڑا سکون ہو۔آج بھی جلدی اُٹھنا پڑا تھا تا کہ جھیل کو وقت پر دیکھ کر نیچے بیسل تک روشنی میں ہی پہنچا جاسکے۔زیادہ سردی کی وجہ سے کچھ دوستوں کی طبیعت تھوڑی اچھی نہیں تھی۔انہوں نے گھوڑے کروا لیے۔ ملاں کی بستی سے 1000 روپے میں گھوڑا مل جاتا ہے جو آپ کو ایک گھنٹے میں جھیل پر پہنچا دے گا۔کچھ وقت گزار کر اسی گھوڑے پر واپس جاسکتے ہیں۔ جھیل پر پہلی نظر پڑتے ہی انسان اسے دیکھتا رہ جاتا ہے۔واقعی یہ جھیل ملکہ کہلانے کا حق رکھتی ہے۔

بالکل صاف شفاف پانی' آسانی سے آپ اپنا عکس اس میں دیکھ سکتے ہیں۔تینوں طرف سے یہ جھیل پہاڑوں میں گھری ہوئی ہے۔صبح کا وقت ہونے کی وجہ سے جھیل پر اردگرد کے پہاڑوں کا عکس بہت دلفریب منظر پیش کررہا تھا۔بیسل سے جھیل تک کوئی 27 کلومیٹر کا فاصلہ بنتا ہے۔جھیل کے اطراف میں چراگاہیں اور ندی نالے دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ایسا نظارہ دیکھنے کے لیے انسان جتنی بھی مشقت برداشت کرلے کم ہے۔ ماحول اتنا شاندار اور اثر انگیز ہوتا ہے کہ سیاح کو آس پاس کے لوگوں کا بھی ہوش نہیں رہتا اور قدرت کے اس حسین شاہکار کا حُسن روح تک کو معطر اور شاداب کردیتا ہے۔ ہم سب پر بھی کافی دیر یہی کیفیت طاری رہی۔ہم وہاں کچھ دیر قیام کے بعد دوبارہ ملاں کی بستی چلے گئے تھے۔

اگر آپ نے سرل پاس' سرل جھیل' نوری ٹاپ جانا ہوتو بستی سے راستہ جاتا ہے۔ ناشتہ کرنے کے بعد ہم نے سامان گھوڑوں پر رکھا اور اپنا واپسی کا سفر جاری رکھا۔چڑھائی تو مشکل تھی ہی لیکن اُترائی بھی آسان نہ تھی۔ اس جگہ کو چھوڑ کر جانے کا بالکل بھی دل نہیں تھا۔جھیل اور اس تک جانے والے راستے ہماری انکھوں کے سامنے آرہے تھے۔کوئی 4 بجے ہم نیچے پہنچ گئے۔آج کی رات ہمارا قیام بٹاکنڑی میں تاج کانٹی نینٹل میں تھا۔اگر آپ کا بٹاکنڑی رات رکنے کا پروگرام ہوتو یہاں قیام کریں۔ بہت اچھا ہوٹل بنایا ہے۔بٹاکنڑی ناران سے آدھے گھنٹے کے فاصلہ پر ہے۔ ناران کا سفر مون ہوٹل کے کھانے کے بغیر نا مکمل ہے۔ناران بازار کا چکر لگانے کے بعد ہم نے ہوٹل کا رُخ کیا تاکہ صبح اُٹھ کر واپس نارووال کا رُخ کیا جائے۔

اگلی صبح 6 بج ہم نکلے اور رات 8 بجے نارووال پہنچ چکے تھے۔ راستے بھر ہم جھیلوں کی ملکہ کے سحرانگیز نظاروں کے بارے میں ہی گفتگو کرتے رہے۔ اور یوں ہمارا سفر ختم ہوا۔اس امید کے ساتھ کہ انشاء اللہ اگلے سال پھر اسی طرح دوستوں کے ساتھ کسی نئی جگہ جائیں گے۔سفر سے آپ بہت کچھ سیکھتے ہیں۔نئی نئی جگہوں کو تلاش کریں' لوگوں سے ملیں' ان کا کلچر دیکھیں۔کوشش کریں کہ اپنے ملک میں سیاحت کو فروغ دیں۔

یہاں مجھے مستنصر حسین تارڑ صاحب کی لکھی ہوئی بات یاد آگئی:

جو نظاروں سے پیار کرتا ہے اور ان کی کشش کو اپنے اندر سمو لیتا ہے وہ ہمیشہ کے لئے ایک متلاشی روح بن جاتا ہے۔ ہمالیہ کی بلندیوں پر دیوتاؤں کو دیکھتا ہے۔ ماؤنٹ اولمپس پر جاتا ہے' ہندوکش کی ازلی برفوں میں اپنے خدا تلاش کرتا ہے۔نوح کی کشتی بھی کوہ ارارات پر جاٹھہری۔حضورﷺ بھی غارِ حرا میں روشنی پاتے ہیں۔موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر جاتے ہیں اور ہم کلام ہوتے ہیں...... اور اس تلاش کا سلسلہ ہر انسان کے اندر چلتا رہتا ہے۔فرق صرف اتنا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر چڑھنے کی ہمت کرلیتے ہیں اور ہم جیسے حقیر صرف پہاڑ کو دیکھتے رہ جاتے ہیں.....!

(مستنصر حسین تارڑ)

یہ سب لکھنے کا بس ایک مقصد ہے کہ پاکستان میں ٹورازم کو پرموٹ کیا جائے۔ اللہ نے پاکستان کو بہت خوبصورت بنایا ہے۔صفائی ستھرائی کا خاص خیال رکھیں۔ہر قسم کی سیاحتی سرگرمیاں ہمارے ملک میں موجود ہیں۔ الحمدللہ پاکستان بہت پرامن ملک ہے ۔ہم سب پر لازم ہے کے اس کی تعمیر اور ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں اور دنیا کو اپنے ملک کا ایک اچھا امیج پیش کریں۔



خواتین صحافیوں کو ہراساں کرنے کے الزامات

پاکستانی خواتین صحافیوں نے الزام لگایا ہے کہ منظم مہم کے ذریعے انہیں سوشل میڈیا پر ٹرولنگ اور ہراساں کیے جانے کا سامنا ہے۔بعض خواتین صحافیوں نے ایک مشترکہ بیان جاری کیا ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ حکومت پر تنقید کی بنیاد پر ان پر سوشل میڈیا پر حملے کیے جاتے ہیں اور ٹرولنگ کے باعث ان کے لیے پیشہ ورانہ فرائض انجام دینا ناقابل یقین حد تک مشکل ہو گیا ہے۔بیان میں کہا گیا ہے کہ تحریک انصاف کے حامیوں سے وابستہ اکاؤنٹس کے ذریعے خواتین صحافیوں کی سوشل میڈیا پر ٹرولنگ کی جاتی ہے۔وزیر اعظم کے ڈیجیٹل میڈیا کے فوکل پرسن ارسلان خالد نے کہا ہے کہ تحریک انصاف آن لائن ہراساں کرنے اور غلط خبروں کی روک تھام کے لیے دیگر سیاسی جماعتوں اور صحافیوں کے ساتھ مل کر حکمت عملی مرتب کرنے کے لیے تیار ہے۔



کئی عالمی صحافتی تنظیمیں عرصہ دراز سے پاکستان کو صحافت کے لیے خطرناک ملک قرار دیتی رہی ہیں اگرچہ گزشتہ سالوں میں صحافیوں کو درپیش خطرات کی نوعیت تبدیل ہوتی رہی ہے۔پاکستان میں حکومت یا ریاستی اداروں کے ناقد سماجی کارکنوں یا صحافیوں کے خلاف سوشل میڈیا پر منظم مہم کی شکایات عام ہیں جب کہ کئی خواتین صحافیوں کا یہ بھی گلہ رہا ہے کہ ان کے بارے میں غیر شائستہ الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔صحافیوں کے حقوق سے متعلق کام کرنے والی غیر سرکاری تنظیم ''میڈیا میٹرز فار ڈیموکریسی'' نے گزشتہ سال نومبر میں اپنی ایک رپورٹ میں بتایا تھا کہ آن لائن ہراساں کیے جانے کے واقعات سے 95 فی صد خواتین صحافیوں کا کام متاثر ہوا ہے۔رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ہراساں کیے جانے اور دھمکیوں سے تنگ آ کر کئی خواتین نے خود ساختہ سینسر شپ لاگو کر لی ہے۔

خواتین کی جانب سے جاری کیے گئے مشترکہ بیان میں کہا گیا ہے کہ خواتین صحافیوں اور تجزیہ کاروں کو حکومت مخالف رائے رکھنے پر ان کی ذاتی زندگی کو موضوع بحث لایا جاتا ہے جب کہ دھمکیوں کے علاوہ ان پر ملک دشمنی اور بدعنوانی کے الزامات بھی لگائے جاتے ہیں۔پروگرام اینکر غریدہ فاروقی کہتی ہیں کہ مشترکہ بیان جاری کرنے



کا مقصد خواتین کے آئینی حقوق کی جانب حکام کی توجہ مبذول کرانا ہے اور یہ اس قسم کے حملوں کی شکار تمام خواتین کی آواز ہے۔خواتین صحافیوں نے ہراساں کیے جانے پر مشترکہ بیان میں حکومت سے درخواست کی ہے کہ آن لائن ٹرولنگ کرنے والے تمام اکاؤنٹس کو بند کیا جائے اور ملوث لوگوں کے خلاف کارروائی کی جائے۔خواتین صحافیوں نے اپنے آئینی حقوق کا حوالہ دیتے ہوئے وفاقی وزیر انسانی حقوق شیریں مزاری اور پارلیمنٹ کی انسانی حقوق کمیٹی سے مطالبہ کیا ہے کہ اس معاملے کا نوٹس لے کر کارروائی کریں۔شیریں مزاری کا ایک ٹوئٹ میں کہنا تھا کہ حقائق کی بنیاد پر تنقید صحافی کا کام ہے۔خواتین صحافیوں کو ان کی تنقید کی وجہ سے نشانہ بنانا اور انہیں ہراساں کرنا بالکل بھی قابل قبول نہیں ہے۔شیریں مزاری نے وفاقی وزیر اطلاعات سینیٹر شبلی فراز پر زور دیا ہے کہ وہ جلد از جلد صحافیوں کے تحفظ کے لیے تجویز کردہ قانون سازی ''جرنلسٹس پروٹیکشن بل'' پر کام کرائیں۔

مسجد الحرام اور مسجد نبویؐ میں 10 خواتین اعلیٰ عہدوں پر تعینات

سعودی عرب نے مسجد الحرام اور مسجدِ نبوی میں 10 خواتین کو اعلیٰ عہدوں پر تعینات کر دیا ہے۔مکہ اور مدینہ کی دونوں مساجد سے متعلق امور چلانے والے ادارے نے اپنے ایک بیان میں کہا ہے کہ خواتین کو مساجد کے انتظامی اور تکنیکی محکموں میں تعینات کیا گیا ہے۔بیان میں کہا گیا ہے کہ خواتین کی بھرتیوں کا مقصد تعلیم یافتہ اور اہل خواتین کو خود مختار بنانا ہے۔سعودی عرب کے مقامی میڈیا کے مطابق ان دونوں مساجد میں اس سے قبل 2018 میں 41 خواتین کو اعلیٰ انتظامی عہدوں پر تعینات کیا گیا تھا۔خواتین کی مختلف محکموں میں بھرتیاں سعودی ولی عہد شہزادہ محمد بن سلمان کے اقتصادی اور سماجی ویژن 2030 کا حصہ ہے جس کا مرکزی نکتہ ملکی معیشت کا تیل پر انحصار کم سے کم کرنا اور سعودی عرب کو ایک روشن خیال معاشرے کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کرنا ہے۔سرکاری اعداد و شمار کے مطابق 2019 کی تیسری سہ ماہی میں سعودی عرب میں ''ورکنگ ویمن'' کی تعداد 10 لاکھ سے زائد تھی۔2015 میں یہ تعداد آٹھ لاکھ 16 ہزار تھی۔

سعودی عرب میں کی جانے والی حالیہ اصلاحات کے بعد خواتین کو ڈرائیونگ کی اجازت بھی مل گئی جب کہ ملک میں سنیماؤں کے قیام اور پبلک مقامات پر مخلوط تقریبات کی اجازت بھی دے دی گئی ہے۔سعودی حکومت نے گزشتہ برس اکتوبر میں خواتین کو فوج میں بھی بھرتی کرنے کی اجازت دے دی تھی۔خواتین اب سعودی عرب کی رائل آرمی، رائل ایئر فورس، نیوی، ایئر ڈیفنس اور فوج کے شعبہ میڈیکل میں سپاہی، کارپورل، ڈپٹی سارجنٹ اور سارجنٹ کی آسامیوں کے لیے درخواستیں دے سکتی ہیں۔

سیارہ کچن کارنر

جویریہ کامران



خواتین قارئین کی دلچسپی اور پسند کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے کھانوں کی تراکیب پر مبنی خصوصی سلسلہ شروع کیا ہے جس میں آسان مگر معیاری اور نئی تراکیب پیش کی جائیں گی۔ ان تراکیب پر عمل کر کے نہ صرف آپ اپنے گھر والوں کو نت نئے ذائقہ دار کھانے فراہم کرسکتی ہیں بلکہ روایتی ڈشز پکانے کی بوریت سے بھی نجات حاصل کرسکتی ہیں۔ ہماری کوشش ہوگی کہ آپ کو بہترین تراکیب فراہم کرسکیں۔ اس سلسلے میں آپ ہمیں اپنی تجاویز اور آراء سے آگاہ کرتے رہیے۔ نیز آپ ہمیں خود بھی نئی اور معیاری تراکیب لکھ کر بھیج سکتی ہیں جنہیں آپ کے نام کے ساتھ شائع کیا جائے گا اور بہترین ترکیب پر اعزازی شمارہ بھی آپ کو ارسال کیا جائے گا!



email:sayyaradigest@gmail.com

www.facebook.com/sayyaradigest

ٹی بون سٹیک



سٹیک بنانے کے اجزاء: ٹی بون سٹیک 2عدد، کھانے کا تیل آدھا کپ، سویا سوس 2 کھانے کے چمچ، ووسٹر شائر سوس 2 کھانے کے چمچ، لہسن پیسٹ 1 کھانے کا چمچ، پیاز پاؤڈر آدھا کھانے کا چمچ، براؤن شوگر 1 کھانے کا چمچ، کٹی لال مرچیں آدھا کھانے کا چمچ، کالی مرچ پاؤڈر 1 چائے کا چمچ، مسٹرڈ سوس 1 اور آدھا کھانے کا چمچ، لیموں کا رس 2 کھانے کے چمچ، خشک روزمیری 1 چائے کا چمچ، ساتے ویجی، مکھن 2 کھانے کے چمچ، گاجریں 4عدد، نمک حسب ذائقہ، کالی مرچ 1 چٹکی، بروکولی 1 چوتھائی کپ، بے بی کارن 1 چوتھائی کپ، سبز پھلیاں 1 چوتھائی کپ،

کریمی مشروم سوس بنانے کے اجزاء: مکھن 2 کھانے کے چمچ، پیاز 1 چوتھائی کپ، مشروم آدھا کپ، پانی آدھا کپ، لہسن پاؤڈر آدھا چائے کا چمچ، سفید مرچ پاؤڈر آدھا چائے کا چمچ، کریم آدھا کپ

سٹیک ترکیب: ایک باؤل میں سویا سوس، ووسٹر شائر

سوس، لہسن، پیاز پاؤڈر، براؤن شوگر، کٹی لال مرچیں، کالی مرچ، مسٹرڈ پیسٹ، لیموں کا رس اور خشک روز میری ڈالکر اچھی طرح مکس کر لیں۔ اس مکسچر کو سٹیک پر ڈالیں اور دو سے چار گھنٹے میرینیٹ کے لئے رکھ دیں۔ پھر ایک گرل پین کو گرم کریں اور سٹیک کو ہر سائیڈ سے چار منٹ تک پکا لیں۔

ساتے ویجی ترکیب: ایک پین میں مکھن پگھلا کر اس میں گاجریں، بروکولی، بے بی کارن اور سبز پھلیاں ڈال کر اس پر نمک اور کالی مرچ چھڑک دیں۔

مشروم سوس ترکیب: ایک پین میں مکھن پگھلا کر اس میں پیاز ڈالیں اور بھون لیں۔ اب اس میں مشروم ڈال کر دو سے تین منٹ پکائیں اور پانی ڈال کر دو سے تین منٹ ابلنے دیں۔ پھر اس میں لہسن پاؤڈر، نمک اور سفید مرچ ڈال کر اچھی طرح مکس کرلیں۔ اب اس میں کریم ڈالیں اور دو سے تین منٹ پکا کر چولہا بند کردیں۔ مزیدار سٹیک کو ساتے



ویجی اور اس پر مشروم سوس ڈال کر سرو کریں۔

تندوری چکن پاستا

تندوری مصالحہ بنانے کے اجزاء: روسٹ کی ہوئی ثابت لال مرچیں 10-12 عدد' کالا زیرہ 1 کھانے کا چمچ' سونف 1 چائے کا چمچ' روسٹ کی ہوئی لونگ آدھا کھانے کا چمچ' لیمن گراس 1 کھانے کا چمچ' خشک ادرک 1 چائے کا چمچ' روسٹ کی ہوئی دار چینی 1 عدد' روسٹ کی ہوئی کالی الائچی 1 عدد' بادیان 1 عدد' آم پاؤڈر آدھا چائے کا چمچ

چکن مرینیشن کے اجزاء: چکن بون لیس 1 کلو' تندوری مصالحہ 1.5 کھانے کا چمچ' نمک حسبِ ذائقہ' لیموں کا رس 1 کھانے کا چمچ' کھانے کا تیل 1 کھانے کا چمچ'

پاستا اُبالنے کے اجزاء: Pasta 2 کپ' کھانے کا تیل 2 کھانے کے چمچ' نمک حسبِ ذائقہ' پانی حسبِ ضرورت

پاستا کے اجزاء: کھانے کا تیل 2 کھانے کے چمچ' پیاز آدھا کپ' میرینیٹ کیا ہوا چکن 1 کلو' لہسن 1 کھانے کا چمچ' کیچپ آدھا کپ' پاستا سوس 3 کھانے کے چمچ' نمک حسبِ ذائقہ' کٹی لال مرچ 1 چائے کا چمچ' اوریگانو 1 چائے کا چمچ' پارسلی 1 چائے کا چمچ' اُبلا ہوا پاستا 2 کپ

تندوری مصالحہ ترکیب: ایک گرینڈر میں کٹی لال مرچیں، زیرہ، سونف، لونگ، کالی مرچ لیمن گراس، خشک ادرک، دار چینی، کالی الائچی، بادیان اور آم پاؤڈر ڈال کر تمام اجزا اچھی طرح گرینڈ کر لیں۔

پاستا ترکیب: ایک باؤل میں چکن کے پیس، تندوری مصالحہ، نمک، لیموں کا رس اور کھانے کا تیل ڈال کر اچھی طرح مکس کر کے تیس منٹ میرینیٹ کے لئے رکھ دیں۔ اب ایک دوسرے پین میں پانی، نمک، کھانے کا تیل اور پاستا ڈال کر اسی فیصد پکنے تک پکائیں۔ پھر ایک پین میں کھانے کا تیل گرم کر کے اس میں پیاز ڈال کر ایک منٹ بھون لیں۔ اب اس

میں لہسن ڈال کر ایک منٹ بھون لیں۔ پھر اس میں میرینیٹ کیا ہوا چکن ڈال کر اچھی طرح پکنے تک پکائیں۔اب اس میں کیچپ، پاستا سوس، نمک، کٹی



لال مرچیں،اوریگانو اور پارسلی ڈال کر چار سے پانچ منٹ پکائیں۔پھر آخر میں اس میں ابلا ہوا پاستا ڈال کر اچھی طرح مکس کریں جب تک پاستا سوس میں اچھی طرح کوٹ ہوجائے۔اب اس پاستا پر پارسلی اور کالا زیتون سے گارنش کرکے سرو کریں۔

چکن تکہ گریوی ود رائس

ہانڈی بنانے کے اجزاء: مغلائی تکہ 515 گرام' کھانے کا تیل 2 کھانے کے چمچ' کٹا ہوا پیاز 1 کپ' زیرہ 1 چائے کا چمچ' ادرک لہسن پیسٹ 1 کھانے کا چمچ' پسے ہوئے ٹماٹر 1 کپ' نمک حسب ذائقہ' ہلدی 1 چائے کا چمچ' لال مرچ پاؤڈر 1 چائے کا چمچ' کٹی لال مرچیں 1 چائے کا چمچ' دھنیا پاؤڈر 1 چائے کا چمچ' زیرہ پاؤڈر 1 چائے کا چمچ' دہی 2 کھانے کے چمچ' مکھن 1 کھانے کا چمچ' کریم آدھا کپ' سبز مرچیں گارنش کے لئے' تازہ دھنیا گارنش کے لئے'

چاول بنانے کے اجزاء: بھگوئے ہوئے چاول 1 کپ' کھانے کا تیل 2 کھانے کے چمچ' پیاز آدھا کپ' سبز مرچیں 2 عدد ادرک لہسن پیسٹ 1 چائے کا چمچ' زیرہ آدھا چائے کا چمچ' نمک حسب ذائقہ

مغلائی تکہ ہانڈی ترکیب: پیکٹ پر دی گئی ہدایات کے مطابق مغلائی تکہ تیار کرلیں اور سائیڈ پر رکھ دیں۔اب ایک پین میں کھانے کا تیل گرم کرکے اس میں پیاز ڈالیں اور دو سے تین منٹ پکائیں۔پھر اس میں زیرہ اور ادرک لہسن پیسٹ ڈال کر ایک نمٹ بھون لیں۔اب اس میں پسے ہوئے ٹماٹر، ہلدی، لال مرچ پاؤڈر، کٹی لال مرچ، دھنیا پاؤڈر اور زیرہ پاؤڈر ڈال کر تین سے چار منٹ پکائیں۔پھر اس میں دہی ڈال کر دو سے تین منٹ درمیانی ہلکی آنچ پر پکائیں (اگر ضرورت ہو تو پانی بھی ڈالیں)۔اب اس کو اچھی طرح بلینڈ کرکے پیسٹ بنالیں اور اس پیسٹ کو دوبارہ پین میں ڈال کر مکھن ڈالیں اور اچھی طرح مکس کرلیں۔

پھر اس میں تیار کیا ہوا مغلائی تکہ ڈالیں اور دو سے تین منٹ پکائیں۔اب اس پر سبز مرچیں، دھنیا اور مغلائی تکہ ہانڈی ڈال کر سائیڈ پر رکھ دیں۔

چاول بنانے کی ترکیب: ایک پین میں کھانے کا تیل گرم کرکے اس میں پیاز ڈال کر کر ایک منٹ بھون لیں۔اب اس میں ادرک لہسن پیسٹ، زیرہ، سبز مرچیں اور نمک ڈال کر ایک منٹ پکائیں (اگر ضرورت ہو تو پانی بھی ڈالیں)۔پھر اس میں بھگوئے ہوئے چاول، ایک کپ پانی ڈال کر درمیانی ہلکی آنچ پر اُبلنے دیں۔جب پانی تقریباً خشک ہوجائے تو ڈھکن سے ڈھک کر ہلکی آنچ پر چار سے پانچ منٹ پکنے دیں۔مزیدار چاول تیار ہیں، مغلائی تکہ ہانڈی کے ساتھ سرو کریں۔

اگست کا مہینہ آزادی کا مہینہ!!!

اللہ پاکستان کو تا قیامت قائم و دائم رکھے۔ یہاں اسلام کا بول بالا ہو اور امن و محبت سے یہ آشیاں مہکتا رہے۔ آمین

بات خوشبو کی کریں بات ستاروں کی کریں
آؤ اس دیس میں اب بات بہاروں کی کریں

بات طوفان کی منجدھار کی کرنی ہی نہیں
بات ساحل کی کریں بات کناروں کی کریں

کیوں ہیں مایوس سخن ور، سخن آشفتہ ہے
کیوں نہ اب گفتگو اُمید کے دھاروں کی کریں

جن کے لہجے سے ہی مٹی کی مہک آتی ہے
آؤ کہ بات انہیں جان نثاروں کی کریں

کونپلیں پھوٹتی ہیں روشنی ہے سبزہ ہے
پھر کیوں اس ملک میں بس بات شراروں کی کریں

وہ جو دنیا کی نگاہوں سے ہیں دھندلا سے گئے
اب کہانی جو کریں ایسے نظاروں کی کریں

(اسماء جلیل قریشی)



بزمِ شاعری



حمدِ باری تعالیٰ

م جدھر دیکھیں تُو ہی تُو نظر آتا ہے
ر شے پہ تیرا ہی نام لکھا نظر آتا ہے
ہی دوست، مشکل کشا و رہبر ہے
ندگی کی راہوں میں رہنما تُو ہی نظر آتا ہے
رے آقا! اے دو جہاں کائنات کے والی
یں ہر سو تیرا ہی جلوہ نظر آتا ہے
(مریم ماہ منیر۔لاہور)

غزل

چہرہ دکانِ حسن سے چمکا کے آیئے
ڈنٹ اس کے پھر کریم کی تہہ میں چھپایئے
زلف دراز دورِ قدامت کی یادگار
بازار حسنِ نو کی طلب میں کٹایئے
تحصیل علم پر نہیں سندات کا حصول
کچھ اور بھی ذرائع ہیں کیوں سر کھپایئے
منصب کے حسب حال فرائض سے کیا غرض؟
افسر کے کام آیئے مسکہ لگایئے
شعر و سخن کی پستی محفل کے دور میں
اپنا ضمیر بیچئے طبلہ بجایئے
لیلیٰ غریب سے کہو صحرائے نجد میں
قیس اَب درِ ادارۂ خواتین ہے آیئے
پست قامتی پہ آپ نہ شرمائیں جی حضور!
سینڈل کی اونچی ''ہیل'' پر لہرا کے جایئے
فرہاد سخت کوشش کو دیتا تھا مشورہ
شیریناں ہزار ہیں فلموں میں آیئے
خطرہ ہو سرحدوں پہ تو دشمن کی فوج کو
کافی ہیں اپنی فلموں کے ''سلطان راہیئے''
گیسو کہاں حلیم کہ سایۂ نصیب ہو
گردن پہ آپ اپنی ہی زلفیں بڑھایئے
(قاضی حلیم فضلی۔مانسہرہ)

☆

ہم راہِ عشق پہ چلنے لگے
دل کو غم سے بھرنے لگے
ان کا جلال دیکھ کر یارو!
سورج بھی سرِشام ڈھلنے لگے
نامہ بر کہاں کھو گیا ہے
ہم انتظار میں مرنے لگے
وہ عادت سے مجبور ہیں کیا
جو محبت میں بھی لڑنے لگے
وقت کے فرعون سے کون ٹکرائے
سب اپنی ہی فکر کرنے لگے
رات بھر بدر تڑپاتے ہو
سحر ہوتے ہی کیوں ڈھلنے لگے
(سید بدر سعید۔لاہور)

غزل

لاچار ہو گئے ہیں اپنی بے بسی سے ہم

دل دے بیٹھے ہیں اپنی بے کسی سے ہم
تجھ سے محبت کیا کی کہ عادت ہی بن گئی
الفت رکھتے ہیں اب ہر کسی سے ہم
تجھ سے تو محبت ہم بڑھاتے ہی جاتے
اُکتا گئے ہیں تیری بے رُخی سے ہم
غم جدائی جاناں بھی ہو تو مزا اپنا ہے
سہہ لیتے ہیں ہر غم کو بھی اپنی خوشی سے ہم
عشق میں دھوکے ہی اتنے ملے کہ
بیزار ہو گئے ہیں اب ہر کسی سے ہم
چاہا تھا جس کو عمر بھر وہ تو مل نہ سکا جمالؔ
اب اور کیا اُمید رکھیں اپنی زندگی سے ہم
(حسیب جمال)

غزل

وہ وہاں اغیار کی محفل میں بیٹھے رہے
ہم یہاں شب بھر سُلگتے رہے تڑپتے رہے
حال دل سُنا نہ سکے ہم ان کو
وہ نا آشنا بنے رہے ہم عہد وفا یاد کرتے رہے
ہم غبار دل نہ نکال سکے
وہ ذکر اغیار ہی کرتے رہے کرتے رہے
ہمارے چمنِ دل کی کلیاں توڑ کر
وہ نزاکت سے مسلتے رہے کچلتے رہے
وردہ ہم ان کے ستم ہنس کر سہتے رہے
روز مرتے رہے جیتے رہے وہ نمک پاشی کرتے رہے
(وردہ سماوی۔لاہور)

غزل

پھر سے ملنے بہار آئی ہے
لینے میرا قرار آئی ہے
کیسے کہہ دوں بھلا دیا اس کو
دل میں کیوں بار بار آئی ہے
بعد مدت کے لوٹا گلیوں میں
یاد وہ بے شمار آئی ہے
مست مست انگڑائیاں لے کر
روپ اپنا نکھار آئی ہے
بادلوں کے حسین جھرمٹ میں
جیسے کوئی اشکبار آئی ہے
گنگناتی مخمور رہبروں میں
گیت میرے سنوار آئی ہے
(احمد علی شاہ مخمور)

☆

غزل

جیسے ہر لحظہ تیری دید کو میں ترسا ہوں
تیری قسمت میں وہی پیاس کا صحرا چمکے!
میری ہر سوچ نے بس تیرا پتہ مجھ کو دیا
میرے احساس کی حد پر ترا چہرہ چمکے
کل اندھیرے میں تری یاد چلی آئی یوں
جیسے تارا کوئی ٹوٹا ہو یا زہرہ چمکے
میں نے اس شوق میں آنکھیں ہی گنوا دیں اپنی
ایک لمحے کو وہ اقرا سنہرہ چمکے
میں نے اس آس پہ خنجر دیا انکو بڑھ کر
ان کے دامن پہ کوئی ایک تو قطرہ چمکے
شعر کہتا رہا یہ سوچ کے اب تک فیضان
بخت چمکا نہ میرا ان کا تو شہرہ چمکے
(فیضان عارف نیازی۔میانوالی)

☆

غزل

محبت صلح بھی، پیکار بھی ہے
یہ شاخ گل بھی ہے تلوار بھی ہے
طبیعت عشق کی خود دار بھی ہے

ادھر نازک مزاج یار بھی ہے
یہ فتنے جن سے اک دنیا ہے نالاں
انہیں سے گرمی بازار بھی ہے
غنیمت ہے کہ اس دور ہوس میں
ترا ملنا بہت دشوار بھی ہے
خبردار اے سبک ساران ساحل
یہ ساحل ہی کبھی منجدھار بھی ہے
جو کوئی سن سکے تو نکہت گل
شکست رنگ کی جھنکار بھی ہے
(کلام: جگر مراد آبادی۔ مرسلہ: نجمہ قیصر)

غزل

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوش قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے
کرتاہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوت مژگاں کئے ہوئے
پھر وضع احتیاط سے رکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کئے ہوئے
پھر گرم نالہ ہائے شرر بار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیر چراغاں کئے ہوئے
دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے
پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے
غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوش اشک ہے
بیٹھے ہیں ہم تہیہ طوفاں کئے ہوئے
(کلام: اسداللہ خان غالب۔ مرسلہ: روفی خان)

غزل

جہاں قطرے کو ترسایا گیا ہوں
وہیں ڈوبا ہوا پایا گیا ہوں
بلا کافی نہ تھی اک زندگی کی
دوبارا یاد فرمایا گیا ہوں
اگرچہ ابر گوہر بار ہوں میں
مگر آنکھوں سے برسایا گیا ہوں
سپردخاک ہی کرنا ہے مجھ کو
تو پھر کاہے کہ نہلایا گیا ہوں
کوئی صنعت نہیں مجھ میں تو پھر کیوں
نمائش گاہ میں لایا گیا ہوں
بقول برہمن قہر خدا ہوں
بتوں کے حسن پر ڈھایا گیا ہوں
مجھے تو اس خبر نے کھو دیا ہے
سنا ہے میں کہیں پایا گیا ہوں
حفیظ اہل زباں کب مانتے تھے
بڑے زوروں سے منوایا گیا ہوں
(کلام: حفیظ جالندھری۔ مرسلہ: زاہد یوسف)

غزل

ہر قدم مرحلہ دار و صلیب آج بھی ہے
جو کبھی تھا، وہی انساں کا نصیب آج بھی ہے
جگمگاتے ہیں افق پر تو ستارے لیکن
راستہ منزل ہستی کا مہیب آج بھی ہے
سر مقتل جنہیں جانا تھا وہ جا بھی پہنچے
سرمنزل کوئی محتاط خطیب آج بھی ہے
اہل دانش نے جسے امر مسلم مانا
اہل دل کے لئے وہ بات عجیب آج بھی ہے
یہ تری یاد ہے یا میری اذیت کوشی
ایک نشتر سا رگ جاں کے قریب آج بھی ہے
کون جانے یہ ترا شاعر آشفتہ مزاج
کتنے مغرور خداؤں کا رقیب آج بھی ہے

(کلام: ساحر لدھیانوی۔ مرسلہ: شیراز سلیم)

غزل

تمناؤں کی دنیا میں قدم دھرنے نہیں دیتی
جو کرنا چاہتا ہوں زندگی کرنے نہیں دیتی
کوئی صورت نہیں ہے زندگی سے بچ نکلنے کی
غم و آلام کے ماروں کو بھی مرنے نہیں دیتی
اندھیرا لاکھ ہو مجھ کو سحر کی آس رہتی ہے
یہی وہ روشنی ہے جو مجھے ڈرنے نہیں دیتی
کوئی موسم ہوا ن زلفوں کی خوشبو لے ہی آتی ہے
ہوائے شوق دل کے زخم کو بھرنے نہیں دیتی
خدا نے میرے اندر کیا خبر کیا چیز رکھ دی ہے
جو سمجھوتہ مجھے حالات سے کرنے نہیں دیتی
مجھے معلوم ہے وعدہ نبھانا سخت مشکل ہے
مری کم ہمتی انکار بھی کرنے نہیں دیتی
گزرتی رو بدلتی جا رہی ہے ایک اک شے کو
کسی شے سے مجھے الفت کا دم بھرنے نہیں دیتی

(جمیل یوسف)

غزل

سب سے چھپتے ہیں چھپیں مجھ سے تو پردا نہ کریں
سیر گلشن وہ کریں شوق سے تنہا نہ کریں
اب تو آتا ہے یہی جی میں کہ اے محو جفا!
کچھ بھی ہو جائے مگر تیری تمنا نہ کریں
میں ہوں مجبور تو مجبور کی پرسش ہے ضرور
وہ مسیحا ہیں تو بیمار کو اچھا نہ کریں
درد دل اور نہ بڑھ جائے تسلی سے کہیں
آپ اس کام کا زنہار ارادہ نہ کریں
شوق جب حسد سے گزر جائے تو ہوتا ہے یہی
ورنہ ہم اور کرم یار کی پروا نہ کریں
نور جاں کے لئے کیوں ہو کسی کامل کی تلاش
ہم تری صورت زیبا کا تماشا نہ کریں
حال کھل جائے گا بے تابی دل کا حسرت
بار بار آپ انہیں شوق سے دیکھا نہ کریں

(کلام: حسرت موہانی۔ مرسلہ: شاہد حسن)

☆☆☆☆☆

خاص اعلان

محترم قارئین! بزم شاعری میں آپ کی دلچسپی کے پیش نظر ادارہ نے ایک خصوصی سلسلہ شروع کیا ہے جس کے تحت ہر ماہ ایک خوش نصیب شاعر/شاعرہ کا تعارف بمعہ تصویر شائع کیا جائیگا۔ جو احباب اس سلسلہ میں شریک ہونا چاہتے ہیں وہ اپنی تازہ غزل/نظم، پسندیدہ شاعر کی غزل/نظم اور دیگر تفصیلات کے ساتھ درج ذیل کوپن پُر کر کے سیارہ ڈائجسٹ: 244 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور پر ارسال کریں۔

کوپن برائے اس ماہ کا شاعر

یہاں اپنی تصویر منسلک کریں

نام:............ تعلیمی قابلیت:............
عمر:............ پسندیدہ شاعر:............
پسندیدہ غزل/نظم:............
مشاغل:............ تاریخ پیدائش/برج:............
شادی شدہ/غیر شادی شدہ:............ پتہ:............
ای میل:............

نوٹ: اپنی پسند ناپسند، شاعری کی ابتدا، مزاج، اور دیگر تفصیلات الگ صفحے پر درج کر کے بھیجیے۔



انجام

حفیظ اختر

جامہ تلاشی لی گئی تو جیب سے صرف پندرہ سو روپے ملے۔کوئی شناختی ریکارڈ نہیں ملا صرف ایک کاغذ کا ٹکڑا ملا۔اے ایس آئی صاحب حیران تھے کہ کاغذ اور کرنسی نوٹ اپنی اصلی حالت میں ہیں پانی میں گیلے نہیں ہوئے تھے۔ کاغذ پر لکھا تھا ''نفیس مجھے اپنے دروازے کے سامنے دفن کرنا'' اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ملا۔

ایک جوڑے کی کہانی جسے ناکردہ گناہوں کی سزا ملی تھی

16 اپریل 2017ء کا دن بڑا چمکدار
ور خوشگوار تھا۔ بہار کا موسم تھا پھول اپنے نئے رنگ
یں تھے۔ درختوں پر بہار آئی ہوئی تھی۔ بڑا رنگین
ماں تھا۔ بارشیں زیادہ ہوئی تھیں اور چناب اپنی
وج میں تھا۔ اس دلکش موسم میں ایک 59 سالہ

بوڑھا ٹھٹھہ فقیر اللہ دریا کنارے چہل قدمی کر رہا تھا اور اپنے ہم رکاب ساتھیوں سے ٹیڑھے ٹیڑھے سوال کر رہا تھا۔ غصے کی کیفیت تھی صاف ظاہر تھا کہ دونوں کے درمیان کشیدگی پائی جاتی ہے۔ بوڑھا ایک سخت گیر انسان تھا لیکن اسے نباتات سے محبت

تھی وہ درختوں کو اپنا دوست کہتا تھا۔ اور ان سے حد درجے زیادہ پیار کرتا تھا۔ یہی پیار اسے آخری انجام تک لے گیا۔

بوڑھا حسب عادت تندو تیز جملے استعمال کرتا ہوا دریا کے کنارے سے گزر رہا تھا۔ لیکن وہ اپنے انجام سے بے خبر اور اپنے مستقبل سے لاعلم تھا جونہی وہ تلخ و ترش باتوں کے ساتھ پانی کے قریب سے گزرا موقع پا کر رانا اور سلیم نے دھکا دے کر اسے دریا میں گرا دیا۔ بوڑھا دریا میں غوطے کھانے لگا ایک دو آوازیں آئیں ''میں ڈوب رہا ہوں مجھے بچاؤ'' لیکن کون بچائے پانی کی تیز رفتاری نے اسے اپنے اندر چھپالیا۔ رانا اور سلیم کو یقین آ گیا کہ بوڑھا ڈوب گیا ہے اور اب بچنے کی کوئی امید نہیں تو دونوں اپنے اپنے موٹر سائیکلوں پر بیٹھ کر تیزی سے وزیر آباد شہر کی طرف آ گئے۔

دریا کے پل کے قریب چناب ہوٹل پر بیٹھ کر مچھلی کا آرڈر دیا۔ تھوڑی دیر خاموش رہے رانا کسی سوچ میں مبتلا تھا۔ سلیم نے مسکرا کر رانا سے کہا ''بڑے بڑے سٹینڈرڈ ڈھونڈ رہا تھا۔ بڑا تنگ کیا ہوا تھا۔ آج پہنچ گیا ہے اپنے دردناک انجام کو۔'' رانا نے منہ پر انگلی رکھی اور راز داری سے کہا ''خاموش رہو دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہیں راز افشا نہ ہوجائے۔'' رانا سنجیدہ آدمی تھا اور آنے والے وقت پر کڑی نگاہ رکھتا تھا۔ اس نے بڑے منصوبے کے ساتھ بوڑھے سے انتقام لیا تھا۔ بڑے بڑے اندیشے اس کے ذہن میں آ رہے تھے۔ اس پر خوف طاری تھا کہ کہیں پردہ چاک نہ ہوجائے۔ کیونکہ چند راہ گیروں نے ان کی بوڑھے کے ساتھ تلخ کلامی کو دیکھا اور سنا تھا لیکن وہ بوڑھے کو جانتے نہیں تھے۔ رانا کو فکر لاحق تھا لیکن سلیم موٹی عقل کا انسان تھا اور صرف کرائے کا قاتل تھا اس لئے اسے کوئی فکر نہ تھی۔

رانا نے سلیم کو نصیحت کی کہ اپنے بیوی بچوں کو ہرگز نہ بتانا اور نہ ہی عزیز و اقارب سے ذکر کرنا راز رکھنا اگر بات کھل گئی تو ہمارے خلاف قتل کا مقدمہ درج ہوجائے گا جیلوں میں بڑی تکلیفیں ہوتی ہیں سزا بھی ہوسکتی ہے اور نوکری بھی جاسکتی ہے کیونکہ بڑا سنگین جرم ہے۔ ابھی گفتگو جاری تھی کہ بیرہ مچھلی لے کر کمرے میں داخل ہوا۔ دونوں چپ ہوگئے اور مزید بات کرنے سے گریز کیا۔

ادھر رانا اور سلیم چناب ہوٹل پر مزے کے ساتھ مچھلی کھا رہے تھے انہیں سکون نہیں تھا بلکہ ایک خوف طاری تھا ادھر بوڑھا چناب میں غوطے کھا رہا تھا تیز پانی اسے ٹھوکریں مار رہا تھا۔ ضربیں لگ رہی تھیں۔ سخت اذیت میں تھا زندگی اور موت کی کش مکش میں تھا نزاع کا عالم تھا۔ بوڑھے پر خوف طاری ہوا کہ شاید وقت آخر آ پہنچا ہے۔

بوڑھا اذیت میں تھا شاید قدرت کو اس پر ترس آ گیا' اچانک ایک نورانی چہرے والے بزرگ سامنے نمودار ہوئے اور انھوں نے بوڑھے کے ہاتھ پکڑ کر اوپر کھینچ لیا۔ اب وہ تیز پانی کی ٹھوکروں اور ضربوں سے بچ گیا اور اذیت کی گھڑی گزر گئی۔ اب اسے قدرے سکون ملا تو وہ چند منٹ پہلے والی اذیت کو مکمل طور پر بھول گیا۔ وہ اس راز سے بے خبر تھا کہ کچھ دیر بعد اس نے اس دنیا کو چھوڑ دینا ہے اس کی موت کی گھڑی قریب ہے۔ شاید اسے علم ہوتا تو وہ توبہ کر لیتا وہ غفلت اور گمراہی میں ڈوبا ہوا تھا۔

نورانی چہرے والے بزرگ بوڑھے کو اُٹھا کر

دریا میں لیے جا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ بیلا بھگوان پورہ پہنچ گئے۔ یہ بیلہ کسی ہندو کے نام پر ہے۔ ابھی بھی اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔ بیلے کا رقبہ اب سرکاری ہو چکا ہے اور اب گورنمنٹ پنجاب کی ملکیت ہے۔ بیلے کے دوسری جانب آبادی ہے آبادی کے کونے پر شہر خاموشاں ہے۔ آبادی کے اندر ہر قسم کی بدعت موجود ہے شراب خانے اور زنا خانے چل رہے ہیں۔ طریقت اور شریعت نہیں ہے۔ قتل و غارت عام ہے انسانیت کو پامال کیا جا رہا ہے۔ ہر کوئی اپنے اپنے کام میں مصروف کار اور نفسا نفسی کا عالم ہے۔ اور صرف دنیا میں زندہ رہنا ہی ایک مقصد سمجھا جاتا ہے۔ بزرگ بوڑھے کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا کہ دنیا ایک گمراہی اور فتنہ ہے یہاں کیا دل لگانا۔ نورانی چہرہ بزرگ نے آبادی کی طرف نفرت کی نگاہ سے دیکھا اور آگے کی طرف چل پڑے۔

بزرگ اب بوڑھے کو دریا میں لے کر اگلی منزل کی طرف رواں دواں تھے۔ بوڑھے کو نورانی ہاتھوں پر اٹھایا ہوا تھا۔ پانی سبک رفتاری سے چل رہا تھا۔ دن ڈھل گیا تھا پہلے جیسی شدت نہ تھی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آ رہے تھے۔ موسم سہانا تھا اس پرسکون ماحول اور دلفریب فضا میں وہ دونوں کوٹ بیلہ پہنچ گئے۔ دریا کے دائیں جانب کوٹ بیلہ ہے اور یہ سرکاری جنگل ہے جبکہ دریا کے بائیں جانب آبادی ہے جو کوٹ کے نام سے پکاری جاتی ہے۔ آبادی کے اندر تھوڑی بہت انسانیت موجود ہے اور یہاں ایک مسجد بھی بنی ہوئی ہے دریا کے دائیں جانب جو بیلہ جنگل ہے اس پر گورنمنٹ پنجاب کا کنٹرول ہے۔ بیلہ دریا میں لائی ہوئی مٹی کو کہتے ہیں۔ یہ سیلاب زدہ علاقہ ہوتا ہے کبھی خشکی میں اس کی زمین کا رقبہ بڑھتا ہے اور کبھی زمین کٹاؤ کا شکار ہوتی ہے۔

ایک بات جو دیکھنے میں آئی کہ بیلے کے اندر محفوظ جگہ پر سرکاری کوارٹر بنا ہوا تھا۔ کوارٹر کے ساتھ ایک خوبصورت باغ تھا باغ میں گلاب، چنبیلی، رات کی رانی کے علاوہ انوکھے رنگ کے پھول اُگائے ہوئے تھے جن کی خوشبو گردونواح میں دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔ بوڑھا ماحول سے مانوس ہوا اس کا دل تڑپ اُٹھا، پکار کر بولا ”مجھے یہاں رہنے دو یہاں بسنے دو۔ یہ دنیا بڑی دلکش ہے۔“

بزرگ نے بوڑھے کو ہلا کر کہا ”یہ دنیا بڑی دلفریب ہے اس کا جال بڑا سخت ہے جو اس میں پھنس گیا نکلنا دشوار ہے۔“ بزرگ معرفت کے ساتھ ہم کلام تھا لیکن بوڑھا مستقبل سے بے خبر تھا۔ بزرگ نے مسکرا کر بوڑھے سے کہا ”دنیا سے حد سے زیادہ لگاؤ باعث تباہی ہے۔“ لیکن اس جگہ میں اتنی کشش تھی جو بوڑھے کو یہاں ٹھہرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ بالآخر وہ یہاں سے چل پڑے۔ بوڑھا حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا رہا۔

بزرگ اور بوڑھا ہم رکاب دریائی سفر میں تھے۔ وہ بیلہ رُخ سنگھ پورہ پہنچ گئے۔ بوڑھا نورانی ہاتھوں میں لطف اندوز ہو رہا تھا لیکن آنے والے وقت سے بے خبر تھا۔ بیلہ رُخ سنگھ پورہ میں بوڑھے کو ایک نئی کیفیت سے دوچار ہونا پڑا۔ کوٹ بیلہ پھول کی ایک سیج تھی اس کے برعکس بیلہ رُخ سنگھ پورہ میں کانٹے تھے، یہاں خاردار جھاڑیاں تھیں۔ دریا کے بائیں جانب آبادی تھی۔ آبادی کے کچھ فاصلے پر ایک خوبصورت گراؤنڈ بنا ہوا تھا۔ بزرگ نے ایک گروہ کی طرف اشارہ کیا جہاں منافقوں کا

چٹھہ سردار اپنے منافق ٹولے کو لیکچر دے رہا تھا۔ کرسیوں پر کلاس بیٹھی ہوئی تھی سامنے تختہ سیاہ تھا۔ یہ گیارہ کی کلاس تھی جس میں دو داڑھی والے منافق تھے۔ منافقوں کا سردار منافقت کے اصول اور طریقے بتا رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا ''جس طرح کسی ریاست کے چار عناصر ہوتے ہیں آبادی' علاقہ' حکومت اور اقتدار اعلیٰ' اسی طرح منافقت کے چار عناصر ہوتے ہیں۔ بے ایمانی' دھوکہ دہی' فریب اور فراڈ'' سردار چٹھہ صاحب تختہ سیاہ پر ہر عنصر کے بارے میں تفصیل کے ساتھ وضاحت کررہے تھے۔ بے ایمانی کے بارے میں بتا رہے تھے کہ جھوٹی قسم کھا کر یقین دلانا لیکن بات کا سچ نہ ہونا بے ایمانی کہلاتی ہے۔ دھوکہ دہی کے بارے میں بتا رہے تھے بلند دعویٰ کر کے وعدہ کرنا لیکن نیت میں پورا نہ کرنے کا عزم رکھنا دھوکہ دہی کہلاتی ہے۔ فریب کے بارے میں بتا رہے تھے کہ اپنے آپ کو ایک پارسا اور باکردار ظاہر کر کے دوسرے کو اپنے جال میں پھنسا لینا فریب کہلاتا ہے۔ جبکہ فراڈ کے بارے میں سردار صاحب نے بتایا کہ بھاری منافع بتا کر دوسرے کو نقصان دینا فراڈ کہلاتا ہے۔ سردار چٹھہ صاحب بڑے جوش کے ساتھ لیکچر دے رہے تھے کہ ایک داڑھی والے منافق نے کھڑے ہوکر کہا کہ ''جناب والا ذرا فراڈ کے بارے میں وضاحت کے ساتھ سمجھا دیں میں اس میں دلچسپی لیتا ہوں کہ فراڈ کرنے کے لئے کیا طریقہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔''

چٹھہ صاحب سیخ پا ہوگئے کہا ''بیٹھ جاؤ ابھی تک تم فراڈ کے بارے میں نہیں سیکھ سکے ہو۔'' پھر پہلو بدل کر کہا ''کتنی نالائق کلاس ہے کتنی وضاحت کے ساتھ فراڈ کے بارے میں سمجھایا ہے کتنی مغز کھپائی کی ہے لیکن ان کو سمجھ نہیں آتی ہے۔ اتنی گندی کلاس پہلے کبھی نہیں ملی ہے۔ ان کا اللہ حافظ ہے ان کا دماغ ہی نہیں ہے کوئی بات ان کو سمجھ نہیں آتی ہے۔'' سردار صاحب نے تیور بدلا ایک آنکھ کو بند کیا منہ پھیرا اور پھر کہا ''میری طرف دیکھو اور توجہ سے سنو یوں سوئے نہ رہنا۔'' پھر بولے ''دیکھیں دریا کے پار میری ملکیتی زمین ہے کل صبح سویرے میں وہاں جاؤں گا۔ میری زمین کے ساتھ بیلہ رخ سنگھ پورہ کی سرکاری زمین ہے۔ اور سرکاری زمین کی حد بندی کے لئے سرکاری طور پر برجی بنی ہوئی ہے۔ میں برجی توڑ دوں گا اس کا نام ونشان مٹا دوں گا پھر وہی اینٹیں اُٹھا کر سرکاری رقبے کے اندر ایک نئی برجی بناؤں گا۔ اس کی ساخت پہلی برجی جیسی ہوگی۔ یہ بڑا ہاتھ صفائی کا کام ہے اس طرح برجی بناؤں گا کہ کسی کو ذرا بھی شبہ نہ گزرے۔ یہ کام مکمل ہونے کے بعد میں چپ نہیں بیٹھوں گا۔ بلکہ پٹواری سے مل کر نقشہ تبدیل کراؤں گا کیونکہ محکمہ کسی وقت نشاندہی کرائے تو دقت نہ پیش آئے۔ اس طرح میں تقریباً دو ایکڑ سرکاری رقبہ فراڈ کر کے اپنی زمین میں شامل کرلوں گا۔ یہ ہے فراڈ۔ اس طرح اور بے شمار فراڈ کئے جاتے ہیں۔'' سردار چٹھہ صاحب آنکھ بند کر کے مسکرائے۔

پھر کلاس سے مخاطب ہوکر کہا ''خدا سے فراڈ کرنا مشکل ہوتا ہے جبکہ دنیا والوں سے ہر فراڈ آسانی سے ہوجاتا ہے بشرطیکہ انسان میں وصف موجود ہو۔'' سردار صاحب کلاس کی طرف مشغول ہوئے تو بزرگ نے بوڑھے سے کہا کہ ''یہ شیطان کا ٹولہ ہے۔ خدا نے ان کے مقدر میں بُرائی لکھ دی ہے۔ جس طرح شیطان مخلوق کو برائی کی طرف

پھنساتا ہے اس طرح یہ گروہ برائی کا راستہ اختیار کر گیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی ذات کو دھوکہ دیتے ہیں راستے سے بھٹک گئے ہیں۔ دنیا میں منافقت کرتے ہیں لیکن اپنے انجام کو بھولے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے: انسان اپنی جان کو دھوکہ دیتا ہے لیکن وہ جانتا نہیں ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جو مقدر کے مارے اور انجام سے لاعلم ہیں۔ نہیں کیا معلوم ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے ان کی منافقت کب تک اس دنیا میں چلے گی۔ بزرگ نے ان پر لعنت بھیجی اور پھر آگے کی طرف چل پڑے۔ تھوڑی سی مسافت کے بعد شہر رسول نگر سے گزرے۔ یہ انگریزوں کے دور کا پرانا شہر ہے پرانی ساخت کا بنا ہوا ہے اس شہر نے ترقی نہیں کی ہے بلکہ تھوڑا بہت اجڑ گیا ہے کسی نے اس شہر کے بارے میں یہ کہا ہے

نہ پوچھو اختر ہم سے وہ نفیس ہے کیا چیز
اس پر آشوب شہر میں اسے چمکاتی رہیں راتیں

شہر رسول نگر سے کچھ مسافت پر زیر کاشت رقبہ ہے جو دریا کے قریب واقع ہے۔ بزرگ اور بوڑھا دریا میں آگے کی طرف جا رہے تھے ان کے سامنے ہرے بھرے کھیت تھے جہاں چیمہ زمیندار مزدوروں سے زمین تیار کرا رہا تھا۔ سخت مشقت کرا رہا تھا لیکن اجرت کم دیتا تھا۔ بوڑھے نے چیمہ زمیندار کو پہچان لیا اور کہا ”یہ جانی پہچانی شخصیت ہے۔“ بوڑھے اور چیمہ نے کئی بار جام کے چٹھہ سے علی پور چٹھہ تک اکٹھا سفر کیا تھا لیکن آج بوڑھا بات کرنے سے قاصر تھا اور چیمہ بھی جیسے بوڑھے کو بھول چکا تھا۔

وقت بڑی تیزی کے ساتھ اپنا رخ بدل لیتا ہے کل بوڑھا چیمہ زمیندار کو گھوماتا پھرتا رہا آج بات کرنے میں بے بس اور چیمہ پہچاننے سے قاصر۔ اسی لئے کہا جاتا ہے انسان حالات کا تابع ہوتا ہے نہ کہ حالات انسان کے۔ انسان بعض اوقات مجبور ہوتا ہے اس وقت اسے اپنی ناکامی اور خدا کی خدائی کا علم ہوتا ہے۔

بزرگ نے بوڑھے کو ایک کشتی دکھائی جس پر مرد عورتیں اور بچے سفر کر رہے تھے۔ ”یہ لوگ دریا میں ہی رہتے ہیں کوئی گھر ٹھکانہ نہیں ہے' مچھلیاں پکڑ کر کھاتے ہیں' ساحل پر کچھ وقت پڑاؤ کرتے ہیں گردونواح سے بھیک مانگ کر گزر بسر کرتے ہیں۔“ بزرگ نے بوڑھے سے کہا۔ ”یہ خدا کی بنائی ہوئی سفری مخلوق ہے' یہ اسی پر شاکر ہیں۔“ راستے میں بوڑھے کو وہ جگہ بھی دیکھنے کو ملی جہاں ایک سرکاری اہلکار نے گورنمنٹ کی سرکاری جگہ کاشت کیلئے پرائیویٹ کسان کو دے رکھی تھی۔ یہ تقریباً 4 ایکڑ رقبہ تھا اس کی آمدنی کی کثیر رقم خود ہضم کر جاتا تھا۔ پرلے درجے کا کرپٹ ملازم تھا' کرپشن اس کی رگوں میں رچی بسی تھی۔ اس کے قول وفعل میں تضاد تھا۔ بوڑھا اس پر ہاتھ ڈالنے والا ہی تھا کہ پانی میں گر پڑا اور آخری انجام تک پہنچ گیا۔ آج بوڑھے کی قلم بے حس وحرکت تھی قلم میں سیاہی ختم ہوگئی تھی' ہاتھوں میں جنبش نہ رہی تھی۔ شاید قلم پکڑنے کی طاقت نہ تھی' صرف ارمان تھے جو طوفان بن کر سامنے آ رہے تھے۔

بزرگ نے بوڑھے سے کہا ”یہ لکھائی کا وقت نہیں ہے بلکہ جدائی کا وقت ہے جو تیزی سے گزر رہا ہے اس وقت کچھ کر لیا جائے تو بہتر ہے۔“ بوڑھا کم بخت پھر بھی سمجھ نہ سکا۔ بزرگ اور بوڑھا بیچ دریا محو سفر تھے۔ آ گئے LIFT MARJAN BAN

کا ایریا تھا۔ یہ گورنمنٹ پنجاب کا سرکاری رقبہ ہے اس کے نزدیک دریا کے کنارے ویران علاقہ ہے آمدورفت کم ہے۔ کیکر اور شیشم کے درخت ہیں اور جھاڑیاں بھی موجود ہیں' خوف ناک علاقہ ہے' اکثر وارداتیں یہاں ہوتی ہیں۔

بزرگ رُک گئے' بوڑھا کیا منظر دیکھتا ہے کہ چار افراد ایک خوبصورت لڑکے کو لاتے ہیں۔ یہ لڑکا اندازاً 16 سالہ ہے' منہ پر رونق اور آنکھوں میں چمک ہے لیکن آج اُداسی چھائی ہوئی ہے۔ ان چار افراد میں دو پکی عمر کے اور دو نوجوان ہیں جن کے ہاتھ میں چھریاں ہیں۔ پکی عمر کے آدمیوں نے زور سے لڑکے کو پکڑا اور نوجوانوں نے لڑکے کو قتل کر دیا۔ وہ خوبصورت جسم زمین پر گر پڑا اور تڑپ تڑپ کر جان دیدی۔ روح پرواز کر گئی اور جسد خاکی زمین پر پڑا ہوا تھا۔ خون کے فوارے نکل رہے تھے خوبصورتی مدہم پڑ چکی تھی۔ سفید لباس پر خون کے دھبے پڑ گئے تھے۔ آدمی غائب ہو گئے اور لاش وہیں چھوڑ گئے۔ نہ جانے کیا خطا کی تھی کہ سفاک قاتلوں کے ہاتھ چڑھ گیا۔

بوڑھے نے جب یہ منظر دیکھا تو وہ مدد کے لئے لپکا لیکن ہلنے کی طاقت ہی نہ تھی۔ منہ سے آواز نکالی لیکن دُور تک نہیں گئی۔ بزرگ نے بوڑھے کے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا کہ خدا کا حکم اٹل ہوتا ہے موت کا وقت مقرر ہے اس میں ردوبدل نہیں ہوتا۔ تقدیر کے آگے تو زور نہیں چلتا۔

اب بزرگ بوڑھے کو لے کر بہروپ گڑھ کی طرف رواں دواں تھے۔ وقت نزع قریب تھا۔ آہ مگر وہ ناآشنا کمزور بوڑھا اپنے آخری انجام کے سفر پر گامزن تھا۔ اس نے زندگی میں بہت نشیب وفراز دیکھے لیکن آج کا نشیب وفراز انوکھا تھا۔ اب بزرگ اور بوڑھا بہروپ گڑھ پہنچ گئے۔ بزرگ بوڑھے کو کنارے کی طرف لے گئے۔ بوڑھا خوش تھا کہ باہر نکل کر فلاں فلاں آدمی سے انتقام لوں گا لیکن سوچیں خاک میں مل گئیں۔

اچانک بزرگ غائب ہو گئے اور ایک ڈراؤنی شکل سامنے آ گئی۔ نقشہ بہروپ گڑھ سامنے آ گیا اور وقت معین کی گھڑی آن پڑی۔ وقت نزاع آ گیا ادھر مولوی صاحب نے عصر کی اذان کے لئے اللہ اکبر کہا ادھر فرشتے نے جان قبض کرنا شروع کر دی۔ بوڑھے نے کلمہ شہادت کے لئے منہ ہلایا لیکن کلمہ نہ پڑھ سکا' توبہ کرنے کی کوشش کی لیکن دروازہ بند ہو چکا تھا۔ کم بخت چند منٹ پہلے کلمہ پڑھ لیتا اور گناہوں کی توبہ کر لیتا تو شاید کامیاب ہو جاتا اور گناہ معاف ہو جاتے لیکن بدنصیب کچھ نہ کر پایا اور یوں خالی ہاتھ دنیا سے چلا گیا۔

عین عصر کی اذان کا تھا اور نقشہ بہروپ گڑھ کا تھا ملک الموت نے مقرر وقت پر جان قبض کی۔ آج بوڑھا ایک اجنبی کی حیثیت سے دریا کے کنارے مرا پڑا تھا کوئی جاننے والا نہیں تھا۔ لاش لاوارث تھی شناخت کرنا مشکل تھا کفن نہیں تھا دفن کے لئے جگہ نہیں تھی۔ اب بوڑھا ایک زندہ انسان نہ تھا بلکہ ایک لاش دریا کے کنارے پڑی ہوئی تھی۔ ایک ماہی گیر اپنے لاڈلے بچے کو لے کر دریا کے کنارے مچھلیوں کی تاک میں چل رہا تھا کبھی دریا کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی بچے کو پیار دیتا تھا۔ اچانک اس کے بیٹے نے کہا ابا وہ دیکھو کیا چیز پڑی ہے؟ جب ماہی گیر کی نظر لاش پر پڑی تو وہ خوف زدہ ہو گیا۔ اس نے بے ساختہ کہا "یہ کسی انسان کی لاش ہے جو دریا میں بہہ



آپ کے دکھ درد کا ساتھی
شربتِ صدر اجملی
جب چلیں سرد ہوائیں
کھانسی، نزلہ، زکام ستائیں
تو لے آئیں۔۔۔اجمل کا شربت صدر
آبریشم، ملٹھی اور عناب کا حسین امتزاج
UNANI MEDICINE 120ml
AJMALI'
SHARBAT-e-
SADAR
For Cough & Cold
www.ajmal.pk
دواخانہ حکیم اجمل خان (پرائیویٹ) لمیٹڈ
فون: 042-35113378, 0307-3333238
ای میل: info@ajmal.pk
ویب: www.ajmal.pk

کرآئی ہے۔"

وہ لاش کے قریب گیا' ہاتھ لگایا تو جسم گرم تھا۔ اس نے سوچا کہ شاید زندہ ہے۔ اس نے نبض پر ہاتھ رکھا نبض نہیں چل رہی تھی' ناک پر ہاتھ رکھا سانس بھی نہیں چل رہی تھی۔ جب اسے یقین ہوگیا کہ آدمی مر گیا ہے تو وہ اس سوچ میں کھو گیا کہ یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ لاش پانی میں دُور سے بہہ کر آئی ہے تو جسم اتنا کیونکر گرم ہے؟۔ وہ مختلف خیال دل و دماغ میں دوڑانے لگا لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ اس نے کنارے سے ذرا ہٹ کر دو تین آدمیوں کو آوازیں دیں' تھوڑی دیر میں گردونواح سے لوگ اُمڈ آئے۔ ہر کوئی فکر میں تھا کہ ان کا کوئی رشتہ دار نہ ہو جب آس پاس سے تقریباً تمام لوگ آگئے ہر کسی نے شناخت کی مگر کوئی پہچان نہ سکا۔ جب یہ واضح ہوگیا کہ اپنا نہیں ہے بیگانہ ہے تو اب یہ قیاس آرائیاں ہونے لگیں کہ لاش کہاں سے بہہ کر آئی ہے؟ وہ کسی نتیجہ پر پہنچ نہیں سکے بالآخر نمبردار دیہہ کو بلایا گیا۔

نمبردار صاحب بڑی شان کے ساتھ آئے۔ نمبردار نے اردگرد سے دریافت کیا کوئی سراغ نہ ملا' مجبوراً نمبردار نے پولیس چوکی رسول نگر اطلاع دی کچھ دیر بعد پولیس کا ایک اے ایس آئی اور دو کانسٹیبل موقع پر آگئے۔ لاش کو اُلٹا سیدھا کیا گیا ملحقہ گاؤں میں اطلاع دی گئی کہ وہ لاش کی پہچان کریں۔ کافی کوشش کے باوجود کوئی سراغ نہیں ملا۔ بالآخر اے ایس آئی نے موقع کا نقشہ بنایا۔ لاش کا سارا حلیہ کاغذ پر لکھا لیکن کوئی ضرب تلاش نہ کر پائے جو تحریر میں لاسکیں۔ منہ پر کوئی شناخت والی علامت نہیں ملی اور نہ چہرے پر زخم کا نشان ملا جو خط تحریر میں لاکر پولیس کارروائی مکمل کی جاتی۔

جامہ تلاشی لی گئی تو جیب سے صرف پندرہ سو روپے ملے۔ کوئی شناختی ریکارڈ نہیں ملا صرف ایک کاغذ کا ٹکڑا ملا۔ اے ایس آئی صاحب حیران تھے کہ کاغذ اور کرنسی نوٹ اپنی اصلی حالت میں ہیں پانی میں گیلے نہیں ہوئے تھے۔ کاغذ پر لکھا تھا "نفیس مجھے اپنے دروازے کے سامنے دفن کرنا۔" اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ملا۔

بعض لوگوں نے رائے دی کہ لاش کا پوسٹ مارٹم کرایا جائے لیکن اے ایس آئی صاحب نے کہا کہ پوسٹ مارٹم کا کوئی فائدہ نہیں ہے خوامخواہ انسانی لاش کو چیرا پھاڑا جائے گا۔ پولیس میں کچھ لوگ اچھے ہوتے ہیں جو درد دل رکھتے ہیں۔ انسانیت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ پولیس میں یہ رواج عام ہے کہ تفتیشی افسر 95 فیصد ملزموں کی حمایت کرتے ہیں اسی وجہ سے معاشرے میں جرائم بڑھتے ہیں اگر ملزم کو یقین ہو کہ جرم کی سزا ملے گی تو وہ پھر جرم کرنے سے ڈرے گا لیکن ہر مجرم کو یقین ہوتا ہے کہ وہ بری ہو جائے گا۔ اس لئے وہ جرم سے گھبراتا نہیں ہے۔

بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ لاش کے بارے مسجد میں اعلان کیا جائے شاید کوئی راہ نکل آئے۔ مسجد میں اعلان ہوا ایک بوڑھے کی لاش دریا کے کنارے پڑی ملی ہے عمر اندازاً 60 سال کے قریب ہے۔ کمزور جسم کا آدمی ہے سفید کپڑے پہنے ہوئے ہے۔ لوگوں سے اپیل ہے کہ وہ آئیں اور لاش کی شناخت کریں۔ پولیس کا موقف ہے کہ اگر لاش کا کوئی وارث نہ ملا تو مجبوراً پولیس میت کو لاوارث قرار دیکر دفن کردے گی۔ کفن دفن کا انتظام پولیس نے اپنے ذمہ لے لیا ہے' بعد میں قبر کشائی کی اجازت نہ ہوگی۔

نفیس اپنی اہلیہ حسینہ کے ساتھ موٹر سائیکل پر قادر آباد میں مچھلی کھانے جارہا تھا۔ نفیس نے بادامی رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے جبکہ حسینہ سرخ رنگ کے جوڑے میں ملبوس تھی۔ اگر نفیس اپنی خوبصورتی میں بے مثل تھا تو پھر حسینہ بھی اپنے حسن میں لاثانی تھی۔ حسینہ اگر نفیس کے حُسن کی زنجیر میں جکڑی گئی تو پھر نفیس بھی اس کی زلفوں کا اسیر بن گیا۔ ان دونوں کی ملاقات شہر رسول نگر میں سرراہ ہوئی تھی۔ پہلی نظر میں ایک دوسرے کو پسند آ گئے۔ یہ وہ ملاقات تھی جس میں وہ ایک دوسرے کے ہوگئے۔ رات کو حسینہ کے تصور میں وہ خوبصورت چہرہ سمایا رہا تھا۔ وہ رات بھر جاگتی رہی اور اس نازک مزاج پری زادے کے خیال میں کھوئی رہی۔ جبکہ نفیس بھی حسینہ کی یاد کو سینے سے لگائے سوتا۔ وہ حسینہ کے بارے میں ہی خواب دیکھتا۔ وہ اس کے خوابوں کی شہزادی بن چکی تھی۔ اب وہ اسی کے خیال میں سوتا اور اسی کے تصور کو لیکر جاگتا۔

جب ایک دوسرے کے عشق نے انتہا کردی تو پھر دونوں کو دوبارہ ملنے کی آرزو ہوئی۔ دوسری ملاقات میں بہت سی منزلیں طے ہوئیں' بہت سے عہد وپیماں باندھے گئے آیندہ کی ملاقات کا تعین ہوا۔ پھر جب دونوں نے اپنی اپنی راہ لی تو ایک دوسرے کو حسرت بھری نظروں سے دیکھا۔ انتظار کے یہ دن بڑی مشکل سے گزرے۔

خوش قسمتی سے آسمان پر بھی یہ جوڑی پکی ہوچکی تھی' اس لئے تیسری ملاقات میں وہ شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ شہر رسول نگر میں کرائے کا مکان لیا اور وہ دونوں اس مکان میں رہنے لگے۔ نفیس ذرا دُور علاقے کا رہائشی تھا یہاں رسول نگر میں ملازمت کے سلسلے میں آیا اور یہیں کا ہوکر رہ گیا واپس جانے کا کبھی خیال نہ آیا۔

نفیس ایک خوبصورت اور باکردار لڑکا تھا جبکہ حسینہ ایک حسین وجمیل اور پاک دامن گھر کی چاردیواری میں رہنے والی لڑکی تھی۔ نفیس نے بی اے پنجاب یونیورسٹی سے کیا تھا اب وہ ایک سرکاری ملازم تھا جبکہ حسینہ نے بی اے زکریا یونیورسٹی سے کیا تھا اور اب وہ گورنمنٹ سکول میں استانی تھی۔

اُن دونوں کو حصول علم کا شوق تھا۔ اب وہ پرائیویٹ طور پر اردو میں ایم اے کررہے تھے۔ نفیس "غزل میں دلچسپی رکھتا تھا وہ غالب کی غزلیں بڑے شوق سے پڑھتا تھا جبکہ حسینہ ناولوں میں بہت دلچسپی لیتی تھی۔ وہ انگریزی ناول بھی پڑھتی تھی۔ اردو میں ڈپٹی نذیر احمد کے ناول اکثر پڑھتی تھی۔ وہ بعض اوقات ناول پڑھتے پڑھتے سو جاتی تھی۔ دونوں کو ادب سے لگاؤ تھا اس لئے ان کا چناؤ غزل اور ناول تھا۔ یہ اللہ کا بنایا ہوا پاکباز جوڑا جہاں حسن میں بے مثل تھا وہاں لوگ بھی ان پر رشک کرتے تھے۔

وہ امن اور پیار کے ساتھ شہر رسول نگر میں زندگی کے دن گزار رہے تھے۔ یہ ان کی زندگی کے بہترین دن تھے۔ انہیں کسی قسم کا فکر فاقہ نہ تھا۔ دونوں کتابیں شوق سے پڑھا کرتے تھے۔ اسی لیے ان کے علم میں بے حد وسعت آگئی تھی۔ ایک دن اس محاورے پر دونوں میں بحث چھڑ گئی' کجا مجنوں کجا لیلیٰ' کہاں غالب اور کہاں ذوق۔ نفیس کہتا تھا کہ غالب کا اشارہ مجنوں کی طرف ہے اور ذوق کا اشارہ لیلیٰ کی طرف ہے جبکہ حسینہ کا اصرار تھا کہ غالب کا اشارہ لیلیٰ کی طرف ہے۔

دونوں میں خوب بحث ہوئی بالآخر وہ اردو

ادب کے ماسٹر اور مایہ ناز بزرگ طاہر شاہ صاحب کے پاس گجرات چلے گئے۔ شاہ صاحب عالم فاضل تھے۔ اردو گرائمر اور شاعری میں عبور رکھتے تھے۔ وہ ایک بلند پایہ انسان تھے۔ جب دونوں شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا اپنا موقف تفصیل اور دلیل سے پیش کیا تو شاہ صاحب نے انہیں چائے پلائی اور بڑے مدبرانہ انداز میں مثال کے ساتھ وضاحت کی۔

شاہ صاحب نے کہا ''دیکھیں پہلے لفظ مجنوں اور بعد میں لیلیٰ آیا ہے' اسی طرح پہلے غالب کا نام آیا ہے بعد میں ذوق آیا ہے۔ اس لئے غالب کا اشارہ مجنوں کی طرف ہے جبکہ ذوق کا اشارہ لیلیٰ کی طرف ہے۔'' شاہ صاحب کی وضاحت پر دونوں قائل ہوگئے۔ شاہ صاحب نے انہیں بتایا کہ غالب ایک بلند پایہ اردو کے شاعر ہیں وہ اردو شاعروں میں نہ صرف بلند مقام رکھتے ہیں بلکہ وہ اردو شاعری میں سب سے بڑے شاعر ہیں۔ غالب دوسرے شاعروں سے الگ راہ پر چلتے تھے وہ تصور کی بلندیوں کو چھوتے تھے اور خیال کی گہرائیوں میں چلے جاتے تھے۔ ان کا انداز بیاں اپنا ہی تھا۔ ان کی شاعری سے ہر اہل ادب مستفید ہوا ہے۔ غالب سے اختلاف رکھنے والے بھی غالب کو دل میں تسلیم کرتے ہیں۔ اس لئے اردو شاعری میں غالب کا مقام اپنا ہے۔ شاہ صاحب کی مجلس سے دونوں فیض یاب ہوئے اور غالب کی شخصیت کا وسیع علم بھی حاصل ہوا۔

ادھر مسجد میں اعلان ہو رہا تھا ادھر خوبصورت جوڑا قادر آباد میں مچھلی کھانے جا رہا تھا۔ اعلان کی آواز ان کے کانوں میں پڑی تو نفیس نے موٹر سائیکل کو روک لیا۔ توجہ سے اعلان سُنا۔ حسینہ نے کہا ''چلو لاش دیکھ کر آتے ہیں شاید کوئی واقف ہو۔'' نفیس مسکرایا' نفیس کی یہ مسکراہٹ بوڑھے کو پسند تھی۔ نفیس نے کہا ''یہاں ہمارا کون جاننے والا ہوسکتا ہے وقت کی قلت ہے اگر ہم لاش دیکھنے گئے تو قادر آباد سے واپس آنے میں اندھیرا چھا جائے گا۔'' لیکن حسینہ بضد تھی کہ لاش دیکھنے ہر حال میں جائیں گے۔ درحقیقت وہ انسانی ہمدردی سے سرشار تھی۔ اس کے دل میں انسانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اسے دوسروں کی مدد کر کے دلی تسکین ملتی تھی۔ وہ خدا سے ڈرتی تھی' ایک غیبی خوف اس کے دل میں موجزن رہتا تھا۔

وہ مشرقی تہذیب کی جیتی جاگتی مثال تھی۔ پردہ نشین تھی پھر کلاس میں بھی ہر وقت مصروف کار رہتی تھی۔ وہ اپنے علم کو بکھیرتی تھی۔ مذکورہ بالا اوصاف کی بنا پر ہی اس کا ہمدردی کے جذبہ اُمڈ آیا تھا۔ اور نفیس سے اصرار کر رہی تھی کہ لاش کو دیکھیں گے یہ انسانیت کا تقاضا ہے۔

نفیس بھی حسینہ کے دل کے راز سے بخوبی واقف تھا' وہ حسینہ کی بات سے کیسے انکار کرسکتا تھا۔ اس نے موٹر سائیکل سڑک کے کنارے کھڑا کیا اور دونوں لاش کی طرف چل پڑے۔ جب دونوں لاش کے قریب پہنچے اور نفیس نے بوڑھے کو بے جان دیکھا تو اس کے منہ سے زور کی چیخ نکل گئی۔ وہ لرز گیا۔ لاش پر گرنے لگا تو حسینہ نے بمشکل اسے تھاما اور پوچھا ''یہ کون ہے؟ کیوں رو رہے ہو؟''

نفیس نے کوئی جواب نہیں دیا' اس کے منہ سے فریادیں نکل رہی تھیں ''تم یہاں کیسے آگئے ہو تمہیں کس نے مارا ہے؟''

حسینہ حیران تھی' بت بنی کھڑی تھی۔ وہ سوچ

رہی تھی آخر یہ کیا ماجرا ہے؟ نفیس بات کا جواب نہیں دے رہا' وہ بتاتا کچھ نہیں ہے مگر اس کے بلکنے سے صاف ظاہر ہے کہ بوڑھا اس کا کچھ لگتا ہے مگر آخر یہ کون ہے کہ نفیس مسلسل فریادیں اور آہیں منہ سے نکال رہا ہے۔ پولیس والے بھی نفیس سے پوچھ رہے تھے "لڑکے بتاؤ یہ کون ہے اور کس کی لاش ہے؟"

لیکن وہ کچھ نہیں بتا پا رہا تھا۔ یوں فضاؤں میں آہیں بکھیر رہا تھا کہ سب دیکھ کر دکھی ہو رہے تھے۔ نفیس غشی میں چلا گیا اور وہیں بے ہوش ہوگیا۔ مغرب کی اذان ہو چکی تھی۔ لوگ آہستہ آہستہ اپنے گھروں کی طرف جانے لگے۔ پولیس نے لاش اٹھائی اور چوکی کی طرف لے جانے لگے۔ پھر خیال آیا چوکی میں لے جا کر کیا کریں گے۔ یہاں دریا کے کنارے دفن کر دیں تو بہتر ہے۔

تقریباً تمام لوگ جا چکے تھے صرف تین راہ گیر رہ گئے تھے جنہوں نے پولیس کے کہنے پر انسانی ہمدردی کے طور پر قبر کھودی۔ میت کو قبر میں اُتارنے کی تیاری ہونے لگی۔ راہ گیروں میں سے ایک آدمی نے غسل دیا اور اسی آدمی نے جنازہ پڑھایا جبکہ اسکی امامت میں 5 افراد نے جنازہ پڑھا جن میں تین پولیس والے تھے اور دو راہ گیر۔ یوں بوڑھا دریا کے کنارے ایک ویرانے میں دفن ہوگیا۔

نفیس کو بے ہوش حالت میں ہسپتال پہنچایا گیا وہ رات بھر بے ہوش رہا۔ اگلے دن اسے ہوش آیا لیکن وہ اپنا دماغی توازن کھو چکا تھا۔ اس کی یادداشت ختم ہوگئی تھی وہ پاگل ہوگیا تھا۔ مکمل طور پر دیوانہ ہوگیا تھا۔ وہ کسی سے نہ کوئی بات کرتا تھا نہ کوئی بات بتاتا تھا اس پر جنوں کی کیفیت طاری تھی۔

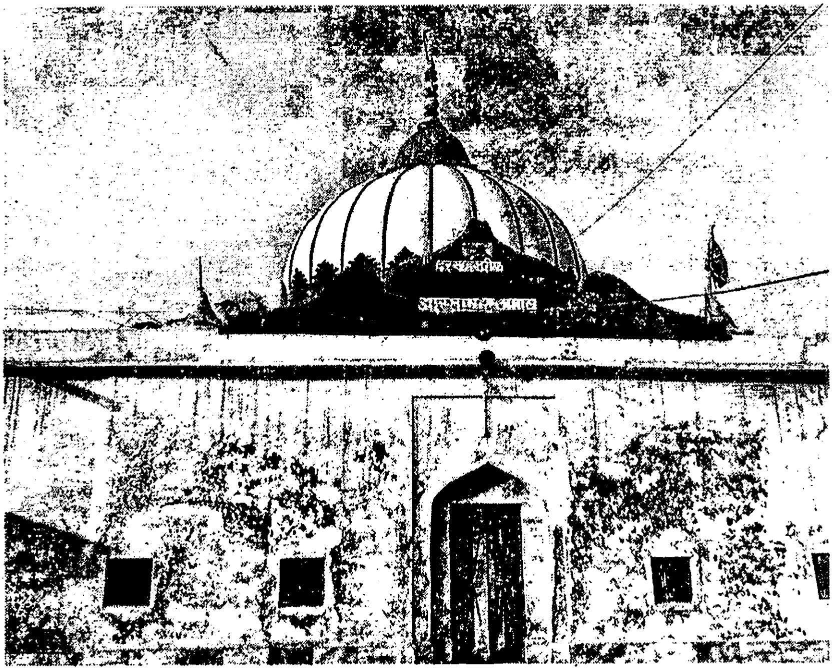
یوں دن گزرتے گئے نفیس گلیوں میں آوارہ اور دیوانہ پھرنے لگا۔ وہ دور دراز علاقے میں نکل جاتا رات کو سڑک کے کنارے پڑا رہتا اس کے کپڑے میلے اور پھٹے ہوئے ہوتے تھے۔ اس کی حالت ناگفتہ بہ ہوتی۔ اس کے خوبصورت اور نازک ہاتھ میلے ہوگئے تھے چہرے پر اب وہ خوبصورتی نہ رہی تھی۔ وہ ایک فقیر کی سی حالت میں نظر آتا۔

اب حسینہ کی بھی پہلی سی کیفیت نہ رہی تھی اس کی خوبصورتی بھی جیسے کہیں کھو گئی تھی۔ اب وہ سرخ خوبصورت قیمتی لباس نہیں پہنتی' سکول جاتی یا آتی یا کلاس لگاتی تو ہر وقت روتی رہتی۔ پڑھانے میں وہ ولولہ نظر نہیں آتا تھا جو پہلے نمایاں تھا۔ انداز میں بھی تبدیلی آگئی تھی۔ اب وہ غمگین رہتی جیسے کوئی خوف اس کا احاطہ کیے ہوئے ہو۔ نماز پڑھتی تو دعا میں روتی رہتی۔ پھر کہتی' اللہ کو یہی منظور تھا اللہ اکبر۔

اب حسینہ کا معمول تھا کہ صبح نماز پڑھتی' قرآن کی تلاوت کرتی' ہلکا سا ناشتہ کرتی اور پھر نفیس کے خوبصورت لباس کو استری کرنے لگتی۔ اس کے جوتے پالش کرتی اور پھر سکول چلی جاتی۔

ایک دن پھر نفیس اور حسینہ کی ملاقات گلی میں اسی جگہ پر ہوگئی جہاں سر راہ پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ حسینہ کے منہ سے زوردار چیخ نکل گئی۔ وہ "نفیس نفیس" کہہ کر پکارنے لگی لیکن نفیس بے رخی کا مظاہرہ کرتا اور بابا بابا کہہ کر دُور چلا گیا۔ حسینہ حسرت بھری نظروں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

لوگ کہتے ہیں بوڑھے کو تو اپنے کرموں کی سزا ملی لیکن نفیس اور حسینہ جیسے بے مثال جوڑے کو جانے کس عمل کی سزا ملی کہ اُن کی ہنستی بستی زندگی یوں اچانک برباد ہوگئی۔



حضرت جمال الدین ہانسویؒ

پروفیسر غلام رسول

آپؒ صورت و سیرت میں کمال رکھتے تھے اور یکتائے زمانہ تھے اور حضرت بابا فریدؒ سے بیعت ہونے کے بعد یہ حسن ظاہری اور باطنی اور زیادہ نکھر گیا!

حضرت بابا فرید گنج شکرؒ نے جب مخدوم صابر کلیریؒ کو دہلی کی خلافت وقطبیت عطا فرمائی تو ساتھ یہ ارشاد بھی فرمایا عزیز من! دہلی جانے سے پہلے اس سند پر ہمارے جمال الدین ہانسویؒ کی توثیق و تصدیق کروالینا۔ مرشد کا یہ حکم سن کر حضرت کلیریؒ اجودھن (پاک پتن) سے ہانسویؒ کی جانب روانہ ہوئے۔ ادھر حضرت کلیریؒ روانہ ہوئے ادھر خواجہ ہانسوی کو نور فراست سے مہمان کی آمد کی اطلاع کردی گئی۔ آپؒ اپنی خانقاہ کے دروازے پر استقبال کے لئے کھڑے ہوگئے۔

جب خواجہ مخدوم کلیریؒ تشریف لائے تو آپؒ سواری سے اُترنے کے بجائے سواری سمیت خانقاہ میں داخل ہوگئے۔ حضرت خواجہ ہانسویؒ کو اپنے مہمان عزیز کی یہ ادا پسند تو نہ آئی تاہم انہوں نے مخدوم کلیریؒ کو پورے اعزاز و اکرام کے ساتھ اپنا مہمان کیا۔ ابھی چند گھنٹوں کا قیام ہی ہوا تھا کہ مغرب کی نماز کا وقت ہوگیا۔ دونوں بزرگوں نے ایک ساتھ نماز ادا کی۔ بعد فراغت نماز حضرت مخدوم کلیریؒ نے اپنی سند قطبیت جناب خواجہ ہانسویؒ کے سامنے پیش کی اور توثیق کی درخواست کی تاکہ وہ دہلی کی جانب روانہ ہوسکیں۔ رات کا وقت تھا روشنی کا کچھ خاص انتظام نہ تھا۔ حضرت ہانسویؒ نے فرمایا مخدوم کلیریؒ اس وقت رات کا وقت ہے روشنی کا کچھ انتظام نہیں آپ صبح تک توقف کرلیں کل ان شاء اللہ روشنی میں سند دیکھ کر اس کی توثیق و تصدیق کردی جائے گی۔

حضرت صابر کلیریؒ نے یہ بات سُنی تو فرمایا' اے خواجہ ہانسویؒ روشنی کے نہ ہونے کی وجہ سے آپ صبح تک روک رہے ہیں یا کہ کوئی اور وجہ ہے۔

خواجہ ہانسویؒ نے فرمایا' بھائی صاحب اور تو کوئی کام یا وجہ نہیں میں تو محض روشنی نہ ہونے کی وجہ سے روک رہا ہوں کہ صبح تصدیق کردی جائے گی۔

یہ کلمہ سن کر حضرت کلیریؒ نے اپنے دست راست کی انگشت شہادت پر اسم اعظم پڑھ کر دم کیا' دم کرنے کی دیر تھی آپؒ کی انگلی چراغ کی مانند روشن ہوگئی۔ حضرت خواجہ ہانسویؒ نے آپؒ کا جلال ملاحظہ فرمایا تو فوراً اپنے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی پر اسم اعظم دم کرکے روشن کر دکھایا۔ خواجہ کلیریؒ نے نہایت عجلت سے کام لیتے ہوئے اپنے دست راست پر دم کیا اور پورا ہاتھ روشن کر دکھایا۔

خواجہ ہانسویؒ نے خواجہ کلیریؒ کی یہ عجلت پسندی دیکھی تو ان کی سند قطبیت پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کردی اور فرمایا آپؒ دہلی اس سند کے بغیر تشریف لے جائیں۔ دہلی غریب آپ کے اس دم آتش کو برداشت نہ کرسکے گی۔ آپ نے دہلی کو جانا ہے تو تنہا ہی جائیں۔

حضرت خواجہ کلیریؒ جو مجسمہ شان جمال تھے سخت جلال میں آگئے اور اسی جلال میں واپس حضرت بابا فرید کی طرف لوٹے اور لوٹتے ہوئے حضرت ہانسویؒ سے کہا' خواجہ ہانسویؒ آپ نے میری سند جس طرح پھاڑی ہے میں نے آپ کا سلسلہ چاک کردیا ہے۔ یہ کہہ کر آپؒ اجودھن (پاک پتن) لوٹ گئے اور سارا واقعہ حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں پیش کیا تو باباجیؒ نے مسکرا کر فرمایا۔

اے میرے صابر! ذرا یہ تو بتاؤ تم نے جمال ہانسویؒ کا سلسلہ کس طرف سے چاک کیا ہے۔

عرض کی' میں نے اول سے شجرہ چاک کیا ہے۔

حضرت باباؒ نے فرمایا' چلو خیر ہوئی تم نے جمال کا شجرہ ابتداء سے چاک کیا۔ ان شاء اللہ خدا ان کا شجرہ درست فرمادے گا مگر پھر بھی تمہارے الفاظ کا اثر ضرور رہے گا۔

حضرت کلیریؒ کے الفاظ کا یہ اثر ہوا کہ حضرت جمال کے بڑے صاحبزادے جو عالم فاضل اور عارف تھے آخری عمر میں مجنون ہوگئے اور چھوٹے صاحبزادے برہان الدین باوجود حضرت کی تعلیم و تلقین کے صلاحیت تسخیر پیدا نہ کرسکے اور اپنے والد خواجہ ہانسویؒ کے فیوض باطنی سے محروم رہے اور آپؒ کا شجرہ نسب دونوں صاحب زادوں کو میسر نہ

آ سکا۔

حضرت جمال الدین ہانسویؒ حضرت امام ابو حنیفہؒ امام اعظمؒ کی اولاد مجاز میں سے تھے۔ تمام منازل علوم اور فقر و عرفان سے گزر کر قرب الٰہی کی منزلت میں قدم رکھا اور حضرت بابا فرید گنج شکرؒ سے شرف بیعت حاصل کیا۔ حضرت جمال الدین ہانسویؒ صورت و سیرت میں کمال رکھتے تھے اور یکتائے زمانہ تھے اور حضرت بابا فریدؒ سے بیعت ہونے کے بعد یہ حسن ظاہری اور باطنی اور زیادہ نکھر گیا۔ آپؒ کا اپنے مرشد سے روحانی علاقہ و واسطہ اس قدر مستحکم تھا کہ حضرت بابا فریدؒ دہلی سے جب واپس لوٹے تو اپنے محبوب مرید جمال الدینؒ کی خاطر پورے بارہ برس تک ہانسی میں مقیم رہے اور بابا صاحبؒ اکثر فرمایا کرتے

جمال می خواہم کہ گرد سر تو بگردم

اور یہ کمال محبت و شفقت حضرت جمالؒ کی روحانی معراج تھی۔ حضرت باباؒ اور جناب حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ کے درمیان علوم و عرفان کی ایسی وابستگی اور یگانگت تھی کہ دونوں اس معاملہ میں یک جان دو قالب تھے اور اسی طرح محبت فی اللہ میں بھی باہم شیر و شکر تھے۔ یگانگت کے روابط اس درجہ ترقی پذیر تھے کہ دونوں کاملین ایک دوسرے کے آستانے پر اکثر آتے جاتے رہتے تھے۔

حضرت ملتانیؒ جب بھی اجودھن (پاکپتن) تشریف لاتے تو آپؒ حضرت باباؒ کے محبوب مرید جمال الدین ہانسویؒ پر خصوصی تلطف فرمایا کرتے تھے اور جس طرح حضرت بابا صاحبؒ جمال الدین کو محبوب رکھتے تھے اسی طرح حضرت ملتانیؒ بھی ان سے محبت کرتے تھے۔ یہ اسی محبت اور تلطف کا اثر تھا کہ ایک مرتبہ حضرت ملتانیؒ نے حضرت باباؒ صاحب کو خط لکھ کر درخواست کی کہ خواجہ جمال ہانسویؒ کو ان کے پاس ملتان میں بھیج دیا جائے۔

حضرت بابا صاحبؒ نے جواب دیا۔

اس جواب سے خواجہ ملتانیؒ کو سخت مایوسی ہوئی اور انہوں نے اپنے روحانی تصرف اور توجہ سے حضرت جمال ہانسویؒ کے دل میں ایک شورش و اضطراب پیدا کردیا۔ یوں ان کی توجہ حضرت بابا صاحبؒ سے ہٹ کر حضرت ملتانیؒ کی طرف ہوگئی۔ اسی اضطراب و شورش میں خواجہ ہانسویؒ نے حضرت باباؒ سے ملتان جانے کی اجازت طلب کی۔ بابا صاحبؒ نے کوئی جواب دینے کے بجائے سکوت اختیار کیا۔ خواجہ ہانسویؒ نے بجائے اس کہ وہ بھی مرشد کی خاموشی کی رمز پا لیتے اور اپنا ارادہ ملتان ترک کردیتے وہ مصر ہوئے اور بار بار ملتان جانے کا اصرار کرنے لگے۔ اس بار بار کے اصرار نے حضرت بابا صاحبؒ کو غضب ناک کردیا اور آپؒ نے جلال میں آ کر فرمایا۔

برو و روئے خود سیاہ کن

بس یہ الفاظ حضرت باباؒ کی زبان سے نکلنے کی دیر تھی کہ قیامت آ گئی۔ حضرت جمال الدینؒ کا جمال صورت اور کمال معرفت دونوں سلب ہوگئے۔ چہرہ سیاہ تر ہوگیا اور سینہ عرفان کے خزانے سے خالی ہوگیا اور حضرت بابا صاحبؒ نے جمال الدینؒ کو اپنی خانقاہ سے نکال کر حکم دیا کہ کوئی بھی ہم سے جمال الدین کی سفارش نہ کرے۔ تمام حاضرین نے کہا' در و بام بھی حضرت بابا صاحبؒ کے جلال سے لرزہ براندام تھے کسی کو دم مارنے کی جرأت نہ ہوسکتی تھی۔

حضرت جمال الدین ہانسویؒ روئے سیاہ اور

حال تباہ کے ساتھ ملتان جانے کے بجائے ملتان کے قریب ایک صحرا میں چلے گئے اور حالت جنون اور خود رفتگی میں دست پیمائی کرنے لگے اور ایک سال تک اپنے وجود سے بے خبر دیوانہ وار اپنی عاقبت نااندیشی کا ماتم کرتے رہے۔

ایک سال کے بعد ملتان کے قریب اسی صحرا سے حضرت بابا صاحبؒ کا ایک مرید جو سوداگر تھا ایک قافلے کے ہمراہ واپس اجودھن جارہا تھا کہ قافلے نے اسی صحرا کے قریب پڑاؤ ڈالا اور ملتان کے اس شعلہ نما صحرا میں جہاں گرم ہواؤں کے جھونکے آئندورند کے چہرے جھلسا دیتے ہیں اور جہاں دوپہر کے وقت دھوش وطیور میلوں تک نظر نہیں آتے وہاں ایک پراگندہ حال اور ژولیدہ بال انسان نالہ وفریاد میں مصروف دیکھا۔ اردگرد کے لوگوں سے اس فقیر کے بارے میں اس نے پوچھا تو پتہ چلا یہ دیوانہ سال بھر سے کش مکش موت وحیات میں گرفتار ہے۔ یہ سیاہ چہرہ شخص جس کے سر پر خاک اور لب پر آہ ہوتی ہے کبھی جوش دیوانگی میں ملتان کی طرف میلوں خاک اُڑاتا ہوا جاتا ہے اور پھر اسی حالت میں واپس آجاتا ہے اور کبھی دیوانگی اور جذبات میں اپنے کپڑے پھاڑ ڈالتا ہے اور جب کبھی سلوک و ہوش کی ترنگ میں آتا ہے تو اپنا سر نیاز سجدے میں جھکا دیتا ہے۔ اس کا نہ کوئی پرسان حال ہے نہ کوئی ہم خیال ہے۔

سوداگر نے لوگوں سے اس فقیر کا احوال سنا تو اس سے ملنے کی خواہش کی۔ سب لوگوں نے اس کو روکا مگر وہ فقیر سے ملنے کا مصمم ارادہ کئے ہوئے تھا۔ سوداگر نے رات بھر عبادت میں گزاری اور دوران عبادت ہی اس کو اشارہ ہوا کہ یہ فقیر جمال الدین ہانسویؒ ہیں۔ صبح ہوتے ہی سوداگر صحرا میں پہنچ گیا اور فقیر کو دیکھ کر پکار اُٹھا۔

اے جمال! تُو یہاں ہے تُو نے یہ کیا حال بنا رکھا ہے؟۔

فقیر نے بھی سوداگر کو دیکھ کر پہچان لیا یہ تو میرا پیر بھائی ہے اور چیخ مار کر اس کے گلے لگ گیا۔ پھر رو رو کر کہنے لگا اے میرے پیر بھائی جب بھی تُو حضرت باباؒ کی درگاہ پر جائے تو ان سے اتنا عرض کردینا۔

حضرت گنج شکر قطب زماں و زمین
چشم رحمت بکشاؤ جناب درویش بہ بیں

سوداگر نے چشم نم کے ساتھ حضرت ہانسویؒ سے رخصت ہوکر اپنے قافلے کے ہمراہ صحرا سے کوچ کیا اور پاک پتن پہنچ کر حضرت بابا شکر گنجؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اس وقت حضرت باباؒ وضو فرما رہے تھے۔ عادت کریمانہ کے مطابق انہوں نے سوداگر کی مزاج پرسی کی اور سفر کے احوال دریافت فرمائے۔

سوداگر نے حضرت پیرومرشد کی نگاہ پُر شفقت کو اپنی طرف مائل دیکھا تو اپنے سفر کے حالات اور احوال کے ساتھ اس فقیر صحرا کی حالت زار بیان کی۔ حضرت باباصاحبؒ نے اپنے مرید جمال ہانسویؒ کی رُوداد سُنی تو اپنے دیگر مریدوں اور اس سوداگر سے فرمایا' تم نے جمال ہانسویؒ کے احوال سنے وہ کیسے نافرمانی کی سزا کاٹ رہا ہے۔

سب درویشوں نے درخواست کی حضرت سرکار قطب مدارؒ کے واسطے اور خواجہ غریب نوازؒ کے صدقے جمال ہانسویؒ کو معاف فرما کر ان پر چشم التفات فرمائیے۔

نمک پارے

''آج تمہارا ڈرائیونگ ٹیسٹ تھا۔ کیا رزلٹ آیا؟''

ٹیسٹ لینے والا زخمی حالت میں ہسپتال میں پڑا ہے اسے ہوش آئے گا تو رزلٹ پتا چلے گا۔''

''یہ تمہارے بیٹے کو انگوٹھا چوسنے کی عادت تھی۔ تم نے یہ عادت کیسے چھڑائی؟''

''میں نے اس کی نیکر کا الاسٹک ڈھیلا کردیا، اب وہ ہردم نیکر کو تھامے رہتا ہے۔''

بس میں بوڑھے کی جیب سے نوجوان کا ہاتھ ٹکرایا تو اس نے نوجوان سے کہا ''کیا کر رہے ہو؟''

نوجوان نے فوراً جواب دیا۔ ''گورنمنٹ کالج سے بی اے کررہا ہوں۔''

بیوی: ''میں مر جاؤں گی تو تمہیں مجھ جیسی بیوی نہیں ملے گی۔''

شوہر: ''مگر میں تمہارے جیسی تلاش ہی کیوں کروں گا؟''

''تم نے چور کو گرفتار کیوں نہیں کیا؟''

''میں چور کو بے شک گرفتار نہ کرسکا مگر اس کی انگلیوں کے نشانات اپنے گال پر لے آیا ہوں۔''

(مرسلہ: انعم سلمان۔ حافظ آباد)

حضرت بابا صاحبؒ نے خدا کی طرف رجوع کیا۔ ادھر سے بھی یہی حکم ملا کہ جمال ہانسویؒ کو معاف فرمایا جائے۔ حضرت فرید الملت نے ایک رباعی ایک کاغذ پر تحریر فرمائی اور ایک شخص کو حکم دیا کہ ملتان کے صحرا میں جاؤ اور جمال ہانسویؒ کو دے دو۔

روگرد جہاں بگرو و پا آبلہ کن
گرہم چومنی یابی و ماوا گلہ کن
یک صبح یا خلاص بیا برو رما
گرکار توبہ نیار و آنگاہ گلہ کن

حضرت جمال ہانسویؒ کو جب حضرت بابا کا یہ نامہ ملا تو آپؒ نے اس کو اپنے سینے سے لگایا چوما اور بار بار چوما۔ دل میں انبساط روحانی اور آنکھوں میں تجلی ایمانی پیدا ہوئی۔ پیدل اجودھن (پاکپتن شریف) روانہ ہوئے اور اپنے مرشد عالی مقام حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں پہنچ کر ان کے قدموں پر گر کر اس قدر روئے کہ آنکھوں میں ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی۔

محبت نے محبوب روحانی کے قدموں سے اس وقت تک سر نہ اُٹھایا جب تک بابا صاحب نے اپنے دست شفقت سے حضرت ہانسویؒ کو خود نہ اُٹھایا۔ پھر تلطف ہوا نگاہ کرم اُٹھی تو رحمت کے بادل چھا گئے خزاں رسیدگی تمام ہوئی۔ بابا صاحبؒ نے حضرت ہانسویؒ کو فرط ورحمت سے سینے سے لگالیا اور جو علوم و عرفان جمال کے سینے سے محو کر دیئے گئے تھے سینہ بہ سینہ واپس کردیئے اور مزید خزائن معرفت بھی عطا کردیئے۔

حضرت جمال الدین ہانسویؒ نہایت رقیق القلب بزرگ تھے۔ آپؒ کا وصال 30 ربیع الثانی 659ھ کو ہوا۔ آپؒ کا مزار ہانسی بھارت میں واقع ہے۔ آپؒ کے وصال کے بعد آپؒ کے مریدوں نے آپؒ کے مزار پر گنبد تعمیر کرنے کا ارادہ کیا۔ تعمیر کی تیاری شروع ہوئی تو اچانک آپؒ کی قبر شق ہوگئی اور سوراخ میں سے اتنی مدہوش کرنے والی خوشبو آئی کہ لوگوں کے دماغ معطر ہوگئے اور اس اشارہ غیبی پر گنبد کی تعمیر کا کام بند کردیا گیا۔



نادار

فوزیہ رفیق بٹ

ابھی مہمان کھا پی ہی رہے تھے کہ فرناز آ گئی۔ برتن میز پر رکھے دیکھ کر اس کا پارہ آسمان پر پہنچ گیا۔ مہمانوں کا لحاظ کئے بغیر بولی ”کس نے نکالے ہیں یہ برتن؟ ایک منٹ کے اندر ان کو دھو کر واپس رکھا جائے‘ کسی کو قیمت معلوم ہے ان کی؟“ طاہرہ غصے میں جواب دینا ہی چاہتی تھی کہ اس کی ساس نے ہاتھ دبا کر اسے خاموش کر دیا

ماں بیٹے کی کہانی‘ روپے پیسے کے لالچ نے انہیں اندھا کر دیا تھا

طاہرہ گھر میں داخل ہوئی تو کانوں میں اماں اور شاہ زیب کے جھگڑے کی آواز آئی۔ یہ جھگڑا کوئی نئی بات نہیں تھی ماں بیٹا دونوں ایک ہی مزاج کے تھے ضدی‘ غصیلے اور اپنی بات منوانے والے اس لئے اکثر چھوٹی بڑی جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔

”توری کیوں پکائی؟“

”تو اور کیا پکاؤں تم دو دن سے دکان بند کئے بیٹھے ہو گوشت مرغی کے پیسے دیئے تھے کیا؟“ اماں بولتیں۔ اس قسم کی بحث معمول کا حصہ تھی لیکن یہ جھگڑا کافی لمبا ہو گیا تھا۔ طاہرہ نے رُک کر جھگڑے کی وجہ جاننا چاہی تاکہ جھگڑا روکنے کی کوشش کی جائے تو اسے یہ جان کر سخت حیرت ہوئی کہ شاہ

زیب کسی شازیہ کا نام لے کر بضد ہے کہ اسی سے شادی کرے گا اور اماں ہمیشہ کی طرح فرناز کی حمایت کررہی ہیں۔ شاہ زیب غیر سنجیدہ' غیر مستقل مزاج اور سطحی سوچ رکھنے والا شخص تھا لطافت اور نازک خیالی سے اس کا دُور کا بھی تعلق نہ تھا اس لئے اس کے منہ سے کسی لڑکی کا نام سُن کر طاہرہ بہت حیران ہوئی۔ وہ ایک دم کمرے میں جاکر بولی

''کون شازیہ؟''

طاہرہ کی آواز سن کر اماں اور شاہ زیب خاموش ہوگئے۔ چند لمحات بعد شاہ زیب بولا ''تم تو اسے جانتی ہوگی عابد بھائی کی بیگم کی چھوٹی بہن۔ تمہارے کالج میں تو پڑھتی تھی؟''

''اچھا وہ' ویسے آپ اسے کیسے جانتے ہیں؟''

''عابد بھائی کے گھر دیکھا تھا اسے دو ایک مرتبہ۔''

''اماں شازیہ تو بہت اچھی لڑکی ہے۔ نیک صورت' نیک سیرت' کالج میں سب ہی اسے پسند کرتے تھے۔ ایسی بہو تو خوش نصیبوں کو ملتی ہے۔''

''ارے چپ رہ۔'' اماں گرجیں۔ ''مجھے نہیں چاہئے اچھی بہو۔ یہ بھی تو بتاؤ کہ جی بھر کے کنگلی ہے نہ ماں' نہ باپ' ایک بھائی وہ بھی ملازمت والا اس کے اپنے بیوی بچے ہیں وہ کیا دے گا ہمیں۔''

''اماں شازیہ جیسی لڑکی گھر میں سکون اور امن لائے گی۔'' طاہرہ بولی۔ ''چخ چخ کرنا اس کی عادت نہیں۔''

''مجھے نہیں ضرورت ایسی بہو کی۔ مجھے فرناز جیسی لڑکی چاہئے' جو میرا گھر بھر دے۔ اتنا کہ میں تمہاری شادی بھی اسی سامان میں سے کردوں۔''

''فرناز جیسی لڑکی...... وہ ہاتھ لگانے دے گی اپنے سامان کو؟'' طاہرہ بولی اور کمرے سے نکل گئی۔ شاہ زیب اور اماں میں پھر لڑائی ہونے لگی۔

طاہرہ نے چند دن شازیہ کی حمایت کرکے اماں کے طعنے سنے پھر خاموشی اختیار کرلی کیونکہ اسے جلد یہ اندازہ ہوگیا کہ شاہ زیب چونکہ رشتے اور وفا نبھانے والا شخص نہیں اس لئے اس کے معاملے میں بولنا اچھا نہیں۔ اس کے دماغ میں بس ایک خیال آگیا ہے اماں کی مخالفت کی وجہ سے اپنی ضد پر قائم ہے۔ ضدی ہونے کی وجہ سے اپنی بات سے پیچھے نہیں ہٹنا چاہتا۔ کچھ عجب نہیں کہ شازیہ کو بیاہ کر گھر میں پرانی کرسی کی طرح رکھ کر بھول جائے۔

شازیہ سفید پوش طبقے کی لڑکی تھی والدین وفات پاچکے تھے۔ بھائی اور بھابی کے ساتھ رہتی تھی۔ بڑی بہن شادی شدہ تھی۔ بھائی' بھابی اور بہن نے مل کر اسے پڑھایا لکھایا تھا اور نہایت مشکل سے اس کے لئے چند چیزیں جمع کی تھیں۔

فرناز شاہ زیب کی رشتے کی پھوپھی زاد تھی اس کے والد کا بہت بڑا مرغی خانہ تھا۔ گھر میں خوشحالی تھی لیکن وہ بھی اماں اور شاہ زیب جیسے مزاج کی تھی۔ زبان چلاتے ہوئے اکثر عقل استعمال کرنا غیر ضروری سمجھتی تھی۔ چار سال قبل اس کا نکاح دبئی میں مقیم اپنے چچا زاد سے ہوا تھا۔ کسی بات پر فرناز کے والد اور چچا میں جھگڑا ہوگیا۔ بات بہت بڑھ گئی' کئی دن تک دونوں اطراف سے الزام تراشی کا سلسلہ جاری رہا ایسے ہی ایک موقع پر جب فرناز کے چچا اور چچی فرناز کے گھر کی نشست گاہ میں موجود فرناز کے والدین سے جھگڑ رہے تھے فرناز نشست گاہ میں پہنچ گئی اور اپنے چچا اور چچی کو ترکی بہ ترکی جواب دینے لگی۔ اس بدتمیزی پر چچا اور چچی دونوں حیران رہ گئے۔ یہاں سے جاکر انہوں نے اس قصہ کا ڈھنڈورا پورے خاندان میں پیٹا' ہزاروں باتیں بنیں' کئی جھگڑے اور ہوئے اور رخصتی کی تاریخ کے بجائے طلاق نامہ ہاتھ آیا۔

عام حالات ہوتے تو اماں کو شاہ زیب اور فرناز کی شادی کا خیال بھی ظاہر کرنے کی ہمت نہ ہوتی طلاق اور فرناز کے رویئے نے اس کا نام خاندان بھر میں اُچھالا تھا۔ فرناز کے والدین بھی یہ سوچنے لگے تھے کہ اپنے برابر کے خاندان میں فرناز کی شادی مسائل میں اضافہ کرے گی اگر اپنے خاندان سے کم حیثیت والے گھرانے کی آنکھوں پر روپے کی پٹی باندھ دی جائے تو ممکن ہے لڑکے والے دولت اور زیادہ جہیز کے رعب میں فرناز کی خامیاں نظرانداز کردیں کیونکہ اس کے سدھرنے کا کوئی امکان نظر نہ آتا تھا۔

شاہ زیب کو اپنے والد سے اچھی خاصی بڑی چلتی ہوئی دکان ملی تھی لیکن شاہ زیب کام کے معاملے میں بھی غیر سنجیدہ تھا۔ سر درد یا ہلکا سا بخار بھی ہوتا تو تین تین دن دکان نہ کھولتا۔ ہاتھ میں پیسے ہوتے تو بے سوچے سمجھے خرچ کردیتا۔ ان حالات میں جب شاہ زیب نے دھمکی دی کہ اگر اس کی بات نہ مانی گئی تو وہ ماں بہن سے کوئی تعلق نہ رکھے گا نہ ہی گھر کا خرچ دے گا تو اماں بے بس ہوگئیں۔ شازیہ کو سو بددعائیں دیکر بیاہ لائیں۔

یہ شادی شازیہ کے لئے بدنصیبی کا پیغام لائی کیونکہ شازیہ کی اچھی عادتوں کی شاہ زیب اور اماں کو ضرورت نہ تھی۔ اماں طعنے دیتیں کہ چند جوڑے کپڑے اور برتن لائی ہے' نہ صوفے' نہ قالین' نہ جوسر نہ چوپڑ' نہ سونا نہ موتی' زیور اگر کوئی ہے تو اپنے پاس ہی رکھا ہوگا ہمیں تو نظر نہیں آیا۔ جانے کیا کیا ہے؟۔

کیا کیا ہے؟ کا جواب یہ تھا کہ شازیہ کی والدہ کی سونے کی دو چوڑیاں تھیں' ایک انہوں نے بڑی بیٹی اور ایک بہو کو شادی پر دے دی تھی۔ شازیہ کے لئے مشکل سے ایک لاکٹ اور ایک جوڑی بندے بنے تھے تو بھابی اور بہن نے اپنی اپنی چوڑی دے دی اسی زیور پر اماں کی نظر تھی۔ اُٹھتے بیٹھتے ذکر ہوتا' طاہرہ ٹوکتی تو اسے بھی باتیں سننا پڑتیں۔ شادی کے پہلے دن ہی سے شازیہ کی زندگی رنج و غم کی تصویر بن گئی۔ ہر بات پر ڈانٹ پھٹکار ہر کام میں نقص کھانے پینے پر اعتراض کہ کون سا نواب کے گھر سے آئی ہو کہ پلاؤ کھایا جارہا ہے۔ سارے گھر والوں سے آخر میں کھانا ملتا' بیٹھی بھی نظر آجاتی تو کوئی نیا کام بتا دیا جاتا۔ طاہرہ ہاتھ بٹانے کی کوشش کرتی تو اماں اسے کسی بہانے سے شازیہ کے پاس سے ہٹا دیتیں۔

شاہ زیب نے بھی شازیہ کو کوئی سکھ نہ دیا اس کے کھانے پینے سونے جاگنے کام کرنے اور آنے جانے کا کوئی باقاعدہ وقت نہیں تھا۔ کسی وقت بھی کھانا لانے' کپڑے استری کرنے یا دوستوں کے لئے چائے بنانے کا حکم مل جاتا۔ رات کو کسی بھی وقت پانی یا چائے مانگ لی جاتی۔ شازیہ تمام کام کرتی لیکن ہر کام میں نقص نکالنے کی عادت شاہ زیب کو بھی تھی۔ اماں تو لڑ جھگڑ کر شاہ زیب سے رقم نکلوا لیتی تھیں شازیہ کے ہاتھ میں مشکل ہی سے کوئی پیسہ آتا۔ اماں کو خبر ہوتی تو گوشت' سبزی منگوانے کا کہہ کر مانگ لیتیں۔ شاہ زیب پر دکان بند کرنے کا دورہ پڑتا تو شازیہ سے دیئے گئے پیسے واپس مانگتا' وہ کہاں سے دیتی جواب میں فضول خرچ' چٹوری اور نواب زادی کہلاتی۔ ''آئندہ لے کے دکھانا مجھ سے ایک روپیہ بھی'' یہ ایسے موقع پر شاہ زیب کا پسندیدہ جملہ تھا۔

ان ہی حالات میں طاہرہ کا رشتہ اس کی سہیلی کے بھائی سے طے ہوگیا۔ طاہرہ کی خوبیوں نے اس کا ناطہ اچھے خوشحال گھرانے میں جوڑ دیا۔ اماں کا خیال تھا کہ طاہرہ کا جہیز شاندار ہونا چاہئے تاکہ جو

بے عزتی شازیہ نے ہماری کی ہے اس کا داغ دھل سکے۔ طاہرہ کے لئے اماں نے کچھ روپیہ زیور وغیرہ جوڑا تھا باقی کا مطالبہ شاہ زیب سے ہوا۔ غیر متوقع طور پر شاہ زیب نے رقم دیدی۔ اماں رقم کے کم ہونے کی شکایت اور خریداری ساتھ ساتھ کرتی رہیں۔

اماں نے شازیہ کے چار جوڑے اور برتن بغیر پوچھے اُٹھا کر اپنی الماری میں بند کر لئے۔ شازیہ نے شکایت نہ کی تو کہنے لگیں ”ذرا اپنی چوڑیاں اُتارنا' تمہارا اور طاہرہ کا ناپ ایک ہے' ناپ لے کر سنار سے چوڑیاں بنوانی ہیں۔“ چوڑیاں شازیہ کی کلائیوں سے اماں کی الماری میں منتقل ہو گئیں اور کبھی نہ ملیں۔ شازیہ بزرگوں پر اعتراض اور ان سے مطالبے کرنے کی عادی نہ تھی خاموش ہو رہی۔ لیکن دل کو خوب چوٹ لگی کہ ماں بہن اور بھابی کی نشانی اور قربانی گئی ہاتھ سے۔ اماں کے دل میں چور تھا ایک دن سوچا کہ کہیں شازیہ' شاہ زیب یا طاہرہ سے ذکر نہ کر دے شاہ زیب گھر آیا تو شازیہ کی موجودگی میں بولیں ”دیکھو شاہ زیب دو تار جیسی پتلی چوڑیاں میں نے تمہاری بیوی سے ناپ لینے کے لئے لیں تو سو دفعہ مانگ چکی ہے یہ خیال نہ ہوا کہ بھابی کو بھی نند کی شادی کے لئے کوئی تحفہ دینا چاہیئے۔“

”ہاں ہاں یہ بات بھی ٹھیک ہے۔“ شاہ زیب بولا ”تمہیں بھی تو تمہاری بہن اور بھابی نے ہی یہ چوڑیاں دی تھیں۔ تم بھابی ہو کر اپنی نند کو دو چوڑیاں بھی نہیں دے سکتیں؟“ اور چوڑیاں طاہرہ کے زیورات میں رکھ دی گئیں اور شازیہ آنسو بہا کر خاموش رہی۔

طاہرہ کی شادی ہوئی تو شازیہ کو دکھ سہتے پونے دو سال کے قریب عرصہ ہو چکا تھا۔ طاہرہ کے چلے جانے سے شازیہ کے دکھ درد بانٹنے والا کوئی نہ رہا اس کی غذا اور روکھی سوکھی ہو گئی۔ طاہرہ کبھی کبھی اس کے لئے چھپ کر کوئی اچھی چیز کھانے کے لئے رکھ لیتی تھی۔

طاہرہ ملنے کے لئے آتی تو اس کے زخموں پر مرہم رکھتی۔ ایک دن آئی تو شازیہ کو الگ لے جا کر اس کی چوڑیاں اس کو واپس کر دیں اور کہا کہ مجھے فرید نے چوڑیاں لے کر دی ہیں اپنی چوڑیاں بھائی کے گھر رکھوا دو۔ شازیہ نے منع بھی کیا لیکن طاہرہ نہ مانی۔

کافی دن بعد فرناز کے لئے کہیں شادی کی بات چلی۔ یہ خبر اماں کے کانوں تک پہنچی تو سینے پر سانپ لوٹنے لگے کہ اب نہ جانے کس خوش نصیب کا گھر بھرے گا۔ ایک دن اماں کی ملاقات کسی تقریب میں فرناز کی خالہ سے ہو گئی۔ اماں نے گن سن لینے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ فرناز کے والدین انجانے اور بڑے لوگوں میں رشتہ دینے سے گھبرا رہے ہیں کیونکہ وہ لوگ فرناز کی حرکتوں سے واقف نہیں ہیں بعد میں بات کھلی تو زیادہ بُرا ہو گا۔ وہ لوگ مہذب اور سلجھے ہوئے ہیں فرناز کو برداشت کرنا ان کے لئے مشکل ہو گا۔ یہ تفصیل بتا کر خالہ شکوہ کرنے لگیں ”بہن تم نے بھی تو آس دلا کر شاہ زیب کی شادی کہیں اور کر دی۔“

یہ سن کر اماں کے دل پر چھری چل گئی۔ فرناز کو بہو بنانے کی دبی ہوئی خواہش پھر دل میں اُبھرنے لگی۔ گھر پہنچنے تک سو بار غور کیا' دل نے ہر بار جواب دیا کہ فرناز کو اب بھی بہو بنایا جا سکتا ہے۔ شاہ زیب کون سا شازیہ کے لئے جان دینے کو تیار رہتا ہے۔ اس کو راضی کرنا کچھ مشکل نہیں۔ ویسے بھی دو سال سے اوپر ہو چکا ہے اور اماں دادی جان نہ کہلا سکیں۔ اماں نے پوری شدت سے شاہ زیب کا پیچھا لے لیا۔ فرناز کی تعریفیں شازیہ کی برائیاں کر کے نئی

سیارہ ڈائجسٹ کی ایک اور عظیم پیشکش

ازواجِ مطہراتؓ

ارشد

شائع ہو گیا ہے

- کائنات کی مقدس، مطہر اور پاک ہستیاں۔
- پیغمبرِ آخر الزماں کے حرمِ رُشد و ہدایت کی روشنیاں۔
- اسلام کے نام لیواؤں کی مائیں۔
- وہ جنہوں نے اللہ کے رسولؐ کو اُس آنکھ سے دیکھا جس آنکھ سے دیکھنا کسی اور کے نصیب میں نہ تھا۔
- جنہوں نے نبی کریمؐ کے خلوت و جلوت کے نوری نظارے دیکھے

وُہ حقائق و روایات جو آج تک کسی ایک جگہ اکٹھے نہ کیے جا سکے

سیارہ ڈائجسٹ: 240 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور۔ فون: 37245412

پرسکون زندگی کے ایسے خواب دکھائے کہ شاہ زیب جلد ہی اماں کی ہر بات خلاف عادت خاموشی سے سننے لگا۔ اماں نے یہ دیکھ کر شازیہ کے لئے کوسنوں اور طعنوں کی رفتار تیز کردی۔

اتفاق سے ان دنوں سردی پڑ رہی تھی شاہ زیب کو زکام اور بخار نے آلیا۔ وہ دکان بند کرکے بستر پر پڑ گیا۔ عام حالات میں ایسا ہوتا تو اماں شاہ زیب کو جلد سے جلد بستر چھوڑنے اور دکان کھولنے کا مشورہ دیتیں لیکن اس دفعہ انہوں نے نیا حربہ استعمال کیا شاہ زیب کو بار بار یہ احساس دلانے لگیں کہ بے چارے شاہ زیب پر پورے خاندان کی کفالت کا بوجھ ہے۔ کام کی زیادتی سے اکثر تھک کر بیمار ہوجاتا ہے۔ گھر کا خرچ چلانا مشکل ہوجاتا ہے شازیہ تو ناکارہ ہے پڑھی لکھی ہے، یہ نہیں سوچتی کہ کہیں نوکری کرکے شوہر کا ہاتھ بٹائے۔ اور نہ اس کے میکے والے اس قابل ہیں کہ ایسے بُرے وقت میں اسے کچھ دے سکیں۔ شازیہ کا بھائی تو کنگالوں کا شہنشاہ ہے۔ یہی فرناز اگر آج میری بہو ہوتی تو کیا فکر تھی۔ شاہ زیب اس کے ابا کے کاروبار کا حصہ دار ہوتا۔ چلا چلایا کاروبار ہے اور پھر داماد سے کون جھگڑتا ہے۔ گھر بیٹھے کھانے کو ملتا رہتا۔ یہ آخری جملہ شاہ زیب کے لئے بہت پرکشش تھا۔ چند ہی دنوں میں وہ پچھتانے لگا کہ کیوں شازیہ سے شادی کی غلطی کی۔ ایک دن بھی تو سکون کا سانس نہ لیا۔ شازیہ کو چھوڑنے اور فرناز کو اپنانے پر دل بہت جلد آمادہ ہوگیا۔

شاہ زیب اماں سے فوراً بات کرنے کی ضد کرنے لگا۔ اماں نے سمجھایا طاہرہ شور مچائے گی وہ چند دنوں میں ہفتہ بھر کے لئے اسلام آباد جارہی ہے ان دنوں شازیہ کو کوئی بہانہ کرکے بھائی کے گھر بھیج دینا وہیں طلاق بھی پہنچ جائے گی۔ ایسے وقت شازیہ اور طاہرہ موجود نہ ہوں تو اچھا ہے۔ اب شاہ زیب کے لئے انتظار مشکل ہوگیا۔ آنے والے عیش و عشرت کے دنوں کے خواب دیکھنے لگا۔ اماں نے اس کی تسلی کے لئے فرناز کے گھر جاکر بات کی انہوں نے شازیہ کی طلاق کا مطالبہ کیا جو طاہرہ کے اسلام آباد جاتے ہی پورا کردیا گیا۔ طاہرہ اسلام آباد سے واپس آئی تو شازیہ کو گھر نہ پاکر سوال کیا جو جواب ملا وہ سن کر اس کے دل کو سخت صدمہ ہوا لیکن خلاف معمول آہستہ آواز میں بولی ''اچھا ہوا بے چاری کی جان چھوٹ گئی۔''

پندرہ دنوں بعد فرناز دلہن بن کر شاہ زیب کے گھر آگئی۔ سارا گھر طرح طرح کے سامان اور الماریاں کپڑوں اور زیورات سے بھر گئیں۔ باورچی خانہ جدید مشینوں اور خوبصورت برتنوں سے سج گیا لیکن گھر میں سکون پھر بھی نہ آسکا۔ اس لئے کہ اماں شاہ زیب اور فرناز تینوں گرم مزاج تھے۔ ماضی کی غلطیوں سے سیکھنا کسی کو نہ آتا تھا۔

فرناز شازیہ کے ساتھ ہونے والے سلوک سے آگاہ تھی ایسا سلوک برداشت کرنا اس کی عادت ہی نہ تھی۔ اماں اور شاہ زیب میں بھی برداشت کا مادہ نہ تھا اس لئے روز روز لڑائی جھگڑے معمول بن گئے۔ پہلے اماں اور شاہ زیب بولتے اور شازیہ سنتی اب تینوں بولتے اور فرناز سب سے زیادہ چیختی' بار بار ایک جملہ دہراتی ''مجھے شازیہ نہ سمجھنا''۔ گھر کا کام پہلے طاہرہ اور پھر شازیہ سنبھالتی تھیں۔ اماں نے مدتوں سے چولہے کو ہاتھ بھی نہ لگایا تھا نہ کپڑوں' برتنوں اور گھر کی صفائی پر توجہ دی تھی یہی عادت فرناز کی تھی۔ نہ والدین کے گھر میں رہ کر کام سیکھا نہ یہاں آکر ضروری سمجھا۔ چند ہی دنوں میں گھر میں بے ترتیبی اور بدنظمی نظر آنے لگی۔ اماں نے یہ سوچا ہی نہ تھا کہ فرناز بھلا شازیہ کی طرح ان کے بل بل کے احکامات کیوں مانے گی۔

شاہ زیب شادی کے بعد پہلی مرتبہ کام پر جانے لگا تو نہ لباس تیار تھا نہ جوتے' نہ ناشتہ' اتنے دن سے نئی دلہن بنی سب پر حکم چلاتی تھی۔ حکم نہ اماں مان سکتی تھیں نہ شاہ زیب کیونکہ یہ دونوں بھی صرف حکم دینے کے عادی تھے۔ شاہ زیب اتنے دنوں سے باہر سے کھانا لا رہا تھا لیکن اب چاہتا تھا کہ گھر سے ناشتہ کر کے جائے۔ اماں نے فرناز سے کہا تو وہ بولی ''میں نوکرانی نہیں ہوں اپنے کھانے پینے کا خود بندوبست کرو۔'' ناشتہ پھر باہر سے آیا تھیلوں میں سے سب سے پہلے فرناز نے ہی پسند کی چیزیں نکالیں اور اکیلی بیٹھ کر کھانے لگی۔ دوپہر کو طاہرہ آئی تو اس گھر کی شکل سنواری اور کھانا پکایا جو سب سے پہلے فرناز نے ہی نکال کر کھایا۔

اگلے ہی دن فرناز نے اپنے میکے سے ایک ملازمہ بلوائی جو صفائی وغیرہ بھی کرتی اور کھانا بھی پکاتی۔ کیا کرنا ہے؟ اور کیا پکانا ہے وہ صرف فرناز کا حکم مانتی۔ اماں یا شاہ زیب کی بات سنی ان سنی کر دیتی۔ کھانا صرف فرناز کی مرضی کا پکتا۔ کوئی کھائے نہ کھائے فرناز کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اکثر صرف اپنے لئے پکواتی۔ والدین سے ملنے جاتی تو ملازمہ ساتھ جاتی۔ گھر اجاڑ پڑا رہتا۔ اماں اور شاہ زیب کو تو پانی بھی کہہ کر پینے کی عادت تھی' ایسی صورتحال میں ان کا گزارہ کیسے ہوتا' دونوں ہی فرناز سے مطالبہ کرتے تو وہ سو باتیں سناتی اور ہل کر نہ دیتی۔ لہٰذا دونوں کو خود کام کے لئے اٹھنا پڑتا۔ زبان چلاتے جاتے آدھا' ادھورا کام کرتے اور جواب میں فرناز کے طعنے سنتے۔

اڑھائی ماہ اسی طرح گزرے کہ ایک دن فرناز کے والد ملنے آئے اور شاہ زیب سے کہنے لگے ''میں ایک ریستوران کھول رہا ہوں اپنی مرغی خانے کی مرغی سے سولہ پکوان پکانے کی تیاری کی ہے۔ فائدہ ہی فائدہ ہے۔ اگر تم اپنی دکان بیچ کر رقم مجھے دو تو میں تمہیں اپنے کاروبار کا حصہ دار بنا لوں۔ تمہاری دکان کی اتنی آمدنی نہیں جتنی میری ہے۔ تم پڑھے لکھے ہو ریستوران کے منیجر بن جاؤ تو صرف رات کو چند گھنٹے کا کام کرنا ہوگا۔''

شاہ زیب یہ سن کر بہت خوش ہوا دل میں خیال ہوا کہ یہ کام کرنا چاہئے ہوسکتا ہے کل کو یہ ریستوران میرا ہی ہوجائے۔ جلد ہی دکان فروخت کر کے رقم سسر کے حوالے کر دی۔ فرناز کے والد نے یہ پیش بندی فرناز کے تحفظ کے لئے کی تھی وہ چاہتے تھے کہ شاہ زیب مالی طور پر آزاد نہ ہوسکے۔ اس کا پیسہ سسر کے کاروبار میں پھنسا رہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ ان کا محتاج ہو خود کو سسر کا ملازم سمجھے تاکہ فرناز کو چھوڑنے کا خیال بھی اس کے دل میں نہ آئے۔

طاہرہ نے شازیہ سے ملنا جلنا نہیں چھوڑا تھا۔ وہ اس سے ملنے اس کے گھر جاتی اس کی دلجوئی کی کوشش کرتی۔ شازیہ نے بھائی پر بوجھ بننے کے بجائے محلے کے بچوں کو پڑھانا شروع کر دیا تھا قرآن مجید بھی پڑھاتی اور عام سکول کے بچوں کو بھی سبق یاد کراتی۔ شازیہ کو بھائی کے گھر رہتے ہوئے آٹھ ماہ ہوئے تھے کہ طاہرہ اس کے لئے شادی کا پیغام لائی۔ ناصر' طاہرہ کے شوہر فرید بھائی کے نہایت قریبی دوست تھے۔ ان کی بیگم فوت ہوچکی تھیں دو بچے تھے۔ تین برس کا کاشف اور آٹھ ماہ کی سارہ۔ دونوں بچوں' خاص طور پر سارہ کی پرورش ان کے لئے مسئلہ بنی ہوئی تھی۔ طاہرہ نے شازیہ کی نرم مزاجی اور اچھی عادتوں پر بھروسہ کرتے ہوئے ناصر کو یقین دلایا کہ شازیہ سے شادی کے بعد آپ کو گھر اور بچوں کی طرف سے بے فکری ہوجائے گی۔ شازیہ کے بڑوں نے اس رشتہ کے لئے نہایت خوشی سے رضامندی دی۔ شازیہ کو بلاوجہ اعتراض کی

عادت نہ تھی۔ گھر والوں کو خوش دیکھ کر وہ بھی خوش ہوگئی لہٰذا شادی ہوگئی۔ ناصر بہت دولت مند نہیں پھر بھی اچھے خوشحال شخص تھے۔ شازیہ کو اس شادی سے نہایت سکھ اور سکون ملا اور اس سے بڑھ کر اس نے ناصر اور بچوں کے لئے راحت اور سکون کا اہتمام کیا۔ ناصر نہایت شکرگزار تھے وہ حقیقتاً گھر اور بچوں کی طرف سے بے فکر ہوگئے۔

شاہ زیب ریستوران جانے لگا تھا کبھی کبھی رات کو دیر ہوجاتی فرناز سو چکی ہوتی کھانا گرم کروانے کے لئے اسے کوئی نہ ملتا۔ ایک دو بار اماں سے کہا تو اماں کہنے لگی ”میری عمر ہے رات کو ایک بجے باورچی خانے میں جانے کی؟“ بات ٹھیک بھی تھی اماں اب کچھ کمزور ہوگئی تھیں ایسے حالات میں شاہ زیب خود کوشش کرتا‘ کئی بار ہاتھ جلا‘ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ ڈھونڈنے پر کوئی روٹی‘ چاول یا سالن نہ ملا یا اتنا کم ملا کہ کھانا شروع ہوتے ہی ختم کرنا پڑے۔ ایک بار غصے میں کھولتا فرناز پر برسا تو وہ جواب میں بولی ”ریستوران سے آئے ہو اور بھوکے ہو کھا کر کیوں نہیں آتے؟“

”کیوں کھا کر آیا کروں میں روز ایک سے کھانے‘ تم کس لئے ہو؟“

”میں کس لئے ہوں؟“ فرناز غصے سے چلائی ”کم ازکم تمہاری خدمت کے لئے نہیں ہوں اپنی ماں سے کہو نا کہ تمہارے لئے روٹیاں پکائے۔ ایک ایک چیز گھر میں میری لائی ہوئی استعمال کرتے ہیں اور کام بھی میں ہی کروں ان کا‘ تم میرے ابا کے ملازم ہو میں تمہاری نوکرانی نہیں۔“ یہ جواب سن کر شاہ زیب ساری رات غصے میں کھولتا رہا لیکن نہ کچھ کرسکا نہ کچھ کھا سکا۔

اماں کو فرناز کے گھر بھر دینے والے جس سامان کا بہت اشتیاق تھا اس پر اماں کا کوئی اختیار نہ تھا۔ ایک دن فرناز بازار گئی تھی کہ طاہرہ اپنی ساس کے ساتھ ملنے آئی۔ طاہرہ نے ہی چائے بنائی اور فریج سے پھل نکالے ابھی برتنوں میں رکھ رہی تھی کہ اماں باورچی خانے میں آگئیں اور طاہرہ کو واپس نشست گاہ میں بھیج دیا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ طاہرہ کی ساس کو معلوم ہو کہ ان کے لئے اس گھر میں چائے بنانے والا کوئی نہیں ہے۔ اماں کی جو شامت آئی تو الماری میں سجے خوبصورت برتنوں کے سیٹ میں سے پیالیاں اور تھالیاں نکال کر کھانے پینے کا سامان ان میں ڈالا اور مہمانوں کو پیش کردیا۔ ابھی مہمان کھا پی ہی رہے تھے کہ فرناز آگئی۔ اتنے برتن میز پر رکھے دیکھ کر اس کا پارہ آسمان پر پہنچ گیا۔ مہمانوں کی موجودگی کا لحاظ کئے بغیر بولی ”کس نے نکالے ہیں یہ برتن؟“ پھر جواب کا انتظار کئے بغیر بولی ”ایک منٹ کے اندر اندر ان کو دھو کر واپس رکھا جائے‘ کسی کو قیمت معلوم ہے ان کی؟“ طاہرہ غصے میں کوئی جواب دینا ہی چاہتی تھی کہ اس کی ساس نے ہاتھ دبا کر اسے خاموش کردیا۔ فرناز چلی گئی تو طاہرہ کی ساس نے ان کو تسلی دی صبر کی تلقین کی اور کہا ”بہن آپ نے اس لڑکی میں کیا دیکھا؟“

”یہی برتن۔“ اماں کے منہ سے نکلا۔

انہی حالات میں پانچ برس بیت گئے۔ ناصر بھائی کے بچے دو سے تین ہوگئے۔ طاہرہ اور فرید بھائی ملک سے باہر چلے گئے۔ طاہرہ ماں اور بھائی کی طرف سے بہت فکرمند رہتی تھی لیکن فرید بھائی کی نوکری کا معاملہ تھا۔ ملک چھوڑنا ہی پڑا وہ اماں اور شاہ زیب کے حالات سے باخبر رہنے کی پوری کوشش کرتی۔ بے ترتیب اور بدنظم زندگی نے اماں اور شاہ زیب کے مزاج اور صحت پر بہت برا اثر ڈالا۔ اماں کوشش کرتیں کہ طاہرہ کو ہر طرح تسلی دیں چند ماہ اور گزرے کہ ایک دن ناصر نے گھر آکر شازیہ سے کہا ”اگر فرصت ہے تو چلو کہیں ضروری جانا ہے۔“

”کہاں؟“ شازیہ حیرت سے بولی۔

”چلو راستے میں بتاتا ہوں بچوں کو کچھ دیر کے

لئے ماموں کے ہاں چھوڑیں گے۔"

گاڑی میں بیٹھ ناصر بولے "ہوسکتا ہے جو بات میں تم سے کہنے جارہا ہوں تمہیں اچھی نہ لگے یا میرا تم سے یہ سب کہنا اچھی بات نہ ہو لیکن نہایت مجبوری میں میں تم سے یہ سب کہہ رہا ہوں۔"

"آخر ایسی کیا بات ہے؟" شازیہ سخت پریشانی کے عالم میں بولی۔ "تمہارے بھائی کے گھر ہو آئیں پھر بات کرتا ہوں۔"

"اب بتایئے کیا بات ہے؟" بچوں کے چھوڑنے کے بعد شازیہ بے چینی سے بولی۔

"مجھے چند دن پہلے فرید کا فون آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ طاہرہ بہت پریشان ہے کتنے ہی دنوں سے اسے اماں اور اپنے بھائی کی کوئی خبر نہیں۔ بھائی اور بھابی کے نمبروں پر فون کرتی ہے مگر کوئی فون نہیں اٹھاتا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں معلومات حاصل کروں کہ کیا معاملہ ہے؟ میں اسی دن طاہرہ کی والدہ کے گھر گیا' معلوم ہوا کہ فرناز جان بوجھ کر طاہرہ کا فون نہیں سنتی۔

شاہ زیب کا فون کتنے دنوں سے بند پڑا ہے کیونکہ وہ سخت بیمار ہے۔ ہر وقت کے غصے اور چیخنے چلانے سے اس کا بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے۔ کم اور بے قاعدہ خوراک نے صحت تباہ کردی ہے۔ اس کے اعصاب سخت متاثر ہوئے ہیں۔ چہرہ دائیں طرف سے اور دایاں بازو سن ہورہے ہیں اور صحیح طرح حرکت نہیں کرتے۔ تاہم وہ بات کرلیتا ہے اس نے مجھے بتایا کہ اماں گھر سے غائب ہیں۔"

"غائب ہیں؟" شازیہ سخت حیران ہوئی۔

"ہاں۔" ناصر بولے "شاہ زیب نے فرناز سے پوچھا تو وہ بولی' مجھے کیا معلوم؟ اماں بچی تو نہیں اپنی مرضی سے ہی کہیں گئی ہوں گی۔ یہ جواب صاف بتاتا ہے کہ فرناز اماں کے بارے میں جانتی ضرور ہے مگر بتاتی نہیں۔ میں نے بھی محترمہ سے پوچھا تو یہی کہا کہ مجھے کیا معلوم؟ مجھے اچانک اللہ نے راہ سجھائی۔ تم جانتی ہو اور مجھے طاہرہ بھابی نے بتایا تھا کہ بھابی فرناز سسرال والوں سے زیادہ اپنی ملازمہ کو اہمیت دیتی ہے تاکہ انہیں احساس دلائے کہ تم لوگ میرے لئے اس ملازمہ سے بھی کم اہم ہو۔ میں نے ملازمہ کو جا پکڑا تھوڑی سی ڈانٹ ڈپٹ کے بعد اس نے بتایا کہ اماں کمزور ہوگئی ہیں ایک تو عمر کا تقاضا ہے پھر ناقص طرز زندگی سے اکثر بیمار رہتی ہیں ہاضمہ خراب رہتا ہے اس لئے باجی نے انہیں بوڑھوں کے خیراتی ادارے میں داخل کرادیا ہے۔"

"کیا کہا خیراتی ادارہ۔" شازیہ کو سخت حیرت اور صدمہ ہوا۔

"ہاں۔" میں نے شاہ زیب کے علاج اور دیکھ بھال کا بندوبست کروا دیا ہے۔ امید ہے ٹھیک ہوجائے گا۔ میں نے اسے بہت سمجھایا ہے زندگی بے ترتیبی کا نام نہیں اب یہ اس کی مرضی ہے کہ زندگی کس ڈھنگ سے گزارتا ہے بہتر ہے کہ سنبھل جائے۔ البتہ اماں کا مسئلہ ہے فرید کی نوکری کے معاہدے کو ختم ہونے میں پورا ڈیڑھ سال باقی ہے میں چاہتا ہوں کہ اماں کو ہم گھر لے آئیں۔ مجھے معلوم ہے یہ تمہارے لئے خوشگوار فیصلہ نہیں ہے میری طرف سے کوئی زبردستی نہیں تم انکار کرسکتی ہو میں کوئی اور بندوبست کرنے کا سوچوں گا۔"

"نہیں' نہیں اس کی ضرورت نہیں آپ خوشی سے اماں کو لے آئیں۔"

"مجھے اسی جواب کی امید تھی اسی لئے تو میں نے گاڑی اس راستے پر ڈال دی تھی۔" ناصر مسکرائے اور گاڑی روک دی۔ شازیہ نے دیکھا کہ گاڑی بزرگ گھر نامی ادارے کے باہر کھڑی تھی۔





تنقیدی گرہیں

زاہد یعقوب

> مصنفہ نے مختلف حوالہ جات کے ذریعے ثابت کر دکھایا ہے کہ ردتشکیل کا نظریہ بھی خالصتاً مغربی نہیں بلکہ سرقہ ہے۔ منٹو کے افسانے اور اردو ادب میں موجود کئی مثالیں پیش کر دی ہیں مزید براں اس نظریے کا آغاز بھی مشرق سے ثابت کیا ہے۔

ڈاکٹر عارفہ صبح خان کا تحقیقی مقالہ جسے دنیا کے کئی تعلیمی اداروں میں پڑھایا جارہا ہے

''تنقیدی گرہیں'' ڈاکٹر عارفہ صبح خان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے۔ مصنفہ موصوفہ اردو ادب اور ادبی دنیا میں کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں اور پاکستان کے مقتدر اردو حلقوں میں ممتاز مقام رکھتی ہیں۔ وہ زیرک نقاد، محقق، شاعرہ، ادیبہ، معلمہ، صحافی، اینکر، ڈراما نگار، کالم نگار، مزاح نگار اور دانشور ہیں۔ بیسیوں خطابات، شیلڈز اور ایوارڈ وصول کر چکی ہیں الغرض بہت متحرک، سیماب صفت شخصیت، معاون اور مرنجاں مرنج انسان ہیں۔

تنقیدی گرہیں کتابی شکل میں ان کے مقالے بعنوان ''اردو تنقید کا نیا منظر نامہ۔ جدید مغربی تنقید کے تناظر میں'' موجود ہے۔ ۵۵۲ صفحات پر مشتمل مذکورہ

یم کتاب مصنفہ کی کثیر العلمی پر دال ہے۔ اس کتاب و دس مرکزی اور متعدد ذیلی ابواب میں تقسیم کر کے دو تنقید کو مغربی تنقید کے تناظر میں رکھ کر صد سالہ رصے (۱۹۱۱ء تا ۲۰۱۱ء) پر محاکمہ کیا ہے۔

مصنفہ کی حس انتقاد کی تیزی کا اندازہ اس کتاب ے پہلے صفحے پر موجود انتساب سے ہی کیا جا سکتا ہے ہ وہ سماج، سیاست، صارفیت، تاریخیت اور دیگر عاملات پر کس قدر گہری نہ صرف نظر رکھتی ہیں بلکہ نذاب حقیقت کے بعد اس چیز کا اظہار نہایت کارانہ ہے۔ لکھتی ہیں:

پی ایچ ڈی مغرب میں بی اے کے چار سال اور ارے ہاں ایم اے میں سولہ سال بعد، ایم فل، پی چ ڈی میں مزید آٹھ سال بعد یعنی ۲۴ سالوں کی سلسل ریاضتوں کے بعد نصیب ہوتی ہے اور اتنے ال پڑھ کر' محنت و ریاضت کر کے ملتا کیا ہے...... کاغذ کا ایک ٹکڑا!

اول مصنفہ نے تنقید کی تعریف کی ہے پھر نقاد ون ہے؟ نقاد کیا ہے؟ اس کے فرائض کیا ہیں؟ اس ے بعد اس مقالہ کا مقصد لکھتے ہوئے تنقید کی افادیت و اجاگر کرنے اور اس کے مستقبل کے خطوط کو عارنے کی کوشش کی ہے۔ دیباچہ صفحہ نمبر 15 سے فحہ نمبر ۲۵ تک (۱۱) صفحات تک طویل ہے۔ دیباچہ صرف مصنفہ کی اس عظیم کاوش کے لیے ہونے والی نت شاقہ، لگن اور عقیدت کو ظاہر کرتا ہے بلکہ ساتھ ہی اتھ ہمارے معاشرے میں ان کرداروں کا تعاقب ی کرتا ہے جو کسی محنتی، مخلص اور شرفاء کو آگے آنے ینا بالکل پسند نہیں کرتا، کہیں حسد، کہیں بغض، کہیں قابت اور کہیں اپنی کم علمی، کم مائیگی، کم ظرفی اور پست ہنیت کو ہتھیار بنا کر حق اور انصاف اور میرٹ کا گلا ھونٹا جاتا ہے۔ یہ دیباچہ ہر اس فرد کے لیے ایک بڑا رک ہے کہ حالات چاہے کتنے ہی ناساز گار ہوں لاف ہوں یا کوئی مطابقت نہ بنتی ہو پھر بھی ہمیں اپنا راستہ بنانا پڑتا ہے۔ اہم بات یہ روایتی دیباچوں سے بالکل ہٹ کر لکھا گیا ہے، اس میں جدت اور ندرت کا رنگ موجود ہے۔ اگلے ابواب میں مصنفہ نے سوئس ماہر لسانیات فرڈیننڈ سوئسر (بزعم خود جدید تنقید کا بانی) کے نظریات اور شخصیت کی تحلیل نفسی کی ہے اور جس نے مشرقی نظریات تنقید کو سرقہ کر کے اپنا خود ساختہ کر کے بیچا ہے، مصنفہ نے تحقیق کر کے اس کو معروضی انداز میں سر عام رکھ دیا ہے۔

زبان و بیان اور لسانی اعتبار سے اگر ساری کتاب کو دیکھیں تو کتابت کی غلطیوں کی بھر مار ہے۔ اس میں قصور مصنفہ کا نہیں کہ وہ خود زبان و بیان پر پوری گرفت رکھتی ہیں اور اس کی ماہر ہیں جیسا کہ ان کے تعارف میں آچکا ہے کہ وہ ہمہ جہت ادیب ہیں۔ یہ غلطیاں کاتب کی نااہلی کا ثبوت ہیں۔ نہایت ضروری ہے کہ اس کتاب کا اگلا شمارہ جلد شائع ہوتا کہ کتاب کی توقیر میں مزید اضافہ ہو۔ انداز بیان اور اسلوب نہایت شستہ ہے لیکن نہایت عالمانہ ہے اور اس قدر کہ یہ کتاب قطعی طور پر عام قاری کے لیے نہیں ہے بلکہ صرف اور صرف فلسفہ، تنقید اور فلسفہ تنقید کے شُد بُد رکھنے والوں کے لیے نعمت ہے۔ کہیں کہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اردو کے الفاظ کی موجودگی کے باوجود بہت سے الفاظ انگریزی کے لاشعوری طور پر استعمال کیے گئے ہیں جن کے لیے اردو کے زیادہ رعب دار الفاظ استعمال کیے جا سکتے ہیں اور شاید اگلے شمارے میں اس پر مصنفہ نظر ثانی بھی کریں۔

مذکورہ بالا چیزیں کسی طور کتاب کی اہمیت، قد کاٹھ اور معرفت کو کم نہیں کرتیں لیکن ان کے درست ہونے سے کتاب کا انداز ہی بدل سکتا ہے۔ اگر اصل مقالہ زیر نظر ہوتا تو دونوں کا تقابل کرنا آسان ہوتا اور زیادہ بہتر ہوتا۔ لیکن اصل مقالہ چونکہ دسترس میں نہ تھا اس لیے صرف سامنے موجود کتاب پر اکتفا کرتے ہوئے سفارشات عرض کی گئی ہیں۔

جہاں تک مواد اور اس کی رسائی اور مصنفہ کی موضوع کے ساتھ انصاف کی بات ہے تو اس پر کوئی بات نہیں ہوسکتی۔ جتنا کشٹ اس تحقیق کے لیے اٹھایا گیا ہوگا۔ جتنی عرق ریزی کی گئی ہوگی۔ جتنا خون جگر پلایا گیا ہوگا۔ جتنا راحت و آرام کے سامان کو غارت کیا گیا ہوگا۔ جتنی راتوں اور دن کی قربانی دی گئی ہوگی وہ سب اس کتاب کے ایک ایک لفظ سے جھلکتا ہے۔

ہر لفظ، ہر جملہ، ہر اقتباس سے مصنفہ موصوفہ نے نہ صرف انصاف کیا ہے اس کا حق ادا کیا ہے بلکہ بہت سے ایسے نظریات و معاملات کا استرداد کیا ہے جو نہ صرف اردو تنقید میں روا سمجھے جاتے ہیں بلکہ ان کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے۔ مصنفہ نے مشرقی و مغربی تنقید کا جائزہ لیتے ہوئے نہایت غیر جانبداری کا اور معروضیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ جہاں مغربی تنقید اور نقادوں کی بات کی اہمیت مسلمہ ہے اس کو نہ صرف تسلیم کیا ہے بلکہ اس کے مطابق اس کا اظہار بھی کیا ہے۔ مصنفہ نے مغربی نظریات اور تنقید کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کیا ہے بلکہ جہاں جہاں تحقیق میں ان کو جو کمی نظر آئی جہاں نقالی نظر آئی جہاں چھاپ نظر آئی جہاں منافقت نظر آئی وہاں وہاں مصنفہ نے حقائق پیش کرتے ہوئے چہروں سے نقاب اُتار کر اصلی چہرے پیش کر دیئے ہیں۔ اصولی طور پر اس کتاب کا ترجمہ مصنفہ کی نگرانی میں انگریزی میں ہو کر مغرب کو پیش کیا جانا چاہیے تاکہ مغرب کو ان اصل حقائق کا پتا چل سکے جن سے ان کو پچھلی کئی صدیوں سے چھپا کر نقاب ڈال کر پیش کیا جاتا رہا ہے اور آج بھی کیا جارہا ہے۔ اسی طرح جہاں مصنفہ نے مغربی تنقیدی نظریات کی حقیقت کو آڑے ہاتھوں لیا ہے وہاں انہوں مشرقی تنقید خصوصاً اردو تنقید اور نقادوں کو بھی اسی کسوٹی پر رکھ کر پرکھا ہے اور یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ اردو کے ناقدین (معدودے چند) نے صرف صارفیت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا کر اپنا چھوٹا قد بڑا بنانے کی کوشش میں اردو تنقید کی لٹیا ڈبونے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

کتاب میں یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ مغرب مکار، عیار، چالاک، موقع پرست اور منافق ہیں اور سرقہ، نقل اور دھوکے سے مشرق سے سب کچھ لے کر گئے ہیں اور اپنا بنا کر پیش کرتے ہیں۔ جبکہ مشرق کاہل، سست، غبی، کام چور اور تساہل پسندی کا شکار ہو کر صرف جگالی کرتے اور تعریف و توضیحات کے ڈونگرے برسا کر امان ڈھونڈتے ہیں۔ تحقیق کا فقدان، وسائل کی کم یابی، غربت، تحقیقی و تنقیدی شعور کا مسلسل انحطاط، خود غرضی، اور حسد نے اپاہج بنا دیا ہے۔ یہی وجہ دیگر شعبہ ہائے زندگی اور دنیا کی طرح تنقید بھی زبوں حالی کا شکار رہی ہے اور مغرب سے ابھی بھی کم از کم نصف صدی پیچھے اور مقام میں نیچے ہے۔

باب اول آٹھ صفحات پر مشتمل مختصر مگر جامع باب ہے۔ اس باب میں کتاب کے موضوع کا مکمل تعارف کروا کر اس کی اہمیت کو سامنے لایا گیا ہے پھر اس موضوع کی تحقیق کے مقاصد کو بیان کیا ہے۔ موضوع پر موجود مواد کیا، کتنا اور کہاں ہے اس کا جائزہ پیش کیا ہے اور محاکمہ کرتے ہوئے تجاویز دی گئی ہیں۔ چونکہ کسی بھی موضوع پر تحقیق کرنے کے لیے کسی مقصد کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے متعلقہ موضوع پر مفروضات قائم کیے جاتے ہیں اور پھر انہی مفروضات کی روشنی میں ان پر تحقیق کر کے حقائق پیش کر ان کو ثابت کیا جاتا ہے۔ اسی باب میں مصنفہ نے جدید اردو تنقید کے سو سالہ دور کا تقابلی جائزے کی تصویر کشی کا خاکہ پیش کیا ہے اس لیے کتاب کے مقاصد اور حقائق کو سمجھنے کے لیے اس باب کی اہمیت بہت زیادہ ہے کیونکہ اسی باب کا جواب باقی نو ابواب میں دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

کتاب کا دوسرا باب تمام ابواب میں اہم ترین ابواب میں سے ایک ہے یہ ۵۶ صفحات پر پھیلا ہوا ہے اس میں مصنفہ نے اول اردو تنقید کے جدید دور کا آغاز

ساف حسین حالی سے کیا ہے اور جدلیاتی طریقہ کار ے تحت دور حاضر کے ناقدین تک بیان کیا ہے۔ اس ے بعد جدید مغربی ناقدین اور ان کے نظریات پر سیاتی، عملی، اطلاقی، تاریخی اور توضیحی تنقید کی ہے اور قیق کر کے سوئسر کے لسانی وتنقیدی نظریات کے خود اختہ بانی ہونے کا بھانڈا پھوڑا ہے اور مذکورہ نقاد کے ریات کے آغاز کو سوئسر کی بجائے سنسکرت سے بت کیا ہے اور سوئسر کو جعل ساز قرار دیا ہے اس ضمن بجا بوقت ضرورت ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی تحقیق ے حوالہ جات بھی پیش کیے گئے ہیں۔ مثلاً:

''میں نے سوسیور کی سوانح عمری کی سوانحی تفصیل ں کھوج کی اور یہ انکشاف ہوا کہ سوسیور نہ صرف سکرت جانتا تھا، بلکہ انڈو یورپین کے علاوہ پیرس اور یوا میں سنسکرت پڑھاتا بھی رہا''۔

(تنقیدی گرہیں۔ص ۶۵)

مصنفہ نے سوئسر کے نظریات کو ژاک دریدا، کٹر گوپی چند نارنگ اور اپنی تحقیق سے حوالہ جات اور ثالوں کے ساتھ توضیح وتشریح کر کے بیان کیا ہے۔ ں باب کے اندر آخر میں جدید تنقیدی اصطلاحات کو ہایت صراحت اور عام فہم انداز میں سمجھانے کی کوشش ں گئی ہے یہ اس حوالے بھی نہایت اہمیت کا حامل ہے لہ میدان تنقید کے مبتدیوں کے ان کا جاننا از بس روری ہے۔ جن اصطلاحات کو اس باب میں عالمانہ ر وقیع انداز میں بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہیں۔

۔ڈسکورس (Discourse)
۔پیراڈائم (Paradigm)
۔اپس ٹیمی (Episteme)
۔بیانیہ (Narrative)
۔مہابیانیہ (Narrative-Meta)
۔بین المتونیت (Intertextuality)
۔گلوبالائزیشن (Globalization)
۔لوگومرکزیت (Logocentrism)
۹۔افتراق والتوا (Difference)
۱۰۔نوآبادیات (New-Colonialism)
11۔یوٹوپیا (Utopia)
12۔تشکیلی حقیت (Hyperreality)
13۔شبیہہ (Simulacrum)
14۔اپوریا (Aporia)
15۔صوت مرکزیت (Phonocentrism)
16۔صارفیت (Consumerism)
17۔نسائی تشکیلات (Feminism)
18۔پسماندہ اور دلت (Subaltern)
19۔ ا?یڈیالوجی (Ideology)
20۔برقیاتی ذہن (MindElectrical)

تیسرا باب ۴۷ صفحات تک طویل ہے۔ اس باب میں مصنفہ نے ہئیت پسندی، نظریات اور مسائل پر بحث کی ہے اس کے بعد مارکسیت کے اسباب، مباحث، عروج و زوال، ثمرات، ادب و تنقید میں اثرات اور نتائج پر انتہائی پر مغز سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ اسی باب کے آخر میں اردو تنقید میں سب سے دقیق سمجھے جانے والے نظریات یعنی ساختیات اور پس ساختیات کے آغاز، مباحث اور نتائج پر سائنسی انداز میں قلم اٹھایا ہے۔ ہئیت پسندی کے حوالے سے مصنفہ نے روسی نقاد وکٹر شکلووسکی (Victor Shklovsky) کے نظریات کو سراہا ہے۔ مصنفہ نے بیان کیا ہے کہ چونکہ اس کا تعلق روس سے تھا اس لیے اس نظریے کا آغاز اور پرداخت روس میں ہوئی اسی کے ساتھ مصنفہ نے ہئیت پسندی سے اخذ شدہ روسی نظریہ اجنبیانہ (Defamiliarization) پیش کر کے سیر حاصل نکات بیان کیے ہیں۔ کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز کو کون نہیں جانتا، ہئیت پسندی کے نظریے کے کارل مارکس کا مشہور زمانہ نظریہ مارکسزم پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد باب کے آخر میں ساختیات اور پس ساختیات کے نظریات پر تمام

حوالوں سے بات کی گئی اور بہت سارے سوالات اٹھائے گئے ہیں۔ مصنفہ کے اسلوب کی سب سے زبردست خوبی یہ ہے کہ وہ جس موضوع پر بات کرتی ہیں اس میں موجود سوالات کو ادھورا نہیں چھوڑتیں اور ضد برائے ضد والے مباحث میں ناسور پر چیرا لگا ڈالتی ہے۔

ساختیات اور پس ساختیات کی بحث میں مصنفہ نے جہاں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کو بہت سے حوالوں سے سراہا ہے وہاں ساختیات کی ابتدا کو مغرب میں تسلیم کرنے میں نیم رضامندی ظاہر کرنے پر تحفظات کا اظہار کرتے ہوئے اعتراضات بھی کیے ہیں۔ مثلاً انہوں نے ساختیات کے ضمن میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے معذرت خواہانہ انداز کو ان کی زبان میں پیش کیا ہے:

''......بودھی فکر کے ان نکات اور سوسیور کے خیالات اور دریدا کے نظریہ افتراق (Difference) میں حیرت انگیز مطابقت اور مشابہت ہے۔ بودھوں کے یہاں یہ نکتہ بالکل سوسیور سے ملتا جلتا ہے......''۔

مصنفہ نے یہ اقتباس ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی کتاب ''ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات'' ص ۳۴۹ سے نقل کیا ہے۔ اس کے بعد مصنفہ لکھتی ہیں: ''ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے یہ جملے لکھ کر مشرق کو مغرب کے آگے دو زانو کر دیا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہندوستان سے باقاعدہ تحریک چلتی کہ اہل مغرب ان کے قدیم علوم پر اپنے لیبل لگا کر کیوں پیش کر رہے ہیں اور جدید مغربی نظریات ہندستانی علوم کا چربہ ہیں۔ لہٰذا اس سرقہ اور چربہ پر عالمی عدالت سے رجوع کرنا چاہیے تھا''۔

اس کے بعد مصنفہ نے ساختیات پر اعتراضات اٹھا کر منطقی سوالات بھی پیش کیے ہیں جو ابھی تک لاینحل ہیں۔

باب چہارم ۶۴ صفحات کے طول وعرض میں پھیلا ہوا ہے۔ اس میں پہلے ردتشکیل یعنی ساخت شکنی کو موضوع قلم بنایا گیا ہے اور امریکی طرز تنقید کی فطری عجلت کی کمزوریوں کو کھول کر بیان کیا گیا ہے پھر اسی موضوع کو آگے بڑھاتے ہوئے ردتشکیل میں موجود افتراقی عناصر کی نشاندہی کرتے ہوئے مکمل وضاحت اور امکانات کو سامنے رکھا گیا ہے۔ اس کے بعد تفہیمیت، تعبیریت اور مظہریت کے رجحانات اور امکانات کو بیان کیا گیا ہے۔ آخر میں نطشے کے قول اور قاری کی پیدائش اور مصنف کی موت کے لایعنی مباحث پر سائنسی طریق پر جامع اور مدلل گفتگو کی گئی ہے۔ ردتشکیل کے ضمن میں مصنفہ نے ژاک دریدا (Derrida Jacques) کے نظریہ ردتشکیل (Deconstruction) کے جواب میں نہ صرف منطقی جواز فراہم کیے ہیں بلکہ نئے اور انتہائی اہمیت کے سوالات بھی پیش کیے ہیں جن کے جوابات دریدا کے پیروکار ابھی تک دینے سے قاصر ہیں۔ پھر مصنفہ نے مختلف حوالہ جات کے ذریعے ثابت کر دکھایا ہے کہ ردتشکیل کا نظریہ بھی خالصتاً مغربی نہیں بلکہ سرقہ ہے۔ منٹو کے افسانے اور اردو ادب میں موجود کئی مثالیں پیش کر دی ہیں مزید براں اس نظریے کا آغاز بھی مشرق سے ثابت کیا ہے۔ قاری کی پیدائش اور مصنف کی موت کے حوالے سے مصنفہ موصوفہ نے نہ صرف اپنی ذاتی تحقیق پیش کی ہے بلکہ اس نظریہ کو غلط ثابت کرتے ہوئے دلائل کے انبار لگا دیئے ہیں۔ یہاں مصنفہ نے اطلاقی تنقید کو پورے طور استعمال کیا ہے۔ اصل میں انہوں نے رولاں بارتھ (Roland Barthes) کے نظریے اور ذات کی تحلیل نفسی کرتے ہوئے سارا کچا چٹھا کھول دیا ہے کہ مغرب کی عجلت پسندی کا نتیجہ بکھرے ہوئے، غیر منطقی طرز استدلال، روایت سے بغاوت اور خاص طور پر صارفیت کو بطور ہتھیار استعمال کرنے کی کوشش کرتے

بے وقوف

پولیس: تمہارا دوست کیسے مر گیا؟
بے وقوف: پتا نہیں سر......
بس اُس نے کہا کہ میرے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔
پولیس: تو پھر؟
بے وقوف: تو میں نے اُسے چوہے مارنے والی دوائی کھلا دی۔

ہیں اور اس کے لیے سرقہ ان کا مرغوب ہتھیار ہے۔

پانچواں باب ۳۵ صفحات میں جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے مسائل کو بیان کرنے، اس کی وضاحت، اس کا رد و اعتراف اور ان کے ثمرات و اثرات پر بیان ہے۔

چھٹا باب 38 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس باب میں تاریخیت، نو تاریخیت، نوآبادیات، پس نو آبادیات، ردنو آبادیات اور صارفیت کے فلسفیانہ، سماجی، سیاسی، عصری اور تاریخی مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے اس ضمن میں مصنفہ نے خاص طور پر ایڈورڈ سیڈ (Edward Said) کی کوششوں اور جرأت مندانہ اجتہاد کو سراہا ہے اور نو آبادیات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ہر قسم کی انارکی کا پول کھولتے ہوئے آئینہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔

کتاب کا آٹھواں باب مبتدین اور جوئیندگان تنقید کے لیے نہایت اہم ہے۔ یہ باب 39 صفحات پر مشتمل ہے اس باب میں مصنفہ نے چند مشہور خود ساختہ نظریہ ساز مغربی ناقدین کا مکمل تعارف، شخصیت اور ادبی و تنقیدی کارناموں کا اجمالی تذکرہ کیا ہے۔ پھر مشرقی ناقدین میں انہوں نے صرف تین ناقدین ایڈورڈ سیڈ، ایہاب حسن اور گائتری سپیوک چکرورتی کا انتخاب کر کے ان کی جرأت مندانہ ادبی مسائل اور نظریات کو اجمالاً بیان کیا ہے۔ باب کے آخری حصے میں مصنفہ نے صرف جدید اور قدآور یعنی جن کے نظریات اور بیانیے میں دم خم ہے پیش کیا ہے ان میں گوپی چند نارنگ، وزیر آغا، فہیم اعظمی، ناصر عباس نیر اور ضمیر علی بدایونی ان کے نظر انتخاب اور معیار تنقید پر پورے اُترتے نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر سلیم اختر اور ڈاکٹر وحید قریشی تو ویسے بھی نقاد سے زیادہ محقق ہیں اور تنقیدی نظریات اور خاص طور جدید نظریات میں مصنفہ نے ان کو اس بحث سے کنارہ کش رکھا ہے۔

نواں باب صرف 20 صفحات پر مشتمل ہے لیکن اختصار کے باوجود یہ باب کتاب دوسرے بڑے ابواب پر حاوی ہے کیوں کہ اس باب کے اندر مصنفہ نے تنقید کا مرکز اٹھا کر دیا ہے اس کی جگہ کیا ہے؟ اس کا مقام کیا؟ اردو تنقید کہاں کھڑی ہے؟ جدید علوم سے اس کا کیا واسطہ ہے؟ اشتراکات اور مماثلتیں کیا کیا ہیں؟ ابعاد کیا ہیں؟ ذمے داریاں کیا ہیں؟ تقاضے کیا ہیں؟ اور سب سے بڑھ سو سالہ تنقید کا جائزہ لیتے ہوئے اردو تنقید کا مستقبل کیا ہے؟ ان تمام سوالات کے جامع جوابات بیان کیے ہیں

آخری باب کتاب کے تنقیدی نظریاتی، تحقیق اور مقالے کا نچوڑ ہے ۲۵ صفحات پر مشتمل نتائج ہیں۔ اس میں مصنفہ نے جدلیاتی انداز میں نہ صرف محاکمہ کرتے ہوئے تمام مفروضات جو اس تحقیق کے لیے قائم کیے گئے تھے ان کے مدلل، سائنسی اور منطقی جوابات پیش کیے ہیں۔ زیادہ تر نظریات کا رد کیا ہے۔ اور پھر اردو تنقید کے نئے امکانات اور مستقبل کے لیے نہایت اہم اور قابل غور تجاویز پیش کی ہیں۔ کتابیات سے مصنفہ کی علم دوستی، محنت، عرق ریزی، موضوع سے انصاف، معروضیت اور خاص طور پر تنقید سے انصاف صاف دکھائی پڑتا ہے۔



کتاب زیست کا ایک یادگار باب

ایم بی انجم

میں نے سلطان راہی سے کہ ”جناب لگتا ہے میرا ساتھ آپ کو اچھا نہیں لگا‘ کیونکہ میری اور مبین کی گفتگو کے دوران آپ کے منہ سے ہوں ہاں کے علاوہ ایک لفظ بھی سننے کو نہیں ملا اور میں یہ بتانا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ میں آپ کا ہمسفر اپنی مرضی سے نہیں بلکہ مبین ملک کے مجبور کرنے پر بنا ہوں.....“

ایک انسان کی جدوجہد اور کامیابی کی جستجو کی کہانی

سپیشل اسسٹنٹ ٹو کمشنر زون کی اہم ترین پوسٹ تصور کی جاتی ہے کیونکہ اسلام آباد ہیڈ کوارٹر' ملک کے دیگر شہروں اور شعبوں' زون کے سبھی افسروں اور ٹیکس گزاروں کی جانب سے موصول ہونے والی ڈاک ایس اے نے مختصر نوٹس (NOTES) کے ساتھ کمشنر صاحب کو پیش کرنی ہوتی ہے۔ اور ان سب خطوط وغیرہ پر کمشنر صاحب کی ہدایات کے مطابق ان کے ڈرافٹ لیٹرز ٹائپ کروا کے باس کے دستخطوں کے لئے پیش کرنے ہوتے ہیں اور کچھ کے جوابات براہ راست اپنے

دستخطوں کے ساتھ روانہ کرنے ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ سیٹ متعلقہ افسر کی نوٹنگ اور ڈرافٹنگ کی بہترین صلاحیت کی متقاضی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں اسے زون کے سبھی انتظامی امور کی نگرانی کرنی ہوتی ہے۔ نیز زون میں افسروں اور اہلکاروں کی ٹرانسفر، پوسٹنگز اور سٹاف کو دی جانے والی ترقیوں میں کمشنر صاحب کے مدد ومعاون کا کردار بھی ادا کرنا ہوتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ ایس اے کمشنر صاحب کے بہت سے اختیارات میں حصہ دار ہوتا ہے۔ اس چارج کی اہمیت کا اندازہ مجھے پہلے بھی تھا تاہم اس کا عملی تجربہ یوں ہوا کہ چارج سنبھالتے ہی سیالکوٹ میں تعینات افسر بھی بطور خاص مجھے مبارکباد دینے آئے۔ واضح ہو کہ سیالکوٹ جو شعبہ انکم ٹیکس میں اب زون سے بھی اوپر یعنی ایک ریجن کا درجہ رکھتا ہے اس وقت محض گوجرانوالہ زون کی ایک رینج ہوا کرتا تھا۔ اسسمنٹ ورک سے ہٹ کر اس قسم کی انتظامی سیٹ پر میری یہ پہلی پوسٹنگ تھی۔ یہاں سرکل کی نسبت کام بہت زیادہ تھا اور اس کی نوعیت بھی مختلف تھی مگر محنت کا تو میں اوائل عمری ہی سے عادی تھا اس لئے کام سنبھالنے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ تاہم روز کا روز کام نمٹانے کے لئے مجھے دفتری اوقات کے بعد تک آفس میں رُکنا پڑتا تھا۔ ویسے بھی شاہانہ مزاج کمشنر صاحب کی عادت تھی کہ وہ صبح دفتر خاصی دیر سے آتے مگر پھر شام کے بعد تک دفتر میں بیٹھے کام نمٹاتے اور فون پر دوست احباب سے گپ شپ کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ جب تک وہ آفس میں ہوتے مجھے بھی وہاں موجود رہنا پڑتا اور یوں مجھے اکثر گوجرانوالہ سے لاہور واپسی کا سفر رات کو کرنا پڑتا۔

کام بخوبی چل رہا تھا کہ ایک روز کمشنر صاحب نے مجھے بلا کر کہا کہ ”انجم آپ کو اپنا ایس اے مقرر کرتے وقت میرے علم میں نہیں تھا کہ آپ بھی ان پانچ افسروں میں شامل ہیں جو سروس کے لئے روزانہ لاہور اور گوجرانوالہ کے درمیان محو سفر رہتے ہیں۔ آپ ایک فیملی مین ہیں آپ کو اس سیٹ پر ہونے کی وجہ سے روزانہ گھر دیر سے پہنچنا پڑتا ہے اس لئے اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو زون کے کسی اچھے سرکل میں پوسٹ کر کے یہاں کسی مقامی افسر کی تقرری کر لیتا ہوں۔“ میں نے کہا کہ ”سر آپ اگر بطور ایس اے میری کارکردگی سے مطمئن نہیں ہیں تو پھر بے شک مجھے ٹرانسفر کر دیں ورنہ مجھے گھر دو تین گھنٹے دیر سویر سے پہنچنے کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ اور یوں مجھے میری اس سیٹ پر برقرار رکھا گیا۔

اسی سال پرائیویٹ اور پبلک لمیٹڈ کمپنی کیسز میں اسسمنٹ کے معیار کو بہتر بنانے کے لئے سنٹرل بورڈ آف ریونیو کی جانب سے قانون میں ایک اہم تبدیلی کی گئی جسے پینل سسٹم کا نام دیا گیا۔ اس قانون کے نفاذ سے قبل کمپنیز سرکل میں تعینات سترہ یا اٹھارہ گریڈ کا ایک تجربہ کار افسر اکیلا ہی ہر کمپنی کیس کے ٹیکس کی تشخیص و تکمیل کرتا تھا مگر نئے سسٹم کے تحت اب یہ اختیار ایک کی بجائے تین افسروں کو سونپ دیا گیا۔ یعنی 19 گریڈ کا ایک افسر بطور چیئرمین اور سترہ اور اٹھارہ گریڈ کے دو افسر بطور ممبر پینل مل کر ہر کمپنی کیس کو ڈیل کیا کریں گے۔ ہمارے اس زون میں دو کمپنی سرکل تھے، ایک گوجرانوالہ میں اور دوسرا سیالکوٹ رینج میں۔ نئے قانون پر عملدرآمد کے لئے میں نے دو پینلز کے لئے چھ افسروں کی بائی نیم تجویز بنا کر فائل کمشنر

صاحب کو بھیجی تو انہوں نے گوجرانوالہ پینل کے ایک اٹھارہ گریڈ کے افسر کا نام کاٹ کر اس کی جگہ میرا نام ڈال دیا۔ ساتھ ہی سپیشل اسسٹنٹ ٹو کمشنر کے لئے گوجرانوالہ کے رہائشی ایک افسر کا نام لکھ کر فائل ڈرافٹ آرڈر کے لئے واپس بھیج دی۔ میں کمشنر صاحب کے اس غیر متوقع فیصلے کو دیکھ کر فائل سمیت اندر گیا تو میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی کمشنر صاحب ہنس کر کہنے لگے ''مجھے پتا تھا کہ تم اس خوشگوار سرپرائز پر فوراً میرا شکریہ ادا کرنے آؤ گے۔''

میں نے کہا کہ ''سر میرے لئے یہ سرپرائز ہرگز خوشگوار نہیں ہے۔ میں تو آپ کے ساتھ اپنی اس پوسٹنگ کو انجوائے کر رہا ہوں۔''

کہنے لگے ''انجم! تمہاری نو سال کی سروس کے مقابلے میں میرا پچیس سالہ تجربہ بہت زیادہ ہے۔ آپ ابھی سروس میں اپنے بھلے برے کو پوری طرح نہیں سمجھتے ہو گریڈ سترہ اور اٹھارہ میں انکم ٹیکس افسر کا اصل کام اسسمنٹ ورک ہوتا ہے۔ گریڈ 19 اور اس کے بعد وہ سپروائزری افسر ہو جاتا ہے۔ اس وقت تک اگر وہ کام نہیں جانتا تو وہ اپنے ماتحتوں سے بھی کام نہیں لے سکتا۔ تم اب گریڈ اٹھارہ میں ہو اور یہی وقت ہے کہ تم پرائیویٹ اور پبلک لمیٹڈ کمپنیوں کے بڑے بڑے کیسز کو ڈیل کرنا سیکھو۔ بے شک تمہاری نوٹنگ ڈرافٹنگ بہت اچھی ہے اور تم محنتی بھی ہو جس سے مجھے بڑی سہولت ہے مگر میں اپنی آسانی کے لئے تمہارا کیریئر داؤ پر نہیں لگا سکتا۔ تمہارے لئے دو سینئر افسروں کی معیت میں کام سیکھنے کا بہت اچھا موقع ہے' شاباش جاؤ آپ کو پینل کی ممبر شپ مبارک ہو۔'' اور یوں میری کمشنر آفس سے رخصتی ہو گئی۔

میں جس پینل کا حصہ بنا اس میں گریڈ 19 کے افسر جناب جاوید طاہر بٹ چیئرمین' جبکہ میرے ساتھ مجھ سے دو سال سینئر آغا سرور رضا قزلباش ممبر تھے۔ بٹ صاحب مثبت سوچ کے مالک ایک انتہائی شریف آدمی اور نیک نیت انسان تھے جبکہ قزلباش صاحب ضرورت سے زیادہ ہوشیار چالاک اور سوچ اور نیت میں بٹ صاحب کے بالکل برعکس تھے۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ گوجرانوالہ میں اس وقت تک انکم ٹیکس کے دفاتر یکجا نہیں ہوئے تھے اور شہر کے مختلف حصوں میں کوٹھیاں کرائے پر لے کر انہیں دفاتر کی شکل دی گئی تھی اس لئے پینل کے چیئرمین جناب جاوید طاہر بٹ کا دفتر شہر کے کسی اور حصے میں تھا جبکہ میرا اور قزلباش صاحب کا مشترکہ آفس ان کے دفتر سے قدرے دور ایک اور کوٹھی میں تھا۔ پینل میں کمپنی کیسز کی خاصی بڑی تعداد کے پیش نظر روزانہ کئی کئی کیسز کی سماعت کرنا ہوتی تھی اس لئے دفتروں میں دوری کی وجہ سے ہر کیس کی سماعت کے لئے پینل کے تینوں افسروں کا ایک جگہ اکٹھے ہونا قریباً ناممکن تھا۔ آغا سرور رضا قزلباش صاحب گزشتہ دو تین سال سے کمپنی سرکل کے انچارج افسر کے طور پر سارے کیسز بلاشرکت غیرے نمٹا رہے تھے اب انہیں اپنا یہ اختیار تقسیم ہوتا دکھائی دیا تو انہوں نے دفتروں کے درمیان دوری اور بٹ صاحب کی شرافت کا ناجائز فائدہ اٹھانے کے لئے ایک لاجواب سکیم سوچی۔ وہ چیئرمین کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگے کہ ''سر ہر کیس کی مشترکہ اور متحدہ سماعت تو حالات حاضرہ میں ممکن نہیں۔ آپ اگر ہم دو پینل ممبرز پر اعتماد کریں تو سارے کمپنی کیسز ہم دونوں افسروں کے درمیان

برابر برابر بانٹ دیں۔ ہم اپنے دفاتر میں بیٹھے کیسز کی سماعت کرتے رہیں گے۔ جب بھی جس ممبر کا کیس مکمل ہوگا وہ فائل لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوجایا کرے گا۔ اگر آپ اس کی فائل اسسمنٹ سے مطمئن ہوں گے تو ہم تینوں افسر اس کے اسسمنٹ آرڈر پر دستخط کردیا کریں گے۔''

بٹ صاحب بھی ہر کیس کی سماعت میں شمولیت کی زحمت گوارا کرنے کے موڈ میں نہیں تھے اس لئے انہوں نے قزلباش صاحب کی اس تجویز سے اتفاق کرلیا اور یوں ایک کایاں فیلڈ افسر کم از کم گوجرانوالہ میں سی بی آر کی اس پالیسی پر پانی پھیرنے میں کامیاب ہوگیا جس کے تحت ہیڈکوارٹر کمپنی کیسز میں اسسمنٹ ورک کے معیار کو بہتر بنانا چاہتا تھا۔ گو کہ اس طرح دو سینئر افسروں کی معیت میں کام سیکھنے کا موقع میرے ہاتھ سے جاتا رہا مگر میں پینل میں جونیئر موسٹ ہونے کی وجہ سے حالات حاضرہ کے تحت کوئی اعتراض کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا چنانچہ اس منفرد سکیم کے تحت تمام کمپنی کیسز کی ایک لسٹ ٹائپ ہوئی جسے ہم دونوں پینل ممبرز لے کر چیئرمین صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے' جہاں قزلباش صاحب نے گزارش کی کہ ''سر بجائے اس کے کہ آپ اس لسٹ میں درج پہلے آدھے کیسز ہم میں سے ایک افسر اور بعد والے نصف دوسرے افسر کے حوالے کردیں انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ آپ اس لسٹ میں موجود کیسز کو طاق اور جفت کے انداز میں بانٹ دیں۔ یعنی ایک' تین' پانچ' سات اور نو وغیرہ نمبر والے کیسز مجھے دے دیں اور دو' چار' چھ' آٹھ اور دس نمبر وغیرہ والے کیسز انجم صاحب کے حوالے کردیں۔''

قزلباش صاحب کی اس انصاف پسندی پر بٹ صاحب تو عش عش کر اُٹھے مگر مجھے صرف خوشگوار حیرت ہوئی کیونکہ میں اپنے اس ساتھی ممبر کی خصلت سے بخوبی واقف تھا۔ بہرحال یہ لسٹ اسی فارمولے کے تحت دو لسٹوں میں تبدیل ہوکر کیسز ہم دونوں افسروں میں بانٹ دیئے گئے۔ سابقہ کمپنی سرکل کے عملے میں کچھ اضافہ کرکے سٹاف بھی ہم دونوں افسروں کو الگ الگ دے دیا گیا۔ پینل میں کام شروع ہوگیا۔ کمپنی کیسز میں کھاتے چونکہ کروڑوں اربوں میں ہوتے ہیں اور ان میں اکاؤنٹس بھی نان کمپنی کیسز کی نسبت قدرے مختلف انداز میں بنے ہوتے ہیں۔ اس لئے میرے جیسے ناتجربہ کار اور نوآموز افسر کو ان بڑے بڑے کیسز میں آمدنی اور ٹیکس کے تعین میں جہاں کوئی دشواری پیش آتی میں فائل اُٹھا کر برابر والے کمرے میں بیٹھے اپنے سینئر اور تجربہ کار افسر آغا سرور رضا قزلباش صاحب کی خدمت میں حاضر ہوجاتا اور وہ اس کیس کے اکاؤنٹس کے بغور معائنہ کے بعد میری مدد فرما دیتے۔ اب میں اور قزلباش صاحب چونکہ ایک ہی دفتر میں بیٹھتے تھے اس لئے وہ اپنے اور میرے وقت اور پٹرول کی بچت کا ایک فارمولا بھی سامنے لے آئے۔ وہ علامہ اقبال ٹاؤن کے ستلج بلاک میں رہائش پذیر تھے جبکہ میں گلشن راوی کے ای بلاک میں۔ کہنے لگے کہ ''انجم ایسا کرتے ہیں کہ گوجرانوالہ جانے کے لئے صبح دونوں اپنی اپنی گاڑی پر نکل کر لیڈی ولنگڈن ہسپتال میں اکٹھے ہوا کریں گے جہاں ایک گاڑی پارکنگ میں چھوڑ کر دُوسری پر سفر کیا کریں گے۔ اس مقصد کے لئے ایک ہفتہ آپ کی گاڑی استعمال ہوگی اور دوسرے ہفتے میری۔'' اور

یوں لاہور اور گوجرانوالہ کے درمیان روزانہ اکٹھے سفر کا بھی آغاز ہوگیا۔

کافی ہفتے گزر گئے پینل کے کیسز قزلباش صاحب کی منفرد سکیم کے تحت فائنل ہوتے گئے۔ ایک روز جبکہ قزلباش صاحب اپنے دفتر میں موجود نہیں تھے ان کا سٹینو گرافر جو کہ افسر کا پرسنل اسسٹنٹ بھی ہوتا ہے میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ ''سر میں بڑی رازداری سے آپ کو بتانے آیا ہوں کہ اس پینل کے کیسز کی تقسیم کے وقت قزلباش صاحب آپ کے ساتھ ہاتھ کر گئے ہیں۔''

میں نے پوچھا ''وہ کیسے؟'' تو اس نے بتایا کہ ''سر آپ کو پتا ہے کہ میں گزشتہ دو تین سال سے اس سرکل میں ان کا پی اے ہوں۔ اس لئے انہوں نے تمام کمپنی کیسز پر مشتمل دو لسٹیں میرے حوالے کرتے ہوئے کہا تھا کہ ان دو فہرستوں کو ایک لسٹ کے طور پر ٹائپ کرتے ہوئے فہرست نمبر ایک کے سارے کیسز طاق نمبروں پر رکھنے ہیں اور دوسری فہرست کے کیسز جفت نمبروں پر اور یوں وہ اچھے اچھے اور اپنے مطلب کے کیسز اپنے پاس لے گئے ہیں اور آپ کو چھوٹے چھوٹے اور کچرا ٹائپ کیسز ملے ہیں۔ علاوہ ازیں آپ جس کیس میں ان سے کچھ سمجھنے جاتے ہیں وہ بہانے سے ان کے اکاؤنٹس کی کوئی نہ کوئی خامی تلاش کرکے اس ٹیکس گزار کے وکیل کو بلا کر اس سے معاملہ طے کر لیتے ہیں۔''

سٹینو گراف کے اس انکشاف پر دل تو بہت دکھا مگر میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی سٹاف ممبر کو افسروں میں پھوٹ ڈالنے کی شہ ملے اس لئے میں نے اسے کہا کہ ''برخوردار! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ دراصل میں نے ہی قزلباش صاحب سے کہا تھا کہ میں چونکہ کمپنی کیسز کے لئے ناتجربہ کار ہوں اس لئے مجھے بہت بڑے بڑے کیسز نہ دینا' اس وجہ سے انہوں نے مجھے چھوٹے کیسز دیئے ہیں۔'' مزید کچھ کہے سنے بغیر میں نے قزلباش صاحب کی انصاف پسندی کا پردہ چاک کرنے والے اس کے پی اے کو واپس بھیج دیا کہ آپ میرے ایک خیر خواہ کی حیثیت سے یہ بات مجھے بتانے آئے ہو اس لئے آپ کا شکریہ۔ میں یہ بات آپ کے باس تو کیا کسی اور سے بھی نہیں کروں گا۔ یقین جانئے میں نے اس بات کا تذکرہ پینل کے چیئرمین جناب جاوید طاہر بٹ صاحب سمیت کسی سے بھی نہیں کیا کیونکہ اس سے پینل میں بدمزگی پیدا ہوتی اور ابھی مجھے نہ جانے کب تک اس سیٹ اپ (SET UP) کا حصہ رہنا تھا۔

ان دنوں گوجرانوالہ میں ایک بہت اچھا ہوٹل زیرِ تعمیر تھا جس کا نام اس کے مالکان نے شیراٹن (SHERATON) اور ہلٹن (HILTON) جیسے مشہور زمانہ ہوٹلوں کے ناموں کو ملا کر شیلٹن (SHELTON) ہوٹل رکھا تھا۔ اس کے مالکوں میں سے ایک قزلباش صاحب کا دوست تھا اس لئے ہوٹل کی تعمیر مکمل ہونے پر جب اس کے لئے باورچی بھرتی کئے جانے لگے تو روزانہ کسی نہ کسی اُمیدوار سے مختلف کھانے پکوا کر اس کا ٹیسٹ لیا جاتا تھا۔ چنانچہ ان کھانوں کا ذائقہ چکھنے کے لئے ہم دونوں افسروں کو ہر روز ہوٹل میں بلا لیا جاتا اور یوں ہم کئی ہفتے تک مزے مزے کے پکوان لنچ کے طور پر شیلٹن ہوٹل سے کھاتے رہے۔

شیلٹن ہوٹل کے ان پکوانوں کے ذکر سے یاد آیا کہ گوجرانوالہ ویسے بھی اپنے کھانوں اور کھانے

والوں کی وجہ سے پاکستان بھر میں شہرت یافتہ ہے۔ لذت کے معیار کے لحاظ سے اس شہر کے باربی کیو کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ چکن، مٹن اور بیف کے علاوہ ایک خاص موسم میں چڑے نامی ایک ننھے منے پرندے کا باربی کیو گوجرانوالہ کی وہ خاص ڈش ہے جو وطن عزیز پاکستان کے کسی اور شہر میں دستیاب نہیں۔ یہ بدنصیب پرندہ ہر سال سائبیریا کی حیات کش برف باری کے موسم میں غول در غول پاکستان کے بہترین چاول پیدا کرنے والے اس علاقے میں پناہ لینے کے لئے اپنے وطن سے ہجرت کرتا ہے مگر افسوس کہ اسے یہاں جان کی امان نہیں مل پاتی اور یہ گوشت خور قوم اسے مختلف طریقوں سے شکار کرکے باربی کیو کی صورت میں پیٹ کا ایندھن بنا لیتی ہے۔ گوجرانوالہ کے کھانوں بلکہ کھابوں کی شہرت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ لاہور، سیالکوٹ اور فیصل آباد جیسے شہروں سے کھانے کے شوقین لوگ بطور خاص خوش خوراکوں کے اس شہر کا رُخ کرتے ہیں۔ گوجرانوالہ کے باسیوں کی خوش خوراکی کے علاوہ بسیار خوری بھی مشہور ہے (اپنے دوستوں منصور احمد باجوہ اور حاجی عابد حسین سے معذرت کے ساتھ)۔ میرا مشاہدہ ہے کہ لاہور میں ہونے والی شادی کی تقریبات میں کھانے سے متعلق معاملات طے کرتے وقت کیٹررز خاص طور پر پوچھتے ہیں کہ بارات گوجرانوالہ سے تو نہیں آ رہی؟ کیونکہ اس شہر سے آنے والے باراتیوں کے لئے کھانے کی مقدار میں تقریباً پچاس فیصد اضافہ کرنا پڑتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ لاہور کے ایک معروف ریسٹورنٹ نے فی کس کے حساب سے ریٹ مقرر کرکے ہائی ٹی (HIGH TEA) شروع کی تو گوجرانوالہ کے بسیار خوروں کو جس روز شرارت سوجھتی وہ تیس چالیس کی ٹولی کی شکل میں لاہور آ کر اس ریسٹورنٹ پر دھاوا بولتے اور بفے کی صورت میں دو سو گاہکوں کے لئے رکھی گئی اشیائے خورونوش کا صفایا کرکے چلے جاتے اور ریسٹورنٹ کے مالکوں کو اس روز ہائی ٹی کا سیشن جلد ختم کرنا پڑ جاتا۔

اسی طرح پیزا ہٹ والوں نے ایک مخصوص ریٹ پر ''آل یو کین ایٹ اینڈ ڈرنک'' نامی ایک سکیم شروع کی تو اہل گوجرانوالہ نے چند روز ہی میں انہیں یہ سکیم ختم کرنے پر مجبور کردیا کیونکہ وہاں کا ایک ایک آدمی چھ چھ نارمل گاہکوں جتنے پیزے کھا جاتا تھا۔ گوجرانوالہ ہی سے تعلق رکھنے والے ہمارے ٹی وی ڈراموں اور سٹیج کے لیجنڈ اداکار سہیل احمد کے بقول گوجرانوالہ کے لوگوں کی تو ہر بات کی تان کھانے ہی پر ٹوٹتی ہے۔ اگر ان سے پوچھا جائے کہ پشاور سے آنے والی خیبر میل ٹرین گوجرانوالہ سٹیشن پر کتنے بجے پہنچتی ہے؟ تو جواب ہوگا کہ دوپہر کے کھانے سے ایک گھنٹہ پہلے۔ اور پوچھا جائے کہ سینما ہالوں میں رات کے شو کتنے بجے شروع ہوتے ہیں؟ تو کہیں گے کہ ڈنر کے ڈیڑھ گھنٹہ بعد۔

میرے ہم زلف جناب کریم نواز جب اپنی سروس کے ایک مرحلے پر پی ٹی سی ایل کے ڈائریکٹر کے طور پر گوجرانوالہ میں تعینات تھے تب وہ اکثر لاہور سے اپنے عزیز و اقارب کی فیملیز کو بطور خاص باربی کیو کی دعوت پر وہاں بلایا کرتے تھے۔ سبھی لوگ اپنی اپنی گاڑیوں پر دوپہر کے وقت گوجرانولہ شہر کے قریب تر واقع ایک پارک نما خوبصورت مقام نندی پور پہنچ جاتے جہاں شہر کے کسی معروف ریسٹورنٹ کے کاریگر باربی کیوں تیار کرنے کیلئے

موجود ہوتے۔ پُرفضا ماحول میں آب رواں کے کنارے وہاں گرما گرم لذیز باربی کیو کا جو مزہ آتا وہ بیان سے باہر ہے۔کھانے کا اتنا طویل ذکر چلا ہے تو کچھ تذکرہ پینے کا بھی ہونا چاہئے۔تو دوستو! معاف کرنا یہ پینا وہ نہیں ہے جس کے ذکر سے شاعروں کے دیوان بھرے پڑے ہیں اور مرزا غالب نے کہا تھا کہ

غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روز ابر و شب ماہتاب میں

یہ محض سافٹ ڈرنکس کا پینا ہے۔ ہوا یوں کہ ایک روز میں دفتر سے گھر پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سافٹ ڈرنکس کے پانچ چھ کریٹ ہمارے لاؤنج میں رکھے ہیں۔میں نے بیگم صاحبہ سے پوچھا کہ کوکا کولا' فانٹا اور سپرائٹ کی اتنی ساری بوتلوں کے ایک ساتھ منگوانے کی کیا شان نزول ہے؟ کہنے لگیں کہ ''بیوریج کمپنی کی ایک گاڑی سے دو آدمیوں نے یہ کریٹ اُتار کر ہمارے گھر کی بیل بجائی تو میں نے انہیں کہا کہ آپ شاید یہ غلط جگہ پر اُتار رہے ہیں۔ جس پر انہوں نے وہ چٹ دکھائی جس پر لفظ انجم صاحب اور ہمارے گھر کا ایڈریس لکھا تھا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ یہ بوتلیں کس نے بھجوائی ہیں؟ تو کہنے لگے کہ یہ تو ہم نہیں جانتے کہ کس نے بھجوائی ہیں۔ ہمیں تو گوجرانوالہ سے ہمارے فیکٹری منیجر کا حکم ہوا ہے۔''

میں سمجھ گیا کہ یہ حسن احسن نے سرپرائز دیا ہے۔ گوجرانوالہ کی ایک بیوریج فیکٹری میں سنٹرل ایکسائز کے انچارج اہلکار کے طور پر متعین کسٹم ڈیپارٹمنٹ کے اس نوجوان انسپکٹر سے چند روز قبل تعارف ہونے پر اس سے ایک لمبی نشست ہوئی تھی اور اس نے باتوں باتوں میں میرے گھر کا ایڈریس بھی پوچھا تھا۔ ہماری سسٹر سروس سے تعلق رکھنے والے اس مہربان نے میرا نام اس فہرست میں ڈلوایا تھا جنہیں وہ سافٹ ڈرنکس تحفے کے طور پر بھجواتے رہتے تھے۔ بعدازاں گوجرانوالہ اور لاہور میں ان سے متعدد ملاقاتیں رہیں جو دوستی کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں اور وہ خوبصورت تعلق ہم دونوں کی سروس سے ریٹائرمنٹ کے بعد اب تک قائم و دائم ہے۔ میری گوجرانوالہ سے ٹرانسفر ہوجانے کے باوجود وہ جب تک وہاں کی بیوریج فیکٹری میں تعینات رہے میرے گھر سے سافٹ ڈرنکس کبھی ختم نہیں ہوئے۔

ایک روز جبکہ میں اور آغا صاحب میری گاڑی میں گوجرانوالہ پہنچے تھے انہوں نے کہا کہ برادر آج ہم اپنے باس سے اجازت لے کر دفتری اوقات ختم ہونے سے دو گھنٹے پہلے لاہور کے لئے واپسی اختیار کریں گے کیونکہ ملتان سے میرے دوست سید یوسف رضا گیلانی نے ملک کی معروف گلوکارہ ناہید اختر سے دوسری شادی رچالی ہے اور آج شام میرے گھر میں اس نوبیاہتا جوڑے کی دعوت ہے۔ آپ اگر ان سے ملنا چاہیں تو بیگم کے ساتھ آسکتے ہیں۔ میں نے یہ کہہ کر اس دعوت میں شرکت سے معذرت کرلی کہ ''سر! یہ دو فیملی فرینڈز کا ذاتی معاملہ ہے کسی اجنبی کی وہاں موجودگی اچھا تاثر نہیں چھوڑے گی۔''

اس واقعہ کے بیس برس بعد سید یوسف رضا جب 2008ء میں وزیراعظم پاکستان بنے تو آغا سرور رضا قزلباش کی یہ دوستی اور دعوت رنگ لائی۔ وہ اس وقت گریڈ 20 میں کمشنر آف انکم ٹیکس کے عہدے پر فائز تھے۔ انہیں فی الفور گریڈ 21 میں

ترقی دے کر پرائم منسٹر سیکرٹریٹ میں ایڈیشنل سیکرٹری مقرر کردیا گیا اور پھر کچھ ہی عرصہ بعد انہیں وزارت مذہبی امور کے فیڈرل سیکرٹری کا چارج دے دیا گیا۔ یاد رہے کہ چار ارب روپے کی مبینہ کرپشن کا حج سکینڈل اسی دور میں وقوع پذیر ہوا تھا جس میں وزیراعظم اور سیکرٹری صاحب کا تو بال بیکا نہیں ہوا تھا جبکہ سارا نزلہ اس وقت کے مذہبی امور کے وزیر اور ڈائریکٹر جنرل حج پر گر گیا تھا۔ حامد سعید کاظمی صاحب کی تو وزارت ہی جاتی رہی تھی۔ یہ سیاستدانوں اور بیوروکریٹس کی باہمی دوستی کی ایک یادگار مثال تھی۔

گوجرانوالہ میں میری پوسٹنگ کو دو سال ہونے کو تھے۔ یہاں چارج بہت اچھا تھا اور روزانہ کے سفر سے بھی مجھے کوئی مسئلہ نہیں تھا کیونکہ آتش ابھی جوان تھا اور جوان میں تھکاوٹ نام کی شے کہاں قریب پھٹکتی تھی۔ مگر لاہور میں رہتے ہوئے اب اپنے خوابوں کے اس شہر میں نوکری کرنے کے لئے جی مچلتا تھا۔ مشکل یہ تھی کہ اسلام آباد ریجن سے میری اس وقت تک ٹرانسفر نہیں ہوسکتی تھی جب تک کہ احد اللہ اکمل صاحب ممبر انکم ٹیکس کے طور پر سی بی آر میں موجود تھے اس لئے کہ ایک سینئر بیوروکریٹ کے کہنے پر انہوں نے ہی حیدر آباد سے میری ٹرانسفر اس ریجن میں کی تھی۔ کرنا خدا کا یہ ہوا کہ مالی سال کے اختتام سے قبل ہی ان کی ممبر انکم ٹیکس والی سیٹ سے ٹرانسفر ہوگئی اور ان کی جگہ خواجہ طارق صاحب بطور ممبر انکم ٹیکس آ گئے۔ ہمارے ڈیپارٹمنٹ کے یہ سینئر افسر ڈی ایم جی سے میرے بیچ میٹ اور دوست خواجہ صدیق اکبر کے بہنوئی تھے۔ میرا یہ دوست کھلے ڈھلے مزاج کا سچا کھرا یار باش قسم کا انسان تھا۔ اس کا تعلق سیالکوٹ کے مسلم لیگی رہنما خواجہ صفدر کی فیملی سے تھا۔ حسن اتفاق سے صدیق اکبر کی پوسٹنگ بھی ان دنوں سیال انڈسٹریز کارپوریشن میں گوجرانوالہ ہی میں تھی۔ اس کی رہائش شادمان لاہور میں فاطمہ میموریل ہسپتال کے قریب واقع جی او آر میں تھی اور وہ بھی میرے طرح لاہور اور گوجرانوالہ کے درمیان روزانہ سفر کرنے پر مجبور تھا۔

میری اس سے اس کے دفتر اور گھر میں اکثر ملاقات رہتی تھی۔ ایسی ہی ایک ملاقات میں میں نے خواجہ صدیق اکبر سے کہا کہ ”آپ کی مدد سے میرا تو لاہور اور گوجرانوالہ کے درمیان سفر ختم ہوسکتا ہے۔“ پوچھنے لگا کہ ”وہ کیسے؟“ میں نے کہا کہ ”آپ اگر اپنے بہنوئی سے کہہ دیں تو لاہور ریجن میں میرا تبادلہ انہی کے اختیار میں ہے۔“ اپنے مخصوص انداز میں کہنے لگا ”گل ای کوئی نئیں بادشاؤ (یعنی یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے)“ اور اس کے ساتھ ہی اسلام آباد اپنی ہمشیرہ کو فون کرکے لاہور ٹرانسفر کے لئے میرا نام لکھوا دیا۔ ظاہر ہے بھائی کا کہا بہن نہیں ٹال سکتی تھی اور آگے بیگم کے حکم کے سامنے خاوند دم نہیں مار سکتا تھا اور یوں اگست 1989ء میں میری ٹرانسفر اسلام آباد ریجن سے لاہور ریجن میں ہوگئی۔

صد شکر کہ ٹرانسفر لاہور ریجن میں ہوگئی مگر کراچی، حیدر آباد اور لاہور گوجرانوالہ کے درمیان اڑھائی برس سے جاری سفر جیسی مسافت کے جاری رہنے کا خطرہ ابھی سر پر منڈلا رہا تھا اس لئے کہ یہ ریجن واہگہ بارڈر سے شروع ہوکر پنجاب اور سندھ کے درمیانی بارڈر تک پھیلا ہوا تھا۔ تب لاہور، ساہیوال، خانیوال،

وہاڑی، ملتان، بہاولنگر، بہاولپور اور رحیم یار خاں کے اضلاع اس میں شامل تھے اور ان سبھی ضلعی مراکز کے علاوہ ان کی تحصیلوں میں بھی انکم ٹیکس کے دفاتر موجود تھے چنانچہ پوسٹنگ کہیں بھی ہو سکتی تھی۔ ابھی لاہور میں تعیناتی کے لئے سفارش کی تلاش میں تھا کہ خوبئ قسمت سے لاہور شہر میں پوسٹنگ ہو گئی۔ روزانہ سفر سے گلوخلاصی اور اپنے خوابوں کے شہر میں افسری کا احساس خاصا مسحور کن تھا۔ یہاں میری تعیناتی نابھہ روڈ پر واقع مین انکم ٹیکس بلڈنگ کے ایسٹ زون میں ہوئی۔ اس وقت میرا بیچ میٹ اور دوست مبین ملک بھی اسی عمارت میں تعینات تھا جو تب ایک سرکاری افسر سے زیادہ معروف فلمی اداکارہ انجمن کے خاوند کی حیثیت سے جانا پہچانا جاتا تھا۔ دفتر میں میرا زیادہ اٹھنا بیٹھنا اسی کے ساتھ تھا۔ تاہم ایسٹ زون ہی میں تعینات محمد اسلم بھٹی نامی افسر سے بھی دوستی ہو گئی جو ابھی دو برس قبل ہی انکم ٹیکس سروس میں آیا تھا۔ وہ ایک ہنس مکھ اور حس مزاح سے معمور خوش مزاج نوجوان تھا۔ بنیادی طور پر انجینئر تھا اور سی ایس ایس کرنے سے قبل پنجاب گورنمنٹ کے کسی ادارے میں گریڈ سترہ کا افسر تھا۔ وہ کسی وجہ سے انکم ٹیکس سروس سے مطمئن نہیں تھا اور اس تذبذب میں تھا کہ یہاں رہے یا انکم ٹیکس سروس کو خیر باد کہہ کر واپس اپنے صوبائی محکمے میں چلا جائے جہاں ابھی تک اس کی واپسی کا در کھلا تھا۔

اس نے اپنا یہ مسئلہ مجھ سے شیئر کیا تو میں نے اس سے پوچھا کہ وہ جس صوبائی محکمے سے ادھر آیا ہے وہاں ترقی کے چانسز کیا ہیں؟ اس نے بتایا کہ وہاں گریڈ بیس کا صرف ایک افسر ہے جو پورے صوبہ پنجاب کا انچارج ہے۔ اس پر میں نے اسے کہا کہ ایک تو انکم ٹیکس ڈیپارٹمنٹ کا نام اس کے سابقہ محکمے سے بڑا ہے اور پھر یہاں اس کی نسبت محکمانہ ترقی کے مواقع کہیں زیادہ ہیں کیونکہ اس فیڈرل سروس میں 90 فیصد افسروں کے گریڈ بیس تک پہنچنے کے امکانات روشن ہیں اور اگر قسمت یاوری کرے تو اس سے آگے بھی ترقی خارج از امکان نہیں۔ اس لئے وہ اپنے سابقہ محکمے کی کسی ایک آدھ اضافی خوبی کو فراموش کر کے یکسوئی سے انکم ٹیکس سروس میں رہنے کا مصمم ارادہ کر لے۔ میرے ان دلائل کے پیش نظر وہ ہمارے محکمے کا ہو کر رہ گیا۔ گزرتے وقت کے ساتھ اپنی سروس بخیر و خوبی مکمل کر کے وہ گریڈ بیس میں بطور کمشنر انکم ٹیکس ریٹائر ہوا۔ ملازمت کا زیادہ تر حصہ وہ ماڈل ٹاؤن ایکسٹینشن میں واقع سرکاری گھروں میں مقیم رہا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ ڈی ایچ اے لاہور میں ایک خوبصورت ذاتی گھر بنا کر بیوی بچوں کے ساتھ ہنسی خوشی رہنے لگا مگر افسوس کہ زندگی نے اس کے ساتھ زیادہ وفا نہ کی اور میرا وہ دوست گزشتہ سال کینسر جیسے موذی مرض کا شکار ہو کر اس جہان فانی سے رخصت ہو گیا۔ اللہ کریم اس کے درجات ہمیشہ بلند رکھے۔

کچھ ایسے بھی اُٹھ جائیں گے اس بزم سے جن کو
تم ڈھونڈنے نکلو گے مگر پا نہ سکو گے

ایسٹ زون لاہور کے جس سرکل میں میری پوسٹنگ تھی وہاں میرے باس منیر قریشی صاحب تھے جو ایک مدبر اور وضعدار انسان تھے۔ ایچی سن کالج جیسے نامی گرامی تعلیمی ادارے سے فارغ التحصیل تھے اس لئے انگریزی بہت خوبصورت لکھتے اور بولتے تھے۔ ماتحت افسروں کے کام میں زیادہ مداخلت نہیں کرتے تھے اس وجہ سے ان کا عنایت نامی ایک

انسپکٹر ماتحت سرکل افسروں کے لئے خاصا بااختیار تھا۔ اسی زون کی ایک دوسری رینج میں جناب امتیاز انجم چودھری گریڈ 19 میں تعینات تھے جو جونیئر افسروں کے ساتھ اپنے مربیانہ اور مشفقانہ رویئے کے باعث خاصے ہر دلعزیز تھے۔ مجھے بھی جب کبھی کسی دفتری مسئلے پر رہنمائی کی ضرورت پڑتی میں انہی سے مشاورت کرنا پسند کرتا۔

سرکاری سطح پر استوار ہونے والا وہ تعلق فیملی فرینڈشپ میں ڈھل کر اس درجہ دور رس ثابت ہوا کہ 29 برس بعد جولائی 2018ء میں جناب امتیاز انجم چودھری اپنی بیگم صاحبہ' بیٹے بیرسٹر احمد عزیز بسرا اور اس کے بیوی بچوں سمیت لاہور سے بطور خاص کوالالمپور آ کر میرے بیٹے فہد انجم کی شادی کی تقریبات میں شریک ہوئے۔ بلکہ یہاں آنے سے پہلے امریکہ میں مقیم اپنے دوست غلام سرور ناصر سے بھی کہہ دیا کہ میری فیملی جولائی کے آخری دو ہفتوں کے لئے ملائیشیا میں ہوگی اگر اس خوبصورت ملک کی سیاحت کا شوق ہو تو اس دوران ہمیں وہاں جوائن کرلیں چنانچہ وہ میاں بیوی بھی شادی کی تقریبات میں میرے مہمانوں میں شامل ہوگئے۔ اور یوں یہ دو خاندان بھی پاکستان' بھارت متحدہ عرب امارات' برطانیہ اور امریکہ سے ملائیشیا آ کر میری عزت و توقیر کا باعث بننے والے محسنوں کا اہم حصہ بن گئے۔

دفتری مصروفیات کے علاوہ شام و سحر میرے اپنے تھے اس لئے فراغت میں سسرالی رشتے داروں کے علاوہ اپنے پرانے ساتھیوں سے ملنے نکل جاتا۔ دونی چند سٹریٹ' چوک جین مندر میں اپنے گجر دوستوں سے ملتا تو ''پڑھا کو استاد جی'' کی پرانی انارکلی چوک کے مشہور فالودے اور باداموں والے دودھ سے ایسی تواضع ہوتی کہ مزہ آ جاتا۔ ان میں سے کوئی بھاگ کر تاش کی گڈی اُٹھا لاتا اور کہتا ''استاد جی آج برسوں بعد تاش کی دو بازیاں تو بنتی ہیں نا'' اور میں انہیں مایوس نہ کرتا۔ کینال پارک گلبرگ میں سید برادران سے ملاقات ہوتی تو منظور عباس کہتا ''ماسٹر جی آپ کا یہ شاگرد نالائق ہی رہا' اردو پڑھ اور بول تو لیتا ہے مگر لکھ نہیں سکتا'' اور میں یہ کہہ کر اس کی ڈھارس بندھاتا کہ ''لکھنا تو ابھی تیرے ماسٹر جی کو بھی نہیں آتا تجھے کیسے آئے گا۔''

میرا سابقہ محکمہ بیورو آف ایجوکیشن نئے معرض وجود میں آنے والے ایجوکیشن فاؤنڈیشن نامی ایک ادارے میں ضم ہوکر اپنا وجود کھو چکا تھا اور میرے سابقہ ساتھی مختلف محکموں میں کھپا دیئے گئے تھے۔ اس لئے ان سے ایک جگہ ملاقات کے امکانات معدوم ہوچکے تھے تاہم کبھی کبھار کسی سے کہیں ملاقات ہوجاتی تو پرانی یادیں تازہ کرنے کا موقع میسر آ جاتا۔ جیل روڈ پر واقع پرانا ریس کورس ایک وسیع و عریض خوبصورت پارک کی شکل اختیار کرچکا تھا۔ نیا ریس کورس کوٹ لکھپت کے علاقے میں گھڑدوڑ جیسی سپورٹ کو زندہ رکھے ہوئے تھا مگر میرا ریس کورس کا مستقل ساتھی آغا حسن نقوی اب متحدہ عرب امارات میں فیملی کے ساتھ قیام پذیر تھا اور پاکستان فلم انڈسٹری کے چاکلیٹ ہیرو وحید مراد جس سے گپ شپ کی کشش ہمیں ہر اتوار ریس کورس کھینچ لے جایا کرتی تھی راہی ملک عدم ہوچکا تھا۔ اس لئے ریس کورس جانے کے لئے کچھ نہیں بچا تھا۔

میرے شاگرد خاص غلام علی نے تو معمول بنالیا تھا کہ وہ شادباغ میں واقع اپنے ذاتی گھر میں مہینے

میں ایک دو بار ہمیں ضرور کھانے پر بلا لیتا تھا۔ اپنے اور اپنی بیگم کے ہاتھوں کے پکے لذیذ کھانوں پر ادب و احترام کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ایسی ایسی کمال جگتیں زناتا کہ جن کا مجھ سے کوئی جواب نہ بن پاتا۔ ان دنوں لاہور ابھی امن و امان کا گہوارہ تھا اس لئے رمضان المبارک کے مہینے میں میرا یہ معمول تھا کہ سحری کا وقت ختم ہونے سے کچھ وقت پہلے کھانے پینے سے فارغ ہوکر گاڑی لے کر نکل جاتا اور باجماعت نماز فجر کبھی بادشاہی مسجد میں کسی روز داتا دربار والی مسجد میں اور زیادہ تر باغ جناح میں واقع مسجد دارالسلام میں ادا کرتا۔ یوں بھی اس شہر کی جن سڑکوں پر بیس برس قبل بھوکے پیٹ سارا سارا دن پیدل مارچ کرنے پر مجبور تھا ان پر اپنی ذاتی کار ڈرائیو کرنے کا جو لطف مجھے آیا اس کا صحیح احساس کسی سیلف میڈ شخص ہی کو ہوسکتا تھا۔ شاید ایسے ہی احساسات کی ترجمانی کے طور پر شاعر نے کہا تھا کہ

ہم سے پوچھو...... بہار جلوہ دوست
ہم نے فرقت کے دن گزارے ہیں

اسی سال 16 نومبر 1989ء کو اللہ رب العزت نے ہمیں ایک بیٹے کی صورت میں تیسری اولاد سے نوازا جس کا نام فہد انجم رکھا گیا اور یوں دو بیٹوں اور ایک بیٹی کے ساتھ ہماری فیملی قریباً مکمل ہوگئی۔

ایسٹ زون میں پوسٹنگ کے دوران ایک دلچسپ اور سبق آموز واقعہ پیش آیا جو کچھ یوں ہے کہ معروف فلمی اداکارہ انجمن کے پہلے شوہر کی حیثیت سے شہرت پانے والے مبین ملک سول سروس اکیڈمی میں میرے بیچ میٹ اور انکم ٹیکس سروس میں میرے رفیق کار تھے۔ میری ملازمت کے پہلے دس برس چونکہ کراچی، حیدرآباد اور گوجرانوالہ میں گزرے اس لئے اکیڈمی ٹریننگ کے قریباً ایک عشرہ بعد مجھے اور مبین ملک کو لاہور میں ایک ساتھ کام کرنے کا موقع میسر آیا۔ ہم دونوں کے دفاتر پرانی انارکلی کے نزدیک واقع مین انکم ٹیکس بلڈنگ میں تھے چنانچہ اوقات کار کے دوران چائے نوشی اور گپ شپ کے لئے ایک دوسرے کے دفتر میں مل بیٹھتے تھے۔ ایک روز وہ میرے دفتر میں تھا تو میں نے اسے بتایا کہ میں اگلے روز دفتر میں نہیں ہوں گا کیونکہ مجھے ایک سرکاری کام سے سنٹرل بورڈ آف ریونیو، اسلام آباد جانا ہے۔ اس نے کہا کہ وہ بھی اگلے تین روز چھٹی پر ہوگا کیونکہ وہ معروف فلمی ہیرو سلطان راہی کے ساتھ سوات کے مشہور صحت افزا مقام کالام جا رہا ہے جہاں اس کی بیگم انجمن ایک فلمی یونٹ کے ساتھ پہلے پہنچ کر شوٹنگ میں مصروف ہے۔ میرے یہ بتانے پر کہ میں صبح سات بجے کی فلائٹ سے جا کر شام کی پرواز سے واپس آ جاؤں گا۔ وہ کہنے لگا کہ ہمیں بھی صبح سویرے ہی محو سفر ہونا ہے مگر بذریعہ کار کیونکہ کالام کے لئے ہوائی سفر کی براہ راست سہولت میسر نہیں ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ بضد ہوا کہ میں اسلام آباد تک ان کے ہمراہ کار میں سفر کروں جس کے باعث دوران سفر تین چار گھنٹے خوب گپ رہے گی۔ چونکہ میرا یہ سفر سرکاری کام کے لئے تھا اس کے استحقاق کے طور پر میں نے جہاز کا ریٹرن ٹکٹ خرید رکھا تھا تاہم مبین کی ضد کے سامنے مجھے ہتھیار ڈالنے پڑے اور میں اسلام آباد تک ان کے ہمراہ کار پر جانے کے لئے راضی ہوگیا کہ چلو ایک طرف کا سفر بائی روڈ کر لیتا ہوں اور واپسی پر بذریعہ ہوائی جہاز آؤں گا۔

اگلے روز اذان فجر کے ساتھ مبین ملک نے اپنی ہنڈا سوک کار پر ڈی ایچ اے سے نکل کر جی او آر ون ریس کورس روڈ سے سلطان راہی کو ساتھ لیا اور وہ دونوں مجھے گلشن راوی سے پک کرنے کے لئے پہنچ گئے۔ سلطان راہی سے چونکہ مبین ملک میرا غائبانہ تعارف کرواچکا تھا اس لئے مجھے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے زیادہ تعارفی کلمات ادانہیں کرنے پڑے۔ میں کار کی پچھلی نشست پر براجمان ہوا تو ڈرائیونگ سیٹ سلطان راہی نے سنبھال لی اور مبین ملک فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ہم یہ سفر بذریعہ جی ٹی روڈ کررہے تھے کیونکہ اس وقت موٹروے ابھی معرض وجود میں نہیں آئی تھی۔

مبین ملک ایک خوش مزاج وخوش گفتار آدمی تھا اس لئے میں اور مبین اکیڈمی ٹریننگ کے دوران پیش آنے والے دلچسپ واقعات کی یاد تازہ کرتے رہے۔ انکم ٹیکس ڈیپارٹمنٹ میں اپنے کچھ سینئرز کے خاکے اُڑاتے رہے۔ فلم انڈسٹری اور سیاست پر بات ہوتی رہی اور لطیفے بازی بھی چلتی رہی تاہم سلطان راہی نے اس گپ شپ میں صرف ہوں ہاں کی حد تک ہی حصہ لیا اور اپنی طرف سے کھل کر کوئی بات نہیں کی۔ میں چونکہ سلطان راہی کے پیچھے والی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا اس لئے یہ بھی نہ دیکھ پایا کہ ہماری اس گفتگو کے دوران اس کے چہرے کے تاثرات کیا تھے۔ کیا وہ ہماری گپ شپ سے بیزار رہا' خوش ہوا یا کہ نارمل رہا۔ بہرحال صبح سویرے شاہراہ پر ٹریفک زیادہ نہ ہونے کے باعث ہم ساڑھے تین گھنٹے میں اسلام آباد پہنچ گئے۔ اس وقت سنٹرل بورڈ آف ریونیو شاہراہ دستور کے بجائے لال مسجد کے قریب ایک پرانی عمارت میں واقع تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھے وہاں ڈراپ کرتے ہم ایک قریبی تھری سٹار ہوٹل میں ناشتے کے لئے رُکے تو حسب عادت مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے سلطان راہی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ''جناب لگتا ہے کہ اس سفر میں میرا ساتھ آپ کو کچھ اچھا نہیں لگا' کیونکہ میری اور مبین کی گفتگو کے دوران ساڑھے تین گھنٹوں میں آپ کے منہ سے ہوں ہاں کے علاوہ ایک لفظ بھی سننے کو نہیں ملا اور میں آپ کو یہ بتانا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ میں آپ کا ہمسفر اپنی مرضی سے نہیں بلکہ مبین ملک کے مجبور کرنے پر بنا ہوں۔ ورنہ میرے پاس تو بذریعہ ہوائی جہاز سفر کرنے کی سہولت بھی موجود تھی۔''

اس پر اس شریف آدمی نے جو جواب دیا وہ مجھے لاجواب کرگیا' کہنے لگا ''انجم صاحب! خدا نہ کرے کہ مجھے اپنے ہمراہ چلنے والے کسی شخص کا ساتھ ناگوار گزرے۔ آپ دونوں تعلیم یافتہ دوست ماشاء اللہ اچھے خوش مذاق اور خوش گفتار ہیں۔ آپ کی فری فرینک قسم کی گفتگو مجھے بڑی پرلطف لگی۔ ہوں ہاں کے علاوہ میں کئی بار مسکرایا بھی اور دو تین بار میں نے برابر میں بیٹھے مبین ملک کی جانب تحسین آمیز نظروں سے بھی دیکھا۔ آپ میرے عقب میں بیٹھے ہوئے تھے شاید اس وجہ سے یہ سب کچھ نہ دیکھ پائے اس کے باوجود اگر آپ کو محسوس ہوا کہ میں آپ کی گپ شپ میں شریک نہیں ہوا تو ایسا میری ایک مجبوری کے باعث ہوا ہے۔ جس سے مبین تو شاید آگاہ ہو مگر آپ نہیں جانتے۔ میں اپنی یہ مجبوری دوستوں پر ظاہر بھی نہیں کرتا مگر آپ کا شکوہ دور کرنے کیلئے بتا رہا ہوں۔ میری وہ مجبوری یہ ہے کہ جب سے خدائے بزرگ و برتر نے مجھ کم شکل اور کم

عقل آدمی کو میری اوقات سے بڑھ کر نوازتے ہوئے دولت، عزت اور شہرت سے مالا مال کیا ہے میں نے اس کی احسان مندی اور شکرگزاری کے طور پر اپنی یہ عادت بنالی ہے کہ بوقت ضرورت ہی بولتا ہوں اور خاموشی کا سارا وقت زیرلب الحمدللہ اور سبحان اللہ کا ورد کرتا رہتا ہوں یا سورہ رحمٰن کی تلاوت میں مصروف رہتا ہوں۔ اس سے میں فضول باتوں کے اظہار سے بچا رہتا ہوں اور مجھے ذہنی سکون اور دل کا قرار بھی میسر آتا ہے۔"

سلطان راہی کا یہ جواب سُن کر مجھے اس سے معذرت کرنا پڑی کہ میں نے اس کی کم گوئی و خاموشی کو غلط انداز میں لیا۔ مبین ملک اور سلطان راہی مجھے سی بی آر میں ڈراپ کرکے آگے روانہ ہوگئے اور میں بہت دیر تک یہ سوچتا رہا کہ فلموں میں گرجدار آواز میں مخالفین کو للکارتے ہوئے گنڈاسے کی مدد سے ان کے کشتوں کے پشتے لگانے والا یہ فلمی ہیرو حقیقی زندگی میں کتنا خدا ترس اور شکرگزار انسان ہے۔ اور پھر جنوری 1996ء میں اسلام آباد سے لاہور کے سفر کے دوران وہ گوجر خان کے قریب ڈاکوؤں کی ستم گری کا شکار ہوگیا تو اخبارات و رسالوں میں اس سے متعلق جو حقائق شائع ہوئے ان سے صحیح معنوں میں اندازہ ہوا کہ وہ شکر خداوندی صرف آیات قرآنی کے ذریعے ہی سے نہیں کرتا تھا بلکہ عملی طور پر بھی اس نے خدمت خلق اور انسان دوستی کے کئی انداز اپنا رکھے تھے۔ اس نے بے شمار بیواؤں، یتیموں اور طالب علموں کے ماہانہ وظائف مقرر کر رکھے تھے۔ وہ نادار والدین کی بیٹیوں کے ہاتھ پیلے کرنے میں ان کی مالی مدد کرتا تھا۔ راولپنڈی کے جس علاقے میں وہ پلا بڑھا تھا وہاں اس نے ایک عالیشان مسجد تعمیر کروائی تھی۔ لاہور میں جہاں اس کی رہائش تھی وہاں کی قریبی مسجد کے زیادہ تر اخراجات وہ خود برداشت کرتا تھا۔ حاجت مند لوگوں اور کم آمدنی والے سٹوڈیو ورکرز کی مدد کرنا اس نے اپنے ذمے لے رکھا تھا اور زلزلے اور سیلاب جیسی آفات ناگہانی کے مواقع پر بھی وہ مصیبت زدگان کی مدد میں کمال فراخدلی کا مظاہرہ کرتا تھا۔ یہ سب جان کر احساس ہوا کہ گوجرانوالہ میں جرائم پیشہ افراد نے ایک شخص کا نہیں بلکہ ان سینکڑوں خاندانوں کا معاشی قتل کیا تھا جن کی کفالت اس مخیّر شخص نے اپنے ذمے لے رکھی تھی۔ اور ستم ظریفی یہ کہ ہماری مستعد ومددگار پولیس آج تک اس اندھے قتل کا سراغ نہیں لگا سکی۔ گویا سلطان راہی کا قتل بھی ہمارے لاتعداد بے موت مارے جانے والے مظلوموں کی طرح خون خاک نشیناں تھا رزق خاک ہوا۔

پرانی انارکلی کے قریب جہاں میرا دفتر واقع تھا اس سے محض چند گز کے فاصلے پر حاجی عبدالرحمٰن ہوٹل واقع تھا جو ساٹھ کی دہائی سے مڈل کلاس لوگوں کی سفید پوشی کا بھرم رکھے ہوئے تھا۔ تاہم میرے زیادہ تر رفیق کار دفاتر میں لنچ کے لئے لاہور ہائی کورٹ بلڈنگ کے بالمقابل مال روڈ پر واقع سالٹ اینڈ پیپر ریسٹورنٹ سے کھانا منگواتے تھے۔ وقت ضرورت افسری کا بھرم قائم رکھنے کے لئے دفتر میں تو میں بھی کھانا وہیں سے منگواتا تھا مگر جب بھی آفس سے نکل کر کھانے کا موقع میسر آتا تو میں اپنی اوقات کو پیش نظر رکھتے ہوئے حاجی عبدالرحمٰن ہوٹل ہی میں جا بیٹھتا جو ربع صدی میں بھی اپنا معیار برقرار رکھے ہوئے تھا۔ مجھے بخوبی یاد ہے کہ تب

سالٹ اینڈ پیپر ریسٹورنٹ سے چکن سینڈوچ کی پلیٹ 35 روپے میں ملتی تھی۔ اس برس مارچ میں جب میں چند روز کے لئے پاکستان میں تھا تو میرے دوست ایڈووکیٹ ساجد وحید سرور نے مجھے اسی سالٹ اینڈ پیپر ریسٹورنٹ میں لنچ پر بلایا تو میں نے مینوکارڈ میں بطور خاص چکن سینڈوچ کی ایک پلیٹ کی قیمت دیکھی جو ناقابل یقین 540 روپے کی تھی گویا تیس برس میں قیمت میں 15 گنا یعنی 1500 فیصد اضافہ ہوا۔ میں تو ملائشیا میں گزشتہ چھ برس سے ہوں مگر یہاں مستقل رہنے والے بتاتے ہیں کہ اس ملک میں اشیائے خورونوش کی قیمتوں میں گزشتہ تیس برسوں میں 100 فیصد کا اضافہ بھی نہیں ہوا' فرق صاف ظاہر ہے۔

ایسٹ زون میں میری پوسٹنگ محض ایک برس رہی اور اگلے برس مجھے ویلتھ ٹیکس زون میں ٹرانسفر کر دیا گیا۔ اس زون کے دفاتر لارنس روڈ پر ایک کرائے کی کوٹھی میں واقع تھے جس میں کمشنر صاحب' ایک گریڈ انیس کے انسپکٹنگ اسسٹنٹ کمشنر اور سترہ اور اٹھارہ گریڈ کے پانچ افسر اپنے عملے سمیت سمائے ہوئے تھے۔ ان میں ظفر لیسین' منظور شاد' جاوید اقبال رانا' ارم عدنان اور میں شامل تھے۔ ویلتھ ٹیکس ایک ہلکا پھلکا سا لگان تھا جو ٹیکس گزاروں کے کل اثاثوں یعنی دولت پر زیادہ سے زیادہ اڑھائی فیصد سالانہ کی شرح سے عائد کیا جاتا تھا۔ چونکہ پورے پاکستان سے اس کی سالانہ وصولی کروڑوں میں یعنی برائے نام ہوتی تھی اس لئے بعد کے برسوں میں پراپرٹی ٹیکس کو سرے سے ختم ہی کر دیا گیا۔ اس زون کے مندرجہ بالا ویلتھ ٹیکس افسروں میں سب سے سینئر میں تھا اس لئے زون کا اہم ترین چار بھی میرے پاس تھا اور لاہور میں رجسٹرڈ تم لمیٹڈ کمپنیوں کے ڈائریکٹرز کے کیسز میرے سر میں ڈیل ہوتے تھے۔

اس زون میں کام زیادہ نہیں تھا اس افسروں کو مل بیٹھ کر گپ شپ کے مواقع کافی زیا تھے جن سے پورا پورا استفادہ کیا جاتا تھا۔ ظفر لیسی گورے چٹے رنگ کے ایک خوش پوش اور دلآ شخصیت کے مالک نوجوان تھے جو مزاج کے لحا سے خوش طبع اور ملنسار واقع ہوئے تھے۔ وہ شعب میں مجھ سے دو سال جونیئر ہونے کے ناطے شفقت کے حقدار تھے مگر میرے لئے اس لحاظ سے قابل احترام بھی تھے کہ انہوں نے میری ایک بیچ میٹ خاتون سے شادی کر رکھی تھی۔ وہ ان دنوں مستقل طور پر لندن میں مقیم ہیں۔ جھنگ سے تعلق رکھنے والے منظور شاد ایک جرأت مند افسر تھے جو ملتان میں اپنی پوسٹنگ کے دوران موجودہ کمشنر ویلتھ ٹیکس کے والد گرامی کو انکم ٹیکس کا نوٹس دینے کی جرأت رندانہ کے باعث اب اپنے باس کے زیرعتاب تھے۔ وہ چیف کمشنر ان لینڈ ریونیو کے طور پر ریٹائر ہو کر ان دنوں لاہور میں ایک لاء فرم بنائے ہوئے ہیں۔ ارم عدنان ہلکے سانولے رنگ کی خوبصورت نین نقش اور مناسب جسم والی پرکشش لڑکی تھی جو اب ماشاء اللہ انکم ٹیکس ڈیپارٹمنٹ میں اس لحاظ سے ریکارڈ ہولڈر ہے کہ اس وقت ارم اور عدنان دونوں میاں بیوی ایک ساتھ گریڈ 22 میں حاضر سروس ہیں اور جاوید اقبال رانا چھوٹے قد اور گہری سانولی رنگت والا ایک ہنس مکھ قسم کا افسر تھا جو ہر گھڑی شرارت پر تلا رہتا تھا۔ کسی دلچسپ بات پر

ایسا زور دار قہقہہ لگاتا کہ اس کے اثر سے پوری عمارت گونج اُٹھتی۔ صد افسوس کہ ہمارا یہ خوش مزاج رفیق کار عین جوانی میں عارضہ قلب کی وجہ سے چل بسا۔

ایک روز میں منصور عباس نامی ایک ٹیکس گزار کی فائل دیکھ رہا تھا تو مجھے اندازہ ہوا کہ یہ منصور صاحب پاکستان فلم انڈسٹری کے مشہور و معروف خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ یعنی سنتوش کمار درپن اور ایس سلیمان کے چھوٹے بھائی اور صبیحہ خانم، نیئر سلطانہ اور کتھک ڈانسر اداکارہ پنا بیگم کے دیور۔ اس کیس میں پندرہ سال کے علاوہ گزشتہ دو برسوں کی اسسمنٹ ہونا ابھی باقی تھی۔ اس التواء کی وجہ میرے پیشرو افسر کی لاپروائی کے علاوہ کچھ نہ تھی کیونکہ ویلتھ ٹیکس کے گوشوارے تمام تر ضروری دستاویزات کے ساتھ فائل کیے گئے تھے۔ میں نے متعلقہ کلرک کو بلا کر کہا کہ اس کیس کے سارے اسسمنٹ آرڈر بنا کر آج ہی مجھ سے اپروو کرائے۔ اور جب کام مکمل ہوگیا تو میں نے نوٹس سرور کے بجائے فائنل ہونے والے آرڈر اپنے انسپکٹر کے حوالے کرتے ہوئے اسے ہدایت کی کہ ان آرڈرز کی کمپنی کے دفتر میں کسی اہلکار پر سروس نہیں کرنی بلکہ یہ منصور عباس ہی کے ہاتھ میں دینے ہیں۔ بیشک اس کے لئے اسے کتنے ہی دن لگ جائیں۔ دو دن بعد انسپکٹر نے رپورٹ دی کہ اس نے اسسمنٹ آرڈر منصور صاحب کے حوالے کردیئے ہیں۔ جس دوران منصور نے خوشگوار حیرت کے تحت پوچھا کہ محکمہ یکا یک اتنا مستعد و مہربان کیسے ہوگیا کہ تین سال کا کام مکمل کر کے آرڈر بھیج دیئے گئے ہیں۔ بقول انسپکٹر کے اس نے منصور عباس کو بتایا کہ اس سرکل میں نئے پوسٹ ہونے والے محمد بوٹا انجم نامی افسر نے اس کیس پر خاص توجہ دیتے ہوئے ان کا یہ کام مکمل کردیا ہے۔ جس پر منصور نے شکریہ کی ادائیگی کے ساتھ انسپکٹر سے میرے دفتر کا فون نمبر لے لیا۔

اگلے روز منصور عباس کا فون آیا تو میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس نے مجھ سے اس خاص مہربانی کی وجہ پوچھی؟ میں نے بتایا کہ اس کی وجہ میڈم صبیحہ خانم سے احترام کا وہ رشتہ ہے جو کراچی میں میرے قیام کے دوران استوار ہوا اور یہ کہ میڈم کی بیٹی فریحہ اور داماد شہریار میرے فیملی فرینڈ ہیں۔ منصور نے پوچھا کہ میری آپ کی کبھی ملاقات ہوئی ہے؟ تو میں نے اسے بتایا کہ پردہ سکرین پر بطور اداکار تو اسے کئی بار دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے تاہم برسوں پہلے میں نے میٹروپول سینما میں فلم کالو مکرانی کے پریمیئر شو پر اسے لائیو بھی دیکھا تھا۔ اس پر منصور نے ہنستے ہوئے مزید لائیو دیکھنے کے لئے مجھے اپنے دفتر یا گھر پر ملاقات کی دعوت دی۔ اس دعوت سے میں استفادہ نہ کرسکا تاہم اس واقعہ کے کئی برس بعد معروف کالم نگار و دانشور جناب حسن نثار کے بیلی پور والے گھر میں منصور عباس سے اتفاقاً ملاقات ہوگئی تو اس سارے قصے کا احوال اس نے وہاں پر موجود بہت سے دوستوں کو سنایا جو حاضرین کے نزدیک ایک قابل ستائش عمل کے طور پر میرے لئے عزت و مسرت کا باعث بنا۔

(جاری ہے)